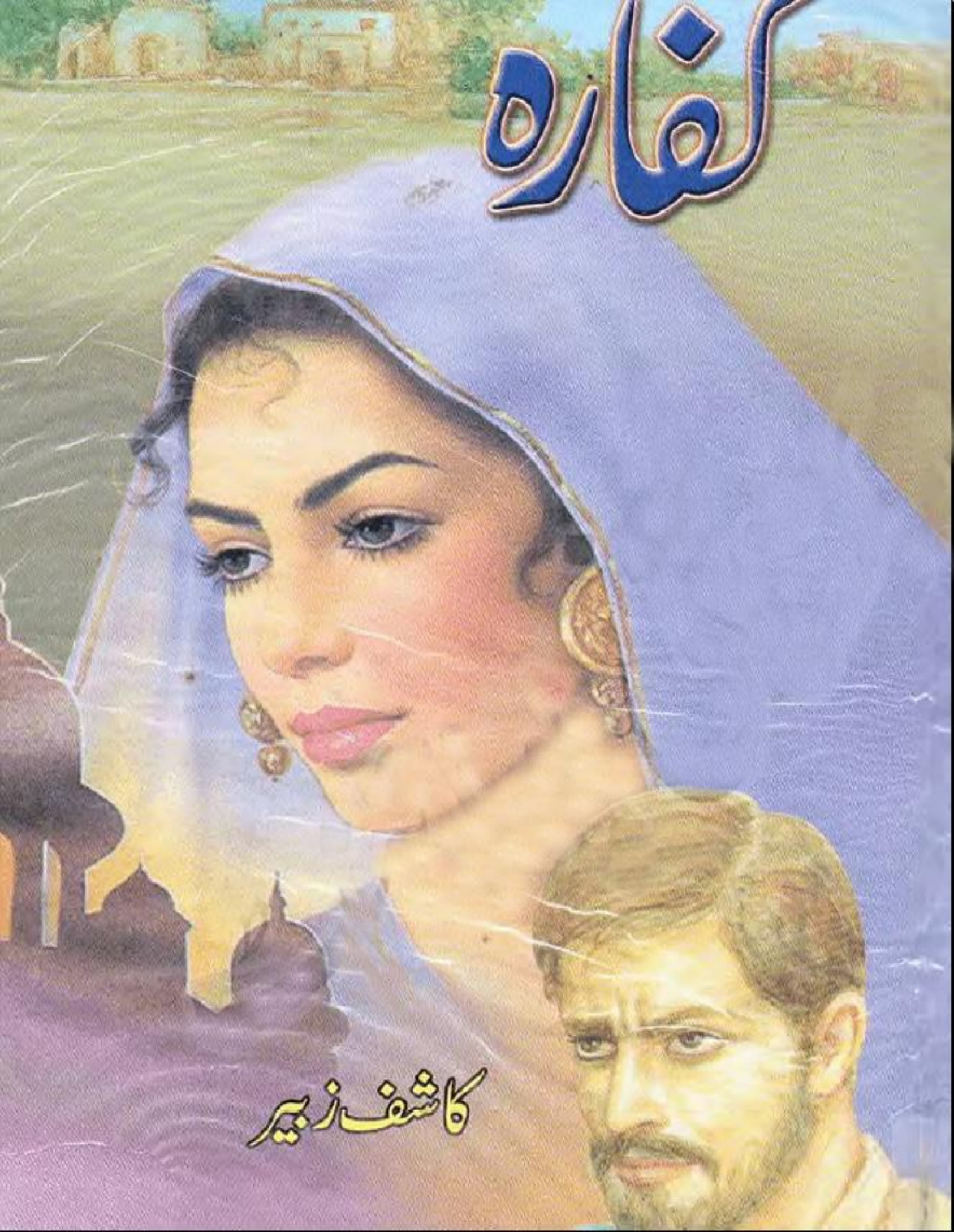
کفارہ



کاشف زبیر

ڈاکو سے امام مسجد بننے والے نوجوان کی ایمان افروز داستان

کفارہ

کاشف زبیر

المجاہد پبلشرز

4 منزل دین پلازہ جی ٹی روڈ گوجرانوالہ
0321-6450283
0300-6450283
055-8204177

ملنے کے پتہ جات

- ملت بک شاپ، فیصل مسجد اسلام آباد
- مکتبہ معارف اسلامی، منصورہ، ملتان روڈ لاہور
- مکتبہ انجمن تبلیغ اسلام، الاکرام بلڈنگ راولپنڈی
- علم و عرفان پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
- البدر کتب گھر، کچہری روڈ گجرات
- مکتبہ اذان سحر، منصورہ لاہور
- تحریک علم و ادب، اردو بازار لاہور
- حق پبلی کیشنز، چیرنگ کراس روڈ لاہور
- احمد بک ڈپو، گوجرانوالہ
- اجالا بک سنٹر، اردو بازار، گوجرانوالہ
- علی سیال پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور
- بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم
- ادارہ مطبوعات طلبہ، اچھرہ لاہور

دیدہ زیب اور معیاری کتب کا مرکز

المجاہد پبلیشرز

تزئین و آرائش ناصر اقبال مجاہد

(جملہ حقوق محفوظ)

نام کتاب:	کفارہ
نام مصنف:	کاشف زبیر
اشاعت:	نومبر 2008ء
قیمت:	200/= روپے

انتساب

اس رحیم اور عظیم ہستی کے نام
جس نے لکھنے کی صلاحیت عطا کی

پیش لفظ

آج ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس میں ہر طرف ظلم، ہوس اور ناانصافی کا دوردورہ ہے۔ ہر شخص بے یقین اور مضطرب ہے کہیں سکون اور انصاف نہیں ہے معاشرے میں انصاف کی عدم دستیابی کی ایک وجہ خود احتسابی سے گریز ہے۔ جن قوموں کے افراد خود احتسابی سے گریز کرتے ہیں بالآخر وہ قومیں انصاف سے مجموعی طور پر محروم ہو جاتی ہیں جیسا کہ آج ہمارا حال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین اسلام عطا فرمایا اور ہمارے ایمان و دین ہمیں سلامتی کیلئے ہمیں خود احتسابی کا حکم دیا ہے۔ افسوس کہ ہم اسلام میں دوسری اخلاقیات کی طرح خود احتسابی کے عمل کو بھی چھوڑ چکے ہیں۔ بحیثیت ایک مسلمان اور پاکستانی میں اتنا مایوس اور منتشر ہوں جتنا ایک عام پاکستانی ہے مگر میرے اندر کا لکھاری مایوس نہیں ہے وہ منتشر بھی نہیں ہے تبھی کفارہ جیسی کہانیاں لکھ رہا ہوں آج ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے ممکن ہے یہ کہانی پڑھ کر کوئی ایک فرد خود احتسابی پر آمادہ ہو جائے اور شاید میرے لئے یہی کفارہ بن جائے۔

دعاؤں کا طالب

کاشف زبیر

یکم نومبر 2008ء

کفارہ

چھوٹی سی گاڑی انجن بھی طاقت ور نہیں تھا اس لیے سڑک سے اتر کر ایک میل کے بعد ہی نرم ریت میں دھنسنے لگی تھی اس سے پہلے کہ کار بیچ بیچ پھنس جاتی نوجوان نے کار روک دی۔

''ماں جی! یہ آگے نہیں جائے گی۔'' اس نے عقبی سیٹ پر بیٹھی بوڑھی عورت کی طرف دیکھا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا!'' عورت نے نرمی سے کہا۔

وہ اتر کر پیدل چل پڑے۔ صبح کے دس بجے تھے وہ کئی گھنٹے پہلے شہر سے روانہ

ہوئے تھے۔ پکی سڑک کا سفر دو گھنٹے کا تھا۔ اسکے بعد ایک گھنٹے تک وہ کچی سڑک پر سفر کرتے رہے۔ اب سڑک بھی باقی نہیں رہی تھی۔ دسمبر کا آخر تھا اس لیے موسم سرد ہو چلا تھا۔ ریت پر سورج کی تیز روشنی چمک رہی تھی۔ یہ جگہ صحرا کا حصہ لگ رہی تھی۔ زیریں پنجاب کا یہ علاقہ ایک زمانے میں صحرا ہی تھا مگر نہری پانی نے جابجا اسے لہلہاتے کھیتوں میں بدل دیا تھا۔ البتہ بعض ٹکڑے ابھی تک صحرائی شکل کے تھے۔ تاحد نگاہ ریت کے منظر نے نوجوان کو کسی قدر پریشان اور مشکوک کر دیا تھا لیکن عورت پورے اعتماد سے چلی جا رہی تھی۔ جیسے اس کے پیروں تلے ریت کا ایک ایک ذرہ آشنا تھا۔

ریت کی ایک بلند ہوتی لہر کے اوپری حصے میں پہنچتے ہی نوجوان کے سامنے وہ منظر آ گیا جو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ذہن میں نقش تھا۔ ماں کی زبانی یہ سب اتنی بار اور تفصیل سے سنا تھا کہ اسے لگا اس منظر میں اس کے لیے کچھ بھی اجنبی نہیں ہے۔ ویسے یہ کچھ ناقابل یقین سا منظر تھا۔ عین ریت کے وسط میں اس قدر بھرا بھرا نخلستان کسی شاعر کا تخیل لگتا تھا۔ اس کے چاروں طرف سرخ پھولوں والی جھاڑ تھی۔ جس نے نخلستان کی قدرتی حد بندی کر دی تھی۔ اندر بے شمار اونچے درخت تھے۔ ان درختوں میں کہیں وہ چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ جو نوجوان کے لیے ذرا بھی اجنبی نہیں تھا۔

عورت پر اعتماد قدموں سے نیچے اترنے لگی۔ نوجوان اس کے پیچھے تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے ہوئے وہ اس نخلستان کے اندر داخل ہوئے۔ نوجوان نے کئی گھنٹے بعد پانی کی مہک محسوس کی تھی۔ پاس ہی کوئی چشمہ بہہ رہا تھا۔ عورت، کھجور اور شیشم کے درختوں کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے نخلستان اچانک ان کے سامنے آیا تھا ویسے ہی وہ کچا مکان بھی درختوں کے عقب سے اچانک نمودار ہوا کوٹھڑی نما چھوٹا سا۔ ایک پرانا سا دروازہ اور اسکے برابر میں کھڑکی۔ اس کے پٹ جھول رہے تھے۔ اس کوٹھڑی کے گرد مٹی کی تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف کچی مٹی سے بنے دو عدد گھڑے رکھے تھے۔ ان پر ڈھکن اور ایک عدد آب خورا رکھا تھا۔ عورت نے جا کر آب خورا میں پانی انڈیلا اور چند گھونٹ پی کر نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ نوجوان نے پانی پیا۔ اس کی سرد اور شیریں مہک اسکے جسم و جان میں اتر گئی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے انوکھا سا احساس ہوا۔ اس

کے بعد پانی اپنے فطری ذائقے پر آ گیا۔ پانی پی کر اس نے آب خورا واپس مٹکے پر رکھ دیا۔ ماں بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے خاص تاثر ایک لمحے کو نظر آیا تھا۔ اس کے بعد نوجوان اپنے معمول پر آ گیا تھا۔ عورت کو مایوسی ہوئی تھی۔ نوجوان نے چاروں طرف دیکھا اور کسی قدر پریشانی سے بولا۔

''ماں جی! یہ جگہ آباد لگ رہی ہے؟''

''شاید، یہ حق کسی اور کو مل گیا ہے۔ اصل حق دار تو۔۔۔۔'' عورت نے شاید خود کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔

نوجوان نے کسی قدر بے زاری سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کوٹھڑی کی طرف بڑھا اس کا دروازہ باہر سے زنجیر چڑھا کر بند کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ نوجوان زنجیر ہٹاتا عورت نے اسے روک دیا۔

''بیٹا! یہاں کوئی رہ رہا ہے۔'' نوجوان نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

''لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ یہ سب ہمارا ہے پھر یہاں پر کوئی اور کیوں رہ سکتا ہے؟''

''رہ سکتا ہے، اللہ کی زمین غیر آباد نہیں ہوتی ہے جو اسے آباد کرتا ہے اس کی ہو جاتی ہے۔ بے شک یہ زمین اور مکان ہمارے نام پر ہے لیکن اسے آباد کسی اور نے کیا ہے۔ اللہ کے قانون کے لحاظ سے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے اور کسی کے گھر بلا اجازت گھسنا گناہ ہے، ظلم ہے۔''

''تب ہم کیا کریں؟'' نوجوان نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''انتظار'' عورت ایک طرف رکھی بان کی چارپائی کی طرف بڑھ گئی۔ جس پر دھوپ چمک رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ''انتظار'' کرتے کرتے اسے پورے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ جھنجھلا رہا تھا تلملا رہا تھا۔ اس کا طیش دم بدم بڑھتا جا رہا تھا کوئی دسویں بار اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھنکارتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے اسے گھوڑے کی ٹاپیں

سنائی دیں۔اس کے ساتھی گھوڑوں پر آئے اوران کی تعداد بھی کافی تھی لیکن وہ پھر بھی محتاط ہوگیااس نے پلٹ کراپنی رائفل اٹھائی اور درختوں کے عقب سے جھانکنے لگا۔چند لمحے بعد جھاڑیوں سے تین عدد گھوڑے برآمد ہوئے۔یہ اس کے ساتھی تھے۔خان محمد،عجب خان اور سلطان۔اسکا غصہ انہیں دیکھتے ہی ابل پڑا تھا۔جیسے ہی وہ ان کے نزدیک آئے وہ ان پر برس پڑا تھا۔

''کہاں مرگئے تھے میں دو گھنٹے سے انتظار کررہا تھا۔''

''سردار راستے میں مسئلہ ہوگیا تھا۔ادھر کوئی بڑی واردات ہوگئی ہے۔ڈاکو چار بندے مار کر پوری بارات لوٹ کرلے گئے ہیں۔لڑکی بھی اٹھالی ہے۔بڑے زمینداروں کا معاملہ ہے اس لئے پولیس زیادہ بھاگ دوڑ کررہی ہے۔''سلطان نے رپورٹ دی۔

''بیڑا غرق۔''اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''استاد آج خطرہ ہے۔''خان محمد بولا۔

اس نے حقارت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

''ادئے خطرہ کب نہیں ہوتا۔''

''مگر استاد آج تو۔۔۔''

''آج اورابھی چلو۔''اس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ وہ سودا کر کے چلیں جائیں۔''

سلطان اس کا گھوڑا کھول کر لے آیا اور چند منٹ بعد وہ آندھی طوفان کی طرح جارہے تھے۔ایک نہر کے کنارے گھوڑے دوڑاتے آموں سے مہکتے باغات میں داخل ہوئے تھے۔یہ پورا علاقہ آموں کے باغات کی وجہ سے مشہور تھا۔ایک باغ کے باہر انہوں نے گھوڑے روکے اور دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوگئے۔سب سے آگے سردار یا استاد تھا۔اس کے انداز میں اعتماد اور چال میں شکار پر جھپٹنے والے چیتے کی سی چستی پائی جاتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔اس کے تینوں ساتھی کسی قدر تذبذب کے ساتھ اس کے پیچھے تھے۔ان میں ایسا اعتماد نہیں تھا۔

وہ چلتے چلتے اچانک رک گیا۔سامنے ایک چھوٹا سا ڈیرا نظر آرہا تھا۔اس کی

دیواریں پکی اینٹوں کی اور چھت کھپریل کی تھی۔اسکے دروازے اور کھڑکیاں کھلے ہوئے تھے۔اس نے اچانک اندر داخل ہوکر ایک ہوائی فائر کیا۔

''خبردار!کوئی نہ ہلے۔۔۔۔ورنہ گولی ماردوں گا۔''

وہاں موجود چار افراد گھبرا گئے تھے۔ان میں باغ کا مالک فتح علی بھی تھا۔اس کے سامنے میز پر ایک چرمی بیگ رکھا تھا۔اس نے گزشتہ دنوں فصل نیلام کی تھی آج اسکا خریدار ادائیگی کرنے آیا تھا خاصی بڑی رقم تھی۔کوئی ایک لاکھ اسی ہزار روپے(یہ آج سے کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے)اپنے سامنے ایک رائفل بدست نقاب پوش کو دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے پھر فتح علی نے سنبھل کر کرتے میں ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالنا چاہا مگر رائفل والے کی تیز نظروں نے اس کی حرکت دیکھ لی۔رائفل ایک بار پھر گرجی اور فتح علی پہلو دبا کر ڈھیر ہوگیا۔باقی دہشت زدہ ہوگئے۔اسی اثنا میں استاد کے باقی تین ساتھی بھی اندر گھس آئے انہوں نے دھکے دے دے کر سب کو زمین پر گرایا استاد نے آگے بڑھ کر چرمی بیگ اٹھا لیا۔اس نے ایک اچٹتی سی نظر فتح علی کی لاش پر ڈالی اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتا ہوا باہر آگیا۔اس کے ساتھی کچھ پریشان لگ رہے تھے۔خان محمد نے باہر آتے دیکھا۔

''استاد یہ کیا کیا؟پولیس پیچھے لگ جائے گی۔''

''وہ تو ہر صورت لگے گی۔''اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''اس نے کرتے سے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی تھی۔میں دیر کرتا تو خود مارا جاتا۔''

''یہاں کا خاندان بڑا اثر والا ہے۔میں نے سنا ہے علاقے کا نیا ڈپٹی کمشنر اس کے خاندان سے ہی ہے اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمیں یہاں سے اپنا بوریا بستر اٹھانا پڑے گا۔''

''فکر مت کرو۔۔۔اگر کوئی ہنگامہ ہوا تو شاہ جی کے پاس سندھ چلے جائیں گے۔''اس نے باہر آکر گھوڑے کی باگ پکڑی۔۔۔اب نکل چلو۔''

وہ نہر کے کنارے گھوڑے دوڑاتے ہوئے آن کی آن میں باغات سے دور نکل گئے تھے مگر تا کے کے بارے میں ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ایک سڑک عبور کرتے

ہوئے وہ پولیس کی نظر میں آ گئے۔ عام حالات میں پولیس شاید ہی انکے پیچھے آنے کی زحمت کرتی مگر بارات پر ہونے والی ڈکیتی اور خاص طور سے لڑکی کی بازیابی کے لئے وہ زیادہ ہی مستعد تھی اس لیے جب چار مشکوک گھڑسوار جاتے نظر آئے تو ایک پارٹی فوری ان کے تعاقب میں روانہ کردی گئی تھی۔ آٹھ نو پولیس والے گھوڑوں پر استاد اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے لگ گئے۔

وہ چاروں اپنے پیچھے پولیس دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ان کے گھوڑے صبح سے سفر میں ہونے کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے اور پولیس پارٹی کے پاس تازہ دم گھوڑے تھے اس لیے فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ جیسے ہی وہ فائر کی زد میں آئے پولیس کے نوجوانوں نے اپنی تھری ناٹ تھری کی رائفلوں سے فائرنگ شروع کردی۔ اس کا نشانہ اور حد عام رائفلوں سے اچھی ہوتی ہے۔ گولیاں ان کے آس پاس سے گزرنے لگیں۔ جان بچانے کے لیے وہ بے تحاشہ گھوڑے بھگانے لگے۔ مگر موت کا فرشتہ انکی راہ پر لگ گیا تھا۔ سب سے پہلے سلطان گرا۔ ایک گولی اس کی گردن سے گزر گئی تھی۔ وہ چیخ مار کر گھوڑے سے گرا تو سب کے دل دھک سے رہ گئے سلطان ان کا پرانا ساتھی تھا لیکن وہ اس کے لیے نہیں رک سکتے تھے۔ انہیں یقین تھا جو رکا مارا جائے گا۔ پولیس ڈاکوؤں کو کم ہی زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرا شکار خان محمد تھا۔ گولی اس کی پشت میں اتر گئی تھی۔ جب تک ہمت رہی وہ گھوڑے پر جما رہا پھر نیچے گر گیا۔ اس کا گھوڑا بھی رک گیا تھا استاد کا دل کرب سے چلانے لگا تھا یہ اسکے دست و بازو تھے جو ایک ایک کر کے کٹ رہے تھے۔ وہ چار تھے برسوں سے ساتھ تھے دوسرے لوگوں نے انہیں توڑنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے گروہ انکی کامیابیوں سے جلتے تھے۔ پولیس انکی تلاش میں رہتی تھی۔ مگر وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے تھے لگتا تھا قدرت نے چاروں کی اجل کا ایک ہی وقت رکھا ہے۔

تیسرا شکار عجب خان تھا اسے بیک وقت کئی گولیاں لگیں تھیں۔ اس کی کراہ سے استاد چونکا تھا عجب خان کا سر آگے جھکا جا رہا تھا۔

''خان! حوصلہ رکھو یار، دیکھو سامنے بیلا ہے ادھر گھس گئے تو پولیس کا سارا محکمہ بھی تلاش نہیں کر سکتا۔'' وہ چیخ چیخ کر اس کا حوصلہ بڑھانے لگا مگر قضا اسے مہلت دینے کو

تیار نہیں تھی۔ بیلے کی حد آنے سے پہلے عجب خان کی زندگی کی سرحد آ گئی تھی۔ وہ گھوڑے پر ہی لڑھک گیا استاد اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا رہا اور پولیس والوں کے قریب آنے سے پہلے بیلے میں داخل ہوتا مگر اسی لمحے کمر میں ایک ٹھیس سی اٹھی۔ دہکتے انگارے کا احساس تھا جو پشت میں اتر گیا تھا۔ یہ احساس نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی اسے ران میں گولی لگی تھی مگر اس وقت تکلیف ایسی نہیں تھی آج کی خوفناکی اور اذیت ہزار گنا زیادہ تھی۔ یہ گولی کا زخم نہیں تھا۔ یہ اس کے ساتھیوں کی موت کا زخم تھا جو اسے تڑپا رہا تھا۔

گھوڑا بیلے کے جانے پہچانے راستوں پر دوڑتا رہا تھا۔ وہ بارہا یہاں سے گزر چکا تھا۔ پولیس پارٹی بیلے کے باہر ہی رک گئی تھی۔ وہ اندر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔ پولیس والوں کا خیال تھا کہ بیلے میں ڈاکوؤں کے مزید ساتھی تھے اور ایسے میں اندر جانے کا مطلب تھا۔ وہ انکے گھیرے میں آ جاتے۔ اس لیے دو سپاہی مزید نفری لانے کے لیے بھیجے گئے اور استاد کو مہلت مل گئی کہ وہ دور نکل جائے خون بہنے کیساتھ ساتھ اس کی توانائی بھی ضائع ہو رہی تھی اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا کوئی بار بار اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ مذہب کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ بچپن میں ماں نے سب سکھایا تھا لیکن استعمال نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ جب ایک مسلمان کا آخری وقت آتا ہے تو بے شک وہ کوئی ولی اللہ ہو یا گناہ گار۔۔۔ اس کے لیے کلمہ پڑھنا لازمی ہوتا ہے وہ کلمہ شریف پڑھنے لگا جب ذہن پر تاریکی کا حملہ ہوتا وہ بے اختیار کلمہ دہراتا اسی طرح نجانے کلمہ دہراتے دہراتے کب وہ بے ہوش ہو گیا۔

وفادار جانور نے مالک کی کسمپرسی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ رکنے کی بجائے احتیاط سے آگے بڑھتا رہا کہ اس کا مالک اس سے گر نہ جائے۔ وہ اسے ایسی جگہ پہنچانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے مالک کو مدد مل سکے۔ بیلا ختم ہوا تو چھوٹی جھاڑیوں سے بھرا میدان آ گیا جہاں جا بجا جانوروں کا فضلہ پڑا تھا جب بارشوں کے بعد ان سوکھی جھاڑیوں پر سبزے کا شباب آتا تھا تو دور دور سے مویشی چرانے والے اسطرف رخ کرتے تھے۔ اور جب سبزہ ختم ہو جاتا تو واپس لوٹ جاتے تھے۔ اس وقت تقریباً تمام ہی جھاڑیاں سبزے سے خالی ہو رہی تھیں۔

البتہ کہیں کہیں کچھ سبز پتے باقی رہ گئے تھے جانور اپنی توانائی بحال رکھنے کے لیے ان پر منہ مارتا آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ جھاڑیاں بھی ختم ہوگئیں۔ اب سامنے ایک سپاٹ ریت سے بھرا میدان تھا۔ گھوڑے چند لمحے تذبذب کے عالم میں اس کی سرحد پر کھڑا رہا کہ ریتلے میدان میں قدم رکھے یا نہ رکھے پھر اس کی خطرات محسوس کرنے والی حس نے بتایا کہ اس کے مالک کے لیے پیچھے خطرہ ہے اس کے لیے آگے جانا ہی مناسب ہوگا۔ اس نے ریت کے میدان میں قدم رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

صفیہ نے جانوروں کو جلدی جلدی ان کے احاطے میں بند کیا درجن بھر بھیڑیں، نصف درجن بکریاں اور ایک دودھ دینے والی گائے تھی۔ بے شمار مرغیاں اس کے علاوہ تھیں لیکن وہ چگ کر خود ہی واپس اپنے ڈربوں میں آجاتی تھیں۔ صفیہ کو صرف تختہ لگا کر اس کے اوپر بھاری پتھر رکھنا ہوتا تھا۔ مگر بھیڑیں اور بکریاں اسے بہت تنگ کرتی تھیں آسانی سے اپنی باڑ میں نہیں جاتی تھیں۔ وہ دوپہر تک سارے کام نمٹا کر چرانے کے لیے لے جاتی تھی اور مغرب سے پہلے لاکر بند کردیا کرتی تھی۔ اس روز آسمان سرمئی مائل ہورہا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی اسے لگ رہا تھا کہ شاید آندھی آئے گی اور بارش بھی ہوگی۔ اس وجہ سے کھلے رہ جانے والے سامان کی فکر تھی۔ اس نے صبح کے دھلے کپڑے اتارے مرغیوں کے ڈربے بند کیے اندر آکر اس نے دیکھا کہ اس کی ایک قمیض کم ہے بعض کپڑے نم تھے۔ لیکن اگلے روز دھوپ میں سکھا سکتی تھی۔ اگر آندھی انہیں اڑا کر لے جاتی تو وہ کیا کرتی۔ وہ ایک بار پھر باہر آئی آسمان پہلے سے زیادہ سرمئی ہورہا تھا۔

وہ درختوں سے گزر کر اپنی قمیض تلاش کرنے لگی۔ بابا نے اسے کپڑا لاکر دیا تھا اور اس نے بڑی محنت سے اس پر کڑھائی کی تھی۔ اسے یہ سوچ کر دکھ ہورہا تھا کہ اسکی پسندیدہ ترین قمیض گرگئی ہے۔ چشمے کے پاس سے ہوکر وہ جھاڑیوں تک آئی سرخ اور عنابی پھولوں والی جھاڑیاں اس کے گھر اور باغ کے چاروں طرف تھیں۔ ان میں آنے جانے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک جو مغرب کی طرف تھا جہاں بابا نے مسجد بنا رکھی تھی اور دوسرا مشرق کی طرف۔۔۔ اس طرف سے شاذ ہی کوئی آتا تھا کیونکہ درمیان میں ریت کا بڑا سا میدان

تھا وہ مشرق کی طرف ہی آئی تھی قمیض اب تک اسے نظر نہیں آئی تھی لیکن جیسے ہی وہ جھاڑیوں سے باہر آئی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک گھوڑا جھاڑیوں سے پتے چن کر کھا رہا تھا اس پر سوار شخص بے حس و حرکت اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ جو اس نے سختی سے پکڑ رکھی تھی۔ صفیہ نے اس کی کمر سے بہہ کر آنے والے خون کی سرخی دیکھ لی تھی۔ رائفل دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی۔ اس نے قدم پیچھے کیے اور بھاگنے کا ارادہ کیا کہ گھوڑا ہنہنایا اسکے انداز میں التجا تھی۔ صفیہ جانوروں کی بولی خوب جانتی تھی۔ اسے لگا جیسے گھوڑا اس سے التجا کر رہا ہے کہ اس کے مالک کو اس حال میں چھوڑ کر نہ جائے اس کی مدد کرے۔ اس کا خوف دور ہونے لگا آدمی بے ہوش تھا اور زخمی بھی۔ اسکے ہاتھ میں رائفل تھی۔ صفیہ نے کوشش کی کہ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل جائے مگر اس کی گرفت اتنی سخت تھی۔ کہ صفیہ مضبوط صحرائی لڑکی ہونے کے باوجود اس سے رائفل نہ چھڑا سکی۔ گولیوں کی بلٹ اس کے شانے اور کمر کے گرد بندھی تھی۔ آخر اس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اسے جھاڑیوں سے اندر لے آئی گھر کے پاس لاکر اس نے ایک نظر سوار کو دیکھا اس کا نصف چہرہ گھوڑے کی پشت سے چھپا تھا لیکن باقی کے نصف سے اسے اندازہ ہوا وہ جوان العمر شخص تھا۔ سر پر پگڑی تھی اور چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں تھیں۔ کچھ دیر سمجھنے کے بعد اس کے ذہن میں یہی آیا کہ بابا کو بلا لائے مسجد زیادہ دور نہیں تھی اور اجنبی جس طرح گھوڑے پر پڑا تھا اس کے مرنے کا امکان نہیں تھا البتہ گھوڑے کا خطرہ تھا کہ اسے لے کر کہیں چل نہ دے صفیہ نے سوچا اور اس کی لگام چارپائی سے باندھنے کے لیے بڑھی تب ہی اس نے گھوڑے کی دوسری طرف بکل سے بندھا ایک چرمی بیگ دیکھا۔ ایسا ہی ایک بیگ اس کے بابا کے پاس تھا لیکن بہت پرانا تھا۔ یہ بالکل نیا اور چمکتا دمکتا بیگ تھا اس نے گھوڑے کی لگام باندھی بیگ کے بارے میں اسے تجسس تھا لیکن اجنبی کی حالت کے بارے میں بابا کو بتانا ضروری تھا وہ علاج بھی کرتے تھے عصر اور مغرب کے درمیان رہنے والے ان سے علاج کرانے آتے تھے۔ بابا جڑی بوٹیوں سے بنائی دواؤں کی مدد سے ان کا علاج کیا کرتے تھے۔

مسجد گھر سے دور کوئی نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک کسی قدر بلند ٹیلے پر تھی۔ کچی دیواروں اور اوپر کھجور کے پتوں کی چھت تھی۔ جو دھوپ روک سکتی تھی بارش نہیں لہٰذا

جب عین نماز میں بارش کا وقت آجاتا تو امام سمیت جملہ نمازی غسل بھی کرلیا کرتے تھے۔ دیہاتیوں نے پرخلوص پیشکش کی تھی کہ امام صاحب کے لیے ایک چھپر بنا دیا جائے تاکہ وہ بھیگنے سے بچ جائیں مگر امام صاحب مولوی عبدالصمد صفیہ کے بابا نے اس تجویز کو محرومی قرار دے کر مسترد کر دیا۔

''تم لوگ تو اللہ رحمت سے لطف اٹھاؤ اور میں اس سے محروم رہ جاؤں۔''

مولوی عبدالصمد پانچوں وقت اذان دینے کے ساتھ ساتھ نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ہنگامی حالات کے لیے انہوں نے دو شاگرد بھی بنا رکھے تھے۔ جو کبھی کبھی اذان دیا کرتے تھے اور جب مولوی عبدالصمد بیمار ہوتے یا کسی ضروری کام سے نزدیکی قصبے تک گئے ہوتے جو مسافت کے لحاظ سے کوئی پچیس میل اور وقت کے لحاظ سے دو گھنٹے کی مسافت تھا وہ نماز بھی پڑھا دیا کرتے تھے البتہ مغرب کے بعد وہ گھر آجاتے اور پھر عشا پڑھانے جاتے تھے جب صفیہ ہانپتی کانپتی کا انہیں بلانے آئی۔ وہ پیٹ کے ایک مریض کو دوا دے رہے تھے۔

''بابا! جلدی چلیں۔'' صفیہ نے مسجد کے صحن میں داخل ہوتے کہا۔

''کیا ہوا بچی خیریت تو ہے؟''

''بس بابا! چلو نا، گھر چلو۔'' صفیہ نے ضد کی۔ اس کے لہجے میں غیر معمولی بات محسوس کر کے مولوی عبدالصمد مریضوں سے معذرت کر کے اٹھ گئے۔ صفیہ جب صرف دو سال کی تھی۔ تب مولوی عبدالصمد کی بیوی بیمار ہو کر مر گئی۔ اس کا اپنڈکس پھٹ گیا تھا مولوی صاحب ساری رات اپنی محبوب بیوی کے سرہانے بیٹھے رہے جس نے صبح فجر کے وقت دم توڑ دیا تب سے صفیہ ان کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اس کی ایک ایک بات اور لہجے کی ایک ایک جنبش سے واقف تھے۔ انہیں محسوس ہوا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ صفیہ نے راستے میں انہیں گھڑسوار آدمی کے بارے میں بتایا۔

''بابا! وہ زخمی ہے اور اس کے پاس رائفل بھی ہے۔''

''پاگل تو اسے اندر کیوں لائی؟''

''بابا! وہ بالکل بے ہوش ہے ذرا بھی حرکت نہیں کر رہا۔'' صفیہ نے جلدی سے

صفائی پیش کی۔

مولوی عبدالصمد تیز قدموں سے گھر تک آئے۔ اجنبی بدستور گھوڑے پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کا حلیہ اور رائفل دیکھ کر وہ کسی قدر فکرمند ہو گئے۔ ڈاکو اس علاقے کے باسیوں کے لئے اجنبی نہیں تھے بہرحال وہ اب ان کے گھر میں تھا اور انہیں اب اسکے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا انہوں نے صفیہ سے پوچھا۔

''اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔''

''نہیں بابا!'' جب میں تعاقب تلاش کرنے باہر گئی تو دور تک کوئی نہیں تھا۔ گھوڑا بھی چلتا ہوا آیا تھا ورنہ اس کے ٹاپوں کی آواز ضرور آتی۔''

مولوی عبدالصمد تقریباً پینتالیس سال کے صحت مند شخص تھے۔ انہوں نے باآسانی اس کے ہاتھ سے رائفل نکال لی اور پھر اسے گھوڑے سے اتار کر کوٹھری میں چارپائی پر لٹا دیا۔ مغرب کا وقت نزدیک تھا انہوں نے دیکھا کہ اس کی کمر پر گردے کے ذرا نیچے گولی کا سوراخ تھا اس سے رستے والا خون تقریباً تھم گیا تھا۔ اجنبی کی صحت شاندار تھی۔ مولوی عبدالصمد نے بیٹی سے کہا۔

''اس کا گھوڑا پیچھے جھاڑیوں میں باندھ دے۔ برتن میں پانی رکھ دینا۔ ورنہ یہ شور مچائے گا۔ میری واپسی تک پانی گرم کر کے اس میں میرا چاقو ابال لینا۔''

''جی بابا! لیکن آپ۔۔۔۔؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

''پگلی! نماز نہیں پڑھانی کیا اور ڈرنے کی بات نہیں اگر کوئی اور آئے تو چھپ جانا تجھے ان جھاڑیوں کے راستے معلوم ہیں؟''

''جی بابا!'' وہ کسی قدر مطمئن ہو گئی۔

''پر جلد آنا بابا!''

''بس نماز پڑھاتے ہی آتا ہوں۔'' جاتے جاتے مولوی عبدالصمد اس کی رائفل لے گئے تھے۔

صفیہ نے باپ کے جانے کے بعد پتیلی میں پانی گرم ہونے کے لیے رکھ دیا چمڑے کے کیس میں آلات جراحی رکھے تھے ان کی مدد سے مولوی عبدالصمد عام قسم کی چیر

پھاڑ کرتے تھے۔ جیسے کوئی پھوڑا صاف کرنا ہو۔ ایک بار انہوں نے ایک آدمی کی گولی بھی نکالی تھی۔ پولیس ڈاکوؤں کا تعاقب کرتی ان کے علاقے میں گھس آئی تھی اور دونوں کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں ایک چرواہے کے پاؤں میں گولی لگ گئی تھی۔ مقابلے کے بعد پولیس اور ڈاکو اپنے اپنے مارے جانے والوں اور زخمیوں کو سمیٹ کر لے گئی تھی۔ چرواہا بے چارہ وہیں پڑا رہ گیا۔ بعد میں علاقے کے لوگ اسے مولوی عبدالصمد کے پاس لائے اور انہوں نے اللہ کا نام لے کر پاؤں کا آپریشن کر کے گولی نکالی تھی۔ اس کے بعد انہیں علاقے کا واحد سرجن تسلیم کرلیا گیا تھا۔

نماز پڑھاتے ہوئے بھی مولوی عبدالصمد کا ذہن اجنبی اور بیٹی کی طرف لگا ہوا تھا اگرچہ اجنبی زخمی تھا مگر پھر بھی مرد تھا غلط نظر سے ہی دیکھ لیتا تو اس کی باحیا بیٹی کٹ کر رہ جاتی۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار ایسے تیسے نماز پڑھائی اور اپنے اس فعل پر اللہ سے معافی بھی مانگتے رہے نماز ختم ہوتے ہی خلاف معمول وہ لوگوں سے گھلنے ملنے کے بجائے گھر روانہ ہوگئے نمازیوں کو ذرا تعجب ہوا تھا گھر پہنچے تو صفیہ ان کے اوزار ابال چکی تھی۔ انہوں نے اسے باغ سے جا کر چند پودوں کے پتے اور بوٹیاں لانے کو کہا۔ انہوں نے باغ کا حصہ خاص طور پر جڑی بوٹیوں کے لیے مختص کر رکھا تھا جو مختلف امراض اور زخمیوں کے علاج میں کام آتی تھیں۔ صفیہ لالٹین لے کر چلی گئی انہوں نے زخمی کا معائنہ کیا گولی خاصی اندر تھی لیکن نبض درست تھی یعنی کسی حساس عضو رئیسہ کو نقصان نہیں ہوا تھا انہوں نے سب سے پہلے اس کا خون آلود کرتا اتارا گو بنیوں کی پٹی بھی خاصی مشکل سے اتری تھی۔

ذرا دیر میں صفیہ آئی تو انہوں نے اسے وہیں روک دیا۔

''ادھر مت آنا میں نے اس کی قمیض اتار دی ہے۔''

''جی بابا! یہ لے لو، میں لے آئی ہوں صفیہ نے باپ کو چھابڑی پکڑا دی جس میں مطلوب جڑی بوٹیاں اور پتے تھے مولوی عبدالصمد چھابڑی لے کر باہر آ گئے اور بیٹی کو سمجھانے لگے کہ اس نے اس کے ساتھ کیا کرنا ہے مجھے جلدی کر کے دے کیونکہ اس کی گولی نکالنی ہے خون روکنے کے لیے یہ دوا لگانی ہے۔''

''اسے گولی لگی ہے کیا؟'' صفیہ چونکی۔

مولوی عبدالصمد نے سر ہلایا ''اتنا خون اور کسی زخم سے بہتا ہے کیا اور دیکھ میرا ایک صاف جوڑا نکال دے پھر دودھ میں اصلی گھی اور الائچی کا تڑکا لگا کر لے آ۔''

''جی بابا!'' صفیہ مستعدی سے بولی۔

''سب جلدی کرنا مجھے عشاء پڑھانے بھی جانا ہے۔''

''آپ فکر نہ کرو بابا! میں سب کرلوں گی۔'' صفیہ اعتماد سے بولی تو مولوی عبداللہ صمد نے محبت سے دیکھا۔ خدمت گزار اور اطاعت شعار میں وہ بالکل ماں پر گئی تھی۔

اگرچہ وہ اس کی طرح خوبصورت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی پرکشش اور جاذب نظر تھی ابھی سولہ سال کی ہوئی تھی۔ مولوی عبدالصمد کٹورے میں گرم پانی لے کر اندر آیا اور اس میں ٹنکچر ملا کر اجنبی کا زخم صاف کرنے لگا۔ ٹنکچر سے اسے بہت تکلیف ہوئی تو وہ بے ہوشی کی حالت میں تڑپنے لگا تھا جیسے ہی صفیہ نے دوائی تیار ہو جانے کی آواز دی اس نے کٹورا لے کر اوزار سنبھال لیے اور اس کے زخم سے گولی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ گولی خاصی گہری گوشت میں پھنسی تھی چاقو نکلتے ہی خون بہنے لگا تھا بہرحال یہ اتنی خطرناک بات نہیں تھی۔ بالآخر چاقو کی نوک گولی سے ٹکرائی اس نے نوک ہی استعمال کرتے ہوئے گولی نکال لی تھی۔

☆ ☆ ☆

ٹیسیں رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں غشی کے عالم میں بھی وہ تکلیف محسوس کر رہا تھا لیکن یہ احساس صرف تکلیف تک محدود تھا ورنہ اسے اپنے اردگرد کا شعور نہیں تھا۔ جہاں دہکتا انگارہ گھسا تھا اس جگہ درد کی کیفیت بڑھ رہی تھی یہ گولی لگنے کی تکلیف سے الگ ہی تھی یہ گولی کا زہر پھیلنے کی تکلیف تھی۔ گولی کا زخم اب زیادہ خطرناک ہو رہا تھا کوئی اور شے اس کے زخم میں داخل ہوئی تھی۔ وہ کرب محسوس کر رہا تھا اور چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اچانک درد کی شدت اتنی بڑھی جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ وہ بے اختیار اچھلا تھا۔ اسی لمحے اسے ہوش آ گیا۔ وہ اوندھے منہ کھری بان کی چارپائی پر لیٹا تھا۔ کمر کے زخم میں شدید قسم کی درد ہو رہی تھی اور بہتے خون کو اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی جسم کے اندر جلتی کاٹتی تکلیف کی اس سے نجات مل گئی تھی۔

''اب ٹھیک ہو بچے؟'' ایک مردانہ آواز نے اسے تسلی دی۔

"میں نے گولی نکال دی ہے۔"

پھر اس نے زخم صاف کیا اور اس پر کوئی ٹھنڈی اور مرہم جیسی شے لگا دی۔ اس کے درد میں فوری طور پر اتنی کمی ہوئی کہ وہ حیران رہ گیا تکلیف لمحوں میں قابل برداشت ہو گئی تھی اس نے محسوس کیا کہ اس کا خون بھی بہنا بند ہو گیا ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں پانی مانگا اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اس آدمی نے کٹورے میں لا کر اسے پانی دیا ٹھنڈا اور مٹی کی مہک لیے۔ اس کے بدن میں جیسے جان اتر گئی۔ پانی کے بعد وہ اس کے لیے گرم دودھ لے کر آیا جس کے اوپر اصلی گھی تیر رہا تھا آدھا کٹورا پی کر اس نے منع کر دیا مگر آدمی نے اسے پورا کٹورا پلا دیا اس کے فوراً بعد اسے نیند آ گئی۔ مولوی عبدالصمد نے اسے دیکھا وہ سو چکا تھا۔ اس کے زخم کو انہوں نے پٹی سے ڈھک دیا تھا ابھی اسے دو گھنٹے کے بعد دوا لگانی تھی۔ انہوں نے زخمی کو کپڑے بدلنے کا کام عشاء کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس کام میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ صفیہ نے کھانے کو کہا وہ منع کر کے مسجد کو روانہ ہو گئے۔ اس بار انہوں نے دلجمعی اور سکون سے نماز پڑھائی تھی۔ عشاء کے بعد لوگوں سے تھوڑی بات چیت کی۔ علاقے کے لوگ اب مسجد کو ذرا پختہ کرنا چاہتے تھے نمازیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لیے مسجد کا احاطہ کنویں تک وسیع کرنے کی رائے تھی۔

مولوی عبدالصمد گھر آئے تو صفیہ کھانا لگائے انتظار کر رہی تھی سالن وہ دوپہر میں ہی بنا لیا کرتی تھی۔ البتہ روٹی تازہ ڈالتی تھی۔ مولوی صاحب نے زخمی کے بارے میں پوچھا۔

"اس نے آواز تو نہیں نکالی تھی؟"

"جوان آدمی ہے ہمت والا، ورنہ چرواہے کے پاؤں میں گولی لگ گئی تھی۔ وہ کیسا بچوں کی طرح دہاڑیں مار کر رو رہا تھا۔"

"بابا! یہ ڈاکو ہے؟" صفیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے۔" مولوی عبدالصمد نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ورنہ اسے دیکھتے ہی انہیں یقین آ گیا تھا۔ کہ وہ ڈاکو ہے۔ صفیہ ڈر جاتی سب ہی ان ڈاکوؤں سے ڈرتے تھے غریبوں کے پاس مال و دولت تھا نہیں تھا ڈاکو ان سے بھیڑ بکریاں یا مرغیاں انڈے

لے جاتے تھے۔ چرواہوں سے دودھ لے لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی بدذات آ جاتا تھا جو بہو بیٹیاں اٹھا لے جاتا تھا لیکن ایسا واقعہ برسوں بعد ہی پیش آتا تھا۔ اس زمانے میں بھی ڈاکوؤں کے اصول تھے۔ ایک اصول یہ تھا۔ کہ عورت کی عزت کی جائے۔ اس پر بری نظر ڈالنا ڈاکو برادری میں برا سمجھا جاتا تھا اگر کوئی ڈاکو کسی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالتا تو اسے برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ اپنی عورتوں کے معاملے میں ان سے ڈرتے تھے اگر کسی ڈاکو کے آنے کی اطلاع ملتی تو عورتیں گھروں میں چلی جاتی تھیں۔

صفیہ نے کھانے کے برتن دھوئے اور باپ کے لیے چائے چڑھا دی۔ مولوی عبدالصمد کو چائے کا شوق تھا۔ رات سونے سے پہلے وہ چائے ضرور پیتے تھے۔ اس کے بعد اس نے دوسری کوٹھڑی میں جا کر اپنا بستر بچھایا۔ وہ لوگ جلد سو جانے کے عادی تھے۔ گاؤں کے دوسرے لوگ تو اور بھی جلدی سو جاتے تھے۔ کیونکہ مولوی عبدالصمد کو عشا پڑھائی ہوتی تھی اور وہاں سے آ کر ہی کھانا کھاتے تھے۔ اس لیے سوتے سوتے عام طور پر آٹھ نو بج جاتے تھے اگرچہ سردی کا آغاز تھا لیکن مولوی عبدالصمد ابھی تک باہر ہی سوتے تھے۔ البتہ صفیہ نے اندر سونا شروع کر دیا تھا۔ باپ کو اس کی چارپائی پر چائے کا پیالہ دیا۔ عبدالصمد نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"دروازہ اندر سے بند کر کے سونا اور گھوڑے کو کچھ دیا تھا؟"

"جی بابا! اسے بھی چارہ ڈال آئی تھی۔ وہ جھاڑی سے بھی پتے کھا رہا تھا۔"

"جانور کے کھانے پینے کا خیال رکھنا سنت نبوی ﷺ ہے۔ ہمارے نبی ﷺ انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں سے بھی پیار کرتے تھے۔ جانور پال کر اس کا خیال نہ رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

"میں جانتی ہوں بابا!" صفیہ نے جلدی سے کہا۔

"بابا اور بتائیں ناں۔" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

مولوی عبدالصمد نے دین کے علاوہ زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ لیکن جو پڑھا تھا وہ ان کے ذہن میں موجود تھا۔ خاص طور سے سنت نبوی ﷺ ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور وہ صفیہ

کو بھی فرصت کے اوقات میں کچھ نہ کچھ بتاتے یا سمجھاتے رہتے تھے۔ اسے قرآن کریم معہ ترجمہ کے خود پڑھایا تھا۔ صفیہ نے ذاتی شوق سے تین پارے بھی حفظ کر لیے تھے۔ رات کو سونے سے قبل وہ بابا کو نصف یا پاؤ پارہ سناتی تھی۔ سنانے سے پہلے وہ ان سے سنتی تھی اور اس شوق میں کھانا کھاتے ہی باپ کی چارپائی پر بستر لگا کر چائے بنا کر لے آتی تھی۔

''بچی آج نہیں۔'' مولوی عبدالصمد نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''میں نے ابھی اسے دوسری بار دوا لگانی ہے ایک گھنٹے بعد پھر لگانی ہے اس سے پہلے ذرا آرام کر لوں تو بھی جا کر سو جا۔''

صفیہ اٹھی تھی کہ اسے چرمی کیس کا خیال آیا ''اس کے پاس ایک بستہ بھی ہے جیسا آپ کے پاس ہے چمڑے والا۔''

مولوی عبدالصمد چونکے تھے ''کہاں ہے لے آؤ۔''

صفیہ بھاگ کر چرمی بیگ اٹھا لائی تھی۔ مولوی صاحب نے بیگ دیکھا وہ بند تھا کھٹکا ہٹا کر اسے بہ آسانی کھولا جا سکتا تھا لیکن یہ معمولی سا کھٹکا مولوی عبدالصمد کے لیے دنیا کے پیچیدہ ترین تالے سے زیادہ دشوار تھا۔ ان کا ضمیر انہیں یہ کھٹکا ہٹانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اس میں کوئی قیمتی شے ہے اور یہ خیال آتے ہی ان کا جسم لرز گیا تھا۔ امانت کا بوجھ کیسا ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ اگر ان سے ذرا بھی شے ضائع ہو گئی تو۔۔۔ تو ان کی برسوں کی کمائی تباہ ہو جاتی۔ انہوں نے بیگ اٹھا کر اندر لے جا کر سوتے اجنبی کی چارپائی تلے رکھ دیا۔ صبح اس کے جاگتے ہی وہ یہ امانت اس کے سپرد کر کے سبکدوش ہو سکتے تھے۔ صفیہ ان کی ہدایات کے مطابق اندر چلی گئی تھی۔ سونے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اسے مرہم لگایا۔ اس کا خون رک گیا تھا اور زخم کا منہ بھی چھوٹا ہو رہا تھا۔ یہ مرہم گہرے زخموں کے لیے اکسیر تھا وہ گہری نیند میں تھا اور اس کی نبض بھی بہتر چل رہی تھی۔ مولوی عبدالصمد مطمئن ہونے کے بعد سونے کے لیے باہر آ گئے۔

اندر صفیہ کو کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ سارے دن کی تھکن کے بعد وہ بستر پر لیٹتی تو لمحوں میں نیند آ جاتی تھی۔ صبح مسجد جانے سے پہلے مولوی عبدالصمد

دروازہ بجا کر چارپائی ہلا کر اسے جگا دیا کرتے تھے۔ اگر اس نے نماز پڑھنی ہوتی تو جلدی اٹھ جاتی تھی۔ ویسے نہ بھی پڑھنی ہوتی تو باپ کی شرم سے اٹھ جاتی تھی۔ اپنی حالت باپ پر ظاہر کرتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ ابتدائی دنوں میں وہ باہر نماز پڑھا کرتی تھی لیکن ایک بار مولوی صاحب نے اسے سمجھایا تھا۔

''بیٹی ہمارے دین میں عورت کو چھپ کر نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے کہ اسے کسی پر یہ ظاہر نہ کرنا پڑے کہ وہ ناپاکی کی حالت سے نماز نہیں پڑھ رہی ہے۔''

''جی بابا!'' اس نے حیا سے نظریں جھکا کر کہا۔ اس دن کے بعد وہ پانچوں وقت کی نماز اندر کوٹھڑی میں پڑھتی تھی وہ اپنے باپ کی شکر گزار تھی جس نے اس کی الجھن کو شروع میں رفع کر دیا۔ مولوی عبدالصمد نے اسے سارے شرعی اور فطری امور سمجھائے تھے کیونکہ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے تھے۔ کہ شریعت میں کوئی شرم نہیں ہے۔ وہ سارے کام روشنی ہونے سے پہلے تک سارے کام نمٹا لیتی تھی۔ دن میں کپڑے دھوتی، کھانا بناتی اور پھر جانور لے کر پاس ہی چرانے جاتی تھی اور شام سے پہلے لوٹ آتی تھی۔

خاصی دیر کروٹیں بدلنے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی۔ آخر وہ بستر سے اٹھی اپنی کوٹھڑی کے دروازے کی جھری سے برابر کے کمرے میں جھانکا۔ مولوی عبدالصمد نے لالٹین جلا دی تھی۔ وہ آہستہ سے کواڑ کھول کر باہر آئی زخمی اجنبی کروٹ بدل کر سو رہا تھا۔ اس کا بایاں شانہ رلی سے باہر تھا۔ مضبوط اور صحت مند بازو۔ اس کے چہرے پر بال بکھرے تھے۔ مولوی عبدالصمد نے اس کی پگڑی اتار دی تھی۔ سانولا رنگ اور چہرے کے کھردرے نقوش نجانے کیوں اسے ڈر نہیں لگا۔ وہ نجانے کتنی دیر اسے دیکھتی رہی وہ اسے اچھا لگ رہا تھا اور پھر اسے ڈر لگنے لگا۔ یہ ڈر اسے اجنبی سے نہیں خود سے لگ رہا تھا۔ وہ جلدی سے اندر چلی گئی۔ اسے خبر نہیں ہوئی کب صبح ہوئی تھی کئی برس بعد پہلی بار ایسا ہوا تھا جب اسے نماز پڑھنی تھی اور قضا ہو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بوکھلا کر باہر آئی۔ اجنبی بدستور سو رہا تھا اور مولوی عبدالصمد باہر صحن میں چارپائی کس رہے تھے۔ رات کسی وقت ہلکی سی بارش ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے دیکھ کر ناشتہ بنانے کو کہا۔

''پتا نہیں بابا! صبح آنکھ نہیں ملی۔''

''اللہ سے معافی مانگ بچی۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔ ہاں اس کے لیے دودھ میں دلیہ بنا دے، اور بعد میں ایک مرغی کو شوربہ بنا لینا۔ اسے طاقت کی ضرورت ہے۔''

مولوی عبدالصمد نے اندر کی زمینوں پر سبزیاں لگا رکھی تھیں۔ کھجور کے درخت تھے۔ جانوروں کے دودھ، انڈے، سبزیاں اور سال میں کھجور کی فصل۔ انہیں استعمال جاتا تھا کہ اپنی گزر اوقات آرام سے بسر کرلیا کرتے تھے۔ دودھ ایک لڑکا آ کر لے جاتا تھا۔ اسے بیچ کر وہ اپنا حصہ رکھ کر باقی پیسے مولوی صاحب کو دے دیا کرتا تھا۔ انڈے، سبزیاں اور کھجور کی فصل وہ خود جا کر قصبے میں بیچ آتے تھے۔ کچھ دیر کھیتوں میں کام کر کے وہ واپس آئے تو صفیہ نے ناشتہ تیار کرلیا تھا۔ انہوں نے زخمی کو دیکھا وہ جاگ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے دودھ کے دلیے اور ابلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ لے کر گئے۔

''مجھے پیشاب آرہا ہے۔'' اس نے دھیمی لیکن گونج دار آواز میں کہا۔

''ابھی بستر سے اترنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ رکو میں تمہارے لیے یہیں کچھ لاتا ہوں۔''

اگرچہ مولوی صاحب کو اس کا تجربہ نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ اس مرحلے سے گزر گئے انہوں نے منہ ہاتھ بھی دھلوا دیا تھا پھر اسے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرایا۔ ناشتے کے بعد اس کا زخم دیکھ کر دوائی لگائی تھی۔ محض بارہ گھنٹوں میں زخم خاصا بہتر ہوا تھا۔

''اب تکلیف کیسی ہے؟''

''بہت کم ہے، کیا تم نے مجھے کوئی دوا دی ہے؟''

''دوائی لگائی ہے۔ میں خود بناتا ہوں مولوی صاحب نے اسے مرہم دکھایا انشاء اللہ دو تین دن میں زخم بھر جائے گا۔ چل پھر سکو گے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔ مجھے جانا ہوگا۔ میرا گھوڑا اور رائفل کہاں ہے۔''

''سب محفوظ ہے۔'' مولوی صاحب نے چارپائی کے نیچے سے چرمی بیگ نکالا۔

''یہ بھی تھا۔ میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔''

''کیا یہ بھی میرے پاس سے ملا ہے تھا؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''میری بچی بتا رہی تھی گھوڑے سے بندھا تھا۔''

اس نے بیگ کھول کر اندر جھانکا رقم جوں کی توں تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر بیگ بند کر دیا۔ مولوی عبدالصمد بے چین ہو رہے تھے۔ ایک نظر دیکھ لو۔ تمہاری چیزیں ہیں ناں۔۔۔ اس میں؟''

''سب ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''میرا گھوڑا اور رائفل بھی لا دو مجھے جانا ہے۔''

''ابھی تمہارے زخم اس قابل نہیں ہے میں نے دو انچ سے زیادہ گہرائی سے گولی نکالی ہے۔ زخم ابھی کچا ہے اگر تم نے حرکت بھی کی تو خون پھر بہنے لگے گا۔ کم سے کم دو دن مکمل آرام کرنا ہے۔''

''میں۔۔۔ میں نہیں رک سکتا۔''

''اس حالت میں تم کہاں جا سکتے ہو۔ دیکھو کسی کو علم نہیں ہے کہ تم میرے گھر پر ہو لیکن اس طرح نکلو گے تو کسی نہ کسی کی نظر میں آ جاؤ گے۔''

اس نے محسوس کیا کہ اس کے میزبان کی بات میں وزن تھا۔ درحقیقت زخم بہت گہرا تھا۔ اس کے لیے معمولی سی حرکت بھی دشوار ہو رہی تھی۔

''میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔''

''مجھے مولوی عبدالصمد کہتے ہیں۔'' وہ بولے۔

''اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں رہتا ہوں۔ یہ علاقہ ہارنگر کہلاتا ہے صحرا کا حصہ ہے لیکن میری زمین پر قدرتی چشمہ ہے۔ تم کون ہو؟''

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ''آپ کے خیال میں میں کون ہو سکتا ہوں؟''

مولوی عبدالصمد ہچکچائے۔ ''میرا خیال ہے پولیس ہے تمہارے پیچھے۔''

اس نے سر ہلایا ''آپ کا اندازہ درست ہے میرا نام جان محمد ہے۔ جانو کے نام سے مشہور ہوں۔ ہم لوگ ایک جگہ سے آ رہے تھے کہ پولیس پیچھے لگ گئی۔ میرے تین ساتھی پولیس کی فائرنگ سے مارے گئے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''میں بھی زخمی ہو گیا تھا لیکن یہاں تک کیسے پہنچا مجھے نہیں پتا۔''

''تمہارا گھوڑا لایا تھا۔ دراصل اللہ کو تمہیں بچانا تھا۔''

اسکے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ''مجھے ڈاکو بنانا بھی اس کی رضا تھی۔''

مولوی عبدالصمد لرز گئے تھے۔ ''کفر مت بولو۔۔۔ اللہ ہمیشہ نیکی کی توفیق دیتا ہے۔ یہ شیطان اور انسان کا نفس ہے جو اسے راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔''

''مولوی صاحب! آپ ایسے شخص کے لیے کیا کہو گے۔ جو چار دن سے بھوکا ہو تو کیا اس کیلئے روٹی چرانا گناہ ہوگا؟''

''شاید روٹی چرانا گناہ ہو لیکن اسلحے کے زور پر دوسروں سے ان کی پونجی چھین لینا ہوس ہے۔ یہی چیز انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک منٹ میں ابھی آیا۔'' وہ باہر گئے اور اس کے لیے نکالا جانے والا جوڑا لے آئے۔

''تمہارے کپڑے گندے ہو گئے ہیں۔ انہیں بدلنا ہوگا۔'' وہ اب تک خون آلود شلوار میں تھا۔ اسے چادر اوڑھا کر مولوی عبدالصمد نے اس کی شلوار اتاری۔ گیلا کپڑا لا کر اس کے پیروں پر جما خون صاف کیا پھر اسے اپنا جوڑا پہنایا۔ لمبے پہنتے ہوئے اسے کسی قدر تکلیف ہوئی تھی۔

دوپہر تک مولوی عبدالصمد اس کے ساتھ لگے رہے۔ جان محمد سخت جان آدمی تھا۔ اس کی خوراک بھی اسی لحاظ سے تھی۔ مولوی صاحب نے اسے بڑا والا گلاس بھر کر دودھ دیا تھا اس سے بھی اس تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مرغی کا شوربہ بن رہا ہے۔

''دیسی مرغی آسانی سے نہیں گلتی۔'' مولوی صاحب نے اسے بتایا۔

''میں نماز پڑھانے جا رہا ہوں پھر آ کر تم کو کھانا دوں گا۔''

جان محمد کسمسایا۔ ''کیا میں اکیلے رہوں گا؟''

''نہیں میری بچی ہے کوئی کام ہو تو اسے آواز دے لینا۔''

''میری رائفل دے جائیں۔''

مولوی عبدالصمد لوٹ آئے۔ ''تمہیں اس گھر میں رائفل کی ضرورت نہیں۔ تم یہاں محفوظ ہو۔''

اس بار اس نے اصرار نہیں کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ مولوی صاحب اپنے الفاظ کا پاس کریں گے۔ ویسے بھی انہیں اسے پولیس کے حوالے کرنا ہو تو کل ان کے پاس

بہت موقع تھا۔ پولیس اسے بیہوشی کے عالم میں لے جاتی اور وہ کبھی نہ جان پاتا کہ اس کو کس نے گرفتار کرایا ہے۔ وہ اس پر اس حد تک بھروسہ کر رہے تھے کہ اپنا گھر اور لڑکی اس پر چھوڑ کر نماز پڑھانے چلے گئے تھے۔ کیا انہیں ایک ڈاکو سے خطرہ نہیں تھا۔ اسے کس قدر تعجب ہو رہا تھا۔ اس علاقے کے لوگ ڈاکوؤں سے دہشت زدہ رہا کرتے تھے اگر وہ کسی وجہ سے عام آدمی کے گھر چلے جاتے تھے تو مارے خوف کے وہ ادھ موا ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد اسے پیاس لگی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے گرم دودھ پیا تھا شاید اس وجہ سے پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ عام حالت میں وہ بھوک پیاس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا مگر پانی کی طلب اتنی تیزی سے بڑھی تھی کہ چند منٹ میں اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ کچھ دیر تک برداشت کرنے کے بعد اس نے آواز دی۔

''پانی۔۔۔ مجھے پیاس لگی ہے۔''

باہر صحن میں گندم چھانتی صفیہ لرز گئی تھی۔ خوف سے نہیں۔ اس بھاری آواز نے عجیب اثر کیا تھا اس کے ہاتھ سے چھلنی گرتے گرتے بچی تھی۔ بابا نے جاتے وقت اس سے کہا تھا کہ زخمی کا خیال رکھے مگر اسے اتنی جلدی پانی کی ضرورت پڑ جائے گی۔ ابھی تو بابا اسے دودھ دے کر گئے ہیں اس نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھ کر گھڑے سے پانی کٹورے میں انڈیلا۔ اسے پانی کی مٹی آمیز مہک اچھی لگتی تھی مگر اس وقت اس کا ذہن کسی اور طرف تھا کٹورا لے کر لرزتے قدموں سے اندر کی طرف بڑھی۔ چند لمحے دروازے کے آگے رک کر اندر جانے کی ہمت جمع کرتی رہی پھر اس نے اندر قدم رکھا۔ دن کی روشنی سے اندر آنے کے بعد اسے چند لمحے تک سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا تھا اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا ورنہ شاید وہ پلٹ کر بھاگ نکلتی۔ وہ خاموش کھڑی رہی حتیٰ کہ اسے کسی قدر نظر آنے لگا تب اس نے چارپائی پر دائیں کروٹ لیٹے اس شخص کو دیکھا جو اسے دیکھنے کے بجائے نظریں نیچی کیے ہوئے تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔

''پانی پی لو۔'' وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ اس نے صفیہ سے پانی کا کٹورا لے کر بے تابی سے اپنے لبوں سے لگایا اور اس کے خشک ہونٹ دیکھ کر صفیہ کو یقین آنے لگا کہ واقعی پیاسہ تھا۔ پانی پی کر کٹورا اس کو واپس کر دیا۔

''شکریہ۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''تمہیں تکلیف دی۔''

''نہیں تو۔۔۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''تمہیں کچھ اور چاہیے کیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میرا گھوڑا کیسا ہے اس کو چارہ۔۔۔''

''کیا ہم تمہیں ایسے نظر آتے ہیں، فکر نہ کرو تمہارا گھوڑا کھا پی رہا ہے۔ میں نے اسے جھاڑیوں میں باندھ دیا ہے۔ وہاں وہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔'' بولتے بولتے وہ چپ ہوگئی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی کسی اجنبی سے اتنی بات نہیں کی تھی وہ بھاگ کر باہر آ گئی۔ اندر جان محمد کچھ حیران تھا۔ مولوی عبدالصمد عام سے نقوش کے آدمی تھے اسے خیال نہیں تھا کہ ان کی بیٹی اتنی اچھی صورت شکل والی ہوگی۔ اب اسے پتا چلا کہ مولوی عبدالصمد اس پر کتنا احسان کر رہے تھے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ڈاکو تھا اسے پناہ دی۔ اس کے زخم کا علاج کیا اور اب اپنا گھر اور اپنی بیٹی اس پر چھوڑ کر گئے تھے۔ کیا کوئی دوسرا شخص اس پر اتنا اعتماد کر سکتا تھا۔ یہ سوال اس نے مولوی صاحب سے اس وقت کیا جب وہ ظہر پڑھا کر گھر آئے اور اس کے لیے کھانا لائے تھے۔ سوال اس کے کھانے کے دوران کیا تھا لیکن مولوی صاحب نے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ کھانے کے بعد انہوں نے برتن باہر پہنچائے اور اس کے لیے پانی لے کر آئے۔ جب اس نے پانی پی لیا تو بولے۔

''میں اپنی بیٹی اور گھر کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر جاتا ہوں۔ آج بھی اسکے بھروسے پر چھوڑ گیا تھا۔'' جان محمد نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

''آپ تو ولی اللہ ہیں مولوی صاحب!'' وہ لرز گئے تھے۔

''کیسی باتیں کرتے ہو۔ ولی اللہ تو اور ہوتے ہیں میں تو اس کا بندہ کہلانے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ بہت چھوٹا اور کمزور آدمی ہوں ولی اللہ تو وہ ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہے۔ اپنی ہر خواہش اسکے تابع کر دے۔ میں تو دنیا دار آدمی ہوں۔ اللہ معاف کرے۔ اس سے زیادہ اپنے نفس کی پیروی کرتا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔''

''اچھا انسان اور مسلمان بھی بننا چاہتا ہوں وہ بھی اپنے لیے۔ اس کو راضی کرنے کے لیے نہیں۔''

جان محمد گم سم ہو گیا تھا اس سے پہلے کسی نے اس کے سامنے ایسی بات نہیں کی تھی۔

''مولوی صاحب! اللہ کی رضا کیوں ضروری ہے؟''

''کیوں ضروری ہے؟'' انہوں نے تعجب سے دہرایا۔

''بہت ضروری ہے ہمیں پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کے حکم کو سمجھ کر بے سوچے سمجھے مانیں۔ اس نے لاکھ اور نعمتیں دی ہیں اگر ایک نعمت کا شکر ادا کرنے میں ساری عمر گزار دے اور ایسی نعمتیں بے شمار ہیں۔''

''وہ کیسے مولوی صاحب؟''

''وہ ایسے کہ انسان سانس لیتا ہے۔ یہ بھی اللہ کی نعمت ہے۔ وہ ہر سانس جو لیتا ہے ایک نعمت ہے۔ اب وہ ہر سانس پر شکر ادا کرنا شروع کر دے تب بھی ان سانسوں کا کیا کرے گا جو اس نے سوتے میں لیں۔ یا جو سانسیں اس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے لیں۔ اس طرح تو ایک نعمت کا شکر بھی ادا نہیں ہوا۔''

''آپ۔۔۔ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔۔۔ بھلا ایسا کون کر سکتا ہے؟''

''کوئی نہیں لیکن جو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہی اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے تو یہی کافی ہے کہ موت کے وقت اللہ ناراض نہ ہو۔''

مولوی عبدالصمد آج کا درس چھوڑ کر آئے تھے۔ انہوں نے جان محمد کے لیے دوبارہ مرہم تیار کیا۔ اب اسے ہر تین گھنٹے کے وقفے سے مرہم لگانا تھا۔ اس کے زخم پر نرم پٹی باندھی تھی۔ تاکہ بار بار مرہم لگانے کے لیے اسے کھولنا نہ پڑے۔ جب وہ عصر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف گئے تو جان محمد پھر سو گیا تھا۔ صفیہ نے انہیں بتا دیا تھا۔ کہ ان کے جانے کے بعد جان محمد نے اس سے پانی مانگا تھا اور وہ اسے پانی پلانے آئی تو اس نے نظریں نیچی رکھیں تھیں۔ مولوی عبدالصمد کسی قدر مطمئن تھے۔ صفیہ جانور چرانے کے لیے گئی تو جلد واپس آ گئی تھی۔ البتہ اس نے بھیڑ بکریاں اور گائے باہر جھاڑیوں کے پاس چھوڑ دی

تھی۔ تاکہ وہ رہی سہی بھوک مٹا سکیں۔ اندر آ کر اس نے گھوڑے کو چارہ دیا اسکے برتن میں پانی تھا۔ بندھے بندھے وہ بے چین سا ہو گیا تھا اور اب تک کوئی اس طرف نہیں آیا تھا اس لیے وہ گھوڑے کو کھول کر باہر لے آئی۔ اسے کوٹھڑی سے ذرا دور باندھ دیا اس کے لیے کھیت سے چند گاجریں توڑ کر لائی بھیڑ بکریوں اور گائے کو اندر لانے سے پہلے صفائی کر کے سارا گوبر ایک طرف کھدے گڑھے میں ڈالا۔ جب گڑھا گوبر سے بھر جاتا تو مولوی صاحب اسے مٹی سے ڈھک کر دوسری طرف گڑھا کھود لیتے تھے۔ چند مہینے بعد زمین میں دبا گوبر بہترین کھاد بن جاتا تھا۔ جب ان کی زمین کو ضرورت ہوتی وہ یہاں سے کھاد نکال کر ڈالا کرتے تھے۔

مغرب تک اس نے جانور باڑے میں بند کیے۔ گائے کا دودھ نکال کر اسکا برتن مسجد کی طرف جانیوالے راستے پر رکھ دیا۔ جہاں سے لڑکا آ کر دودھ لے جاتا تھا۔ بعد میں پیسے اور برتن وہ مولوی صاحب کو مسجد میں دے دیا کرتا تھا۔ مغرب کے وقت صفیہ ادھر لالٹین لینے گئی تو وہ جاگ گیا تھا۔ صفیہ نے دونوں لالٹینیں جلائیں ایک اندر چھوڑ کر دوسری باہر لے آئی۔ چولہا سلگا کر اس نے توا رکھا اور مغرب کی نماز پڑھی اس دوران میں مولوی عبدالصمد آ گئے تھے۔ آج انہوں نے جلدی کھانا بنانے کو کہا تھا۔

''اب درد کیسا ہے؟'' مولوی صاحب سیدھے جان محمد کے پاس گئے تھے۔

''بہت معمولی سا رہ گیا ہے؟'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''آج ایک آدمی مغرب پڑھنے آیا تھا اس نے بتایا کہ پولیس زخمی ڈاکو کو تلاش کر رہی ہے۔ جس نے آم کے باغ میں اسکے مالک کو قتل کر کے رقم چھین لی تھی۔'' جان محمد سن سا رہ گیا تھا۔

''میں نے اسے قتل کیا ہے۔۔۔ لیکن اپنے دفاع میں اس نے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی تھی۔''

''میں نے تم سے صفائی نہیں مانگی۔ میں صرف بتا رہا ہوں۔ ممکن ہے پولیس کل اس علاقے کا چکر لگائے۔''

''مولوی صاحب! مجھے جانے دیں اگر پولیس نے مجھے یہاں سے گرفتار کیا تو

آپ بھی اعانت جرم میں پکڑے جائیں گے۔ آپ کی ساری نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔''

''میں نے تمہیں ایک انسان اور مدد کا طالب سمجھ کر پناہ دی تھی۔'' مولوی عبدالصمد کا لہجہ نرم تھا۔

''اس میں کسی کے لالچ یا خوف کا دخل نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔''

''پھر بھی آپ کو اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''یہ تمہارا کام نہیں ہے۔'' مولوی عبدالصمد نے اس کا شانہ تھپکا۔

''کیا تمہیں کسی شے کی ضرورت ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میں اصرار کروں گا مجھے جانے دیں۔''

''ابھی تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے کہ تم پولیس سے دور جا سکو۔ اس پورے علاقے میں تمہاری تلاش جاری ہے جو زمیندار تمہارے ہاتھ مارا گیا تھا اس کے خاندان والے اپنا سارا اثر رسوخ استعمال کر رہے ہیں اگر تم پکڑے گئے تو ممکن ہے میرا نام لے دو تب بھی میں مشکل میں پڑوں گا۔'' جان محمد نے سوچا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں ابھی اس جگہ محفوظ ہوں۔''

''ممکن ہے تم تین چار دن بعد جا سکو۔ تمہاری حالت بہتر ہو جائے گی اور پولیس کی تلاش بھی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔''

جان محمد کچھ دیر خاموش رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ایک مجرم کی مدد کر کے آپ غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ میں ایک آدمی کو قتل کر کے آیا ہوں میرے پاس ڈکیتی کا مال ہے؟''

''میرے نزدیک تم صرف ایک انسان ہو جہاں تک تمہارے جرائم کا تعلق ہے تو یہ تمہارا اور پولیس اور پھر عدالت کا معاملہ ہے۔ وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔''

''میں گناہ گار بھی ہوں۔''

''یہ تمہارا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ وہی طے کرتا ہے کون گناہ گار ہے اور کون ثواب

کا حقدار۔"

"آپ کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میں سمجھا بھی نہیں سکتا۔ دیکھو میں لوگوں سے الگ تھلگ اس جگہ اپنی بچی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ مجھے دنیا کا اتنا علم نہیں ہے اور مذہب بھی میں اتنا جانتا ہوں کہ اللہ کا شکر ادا کروں اور اسکے بندوں کے جو حق مجھ پر ہیں انہیں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"یعنی آپ کے نزدیک میرے ڈاکو ہونے اور قاتل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟"

"نہیں۔ جب تک تم صحت مند ہو کر یہاں سے چلے نہیں جاتے۔ اس کے بعد ممکن ہے میں تمہیں باہر دیکھوں اور محسوس کروں کہ تم سے لوگوں کو نقصان ہو سکتا ہے تو میں پولیس کو اطلاع دوں۔"

"اب میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں گویا میں صرف زخمی ہونے کی وجہ سے آپ کی توجہ پا رہا ہوں۔"

"کھانا کھاؤ گے۔ اب تم ٹھوس شے بھی کھا سکتے ہو۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

مولوی عبدالصمد نے کھانا اس کے ساتھ ہی کھایا اور پھر اس کے زخم پر مرہم لگا کر عشا پڑھانے چلے گئے۔ باپ کے آنے کے وقت کا اندازہ کر کے صفیہ نے برآمدے میں چھپر تلے ان کا پلنگ بچھا کر بستر ڈال دیا تھا پھر چائے رکھنے گئی تھی کہ اسے جان محمد کا خیال آیا۔ اس نے دروازے کے پاس آ کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

"تم چائے پیو گے۔"

"ہاں۔۔۔"

اس نے جواب دیا۔ جان محمد کو اس کے بارے ذہن میں ایسی ویسی کوئی سوچ نہ آ جائے کہ وہ اپنی نظروں میں گر جائے۔ وہ عورتوں کی عزت کرتا تھا کیونکہ اسکی ماں نے اسے ایسا کرنا سکھایا تھا۔ مولوی عبدالصمد آئے تو صفیہ نے ان کے ساتھ جان محمد کی چائے بھی لا دی۔

"بابا یہ اسے دے دیں۔"

"تم نے اس سے پوچھا تھا؟"

"جی بابا! ورنہ اس کے لیے چائے کیوں بناتی؟" اس نے جواب دیا۔

"ایک بات بتا تجھے اس سے ڈر تو نہیں لگا۔ میں تجھے اکیلا چھوڑ جاتا ہوں۔"

"اکیلی کہاں بابا! اللہ ہے نا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں جس کے ساتھ اللہ ہو وہ اکیلا نہیں ہوتا۔" مولوی عبدالصمد شرمندہ ہو گئے۔

"ہاں بیٹی ہم باتیں کرنے والے اکثر اپنا ہی کہا بھول جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے عمل کرنے والے ہم پر بازی لے جاتے ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بابا!" اس سے باپ کی شرمندگی نہیں دیکھی گئی۔

"انسان ہوں نا۔۔۔ فطرت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"نہیں بابا! شروع میں ڈر لگا تھا لیکن اب اس سے ڈر نہیں لگتا۔ بابا! وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتا ہے۔"

"اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی شریف ماں کا بیٹا ہے۔ حالات نے اسے ڈاکو اور قاتل بنا دیا ہے لیکن اس کے اندر کی شرافت نہیں مری۔"

"قاتل۔۔۔" وہ ڈر گئی تھی۔

"بابا اس نے کسی کا قتل کیا ہے؟"

"ہاں لیکن اس کا کہنا ہے یہ قتل اس نے اپنے دفاع میں کیا تھا۔"

"پھر بھی بابا! قتل تو قتل ہے۔ اللہ ایسے آدمی کو معاف نہیں کرے گا۔"

"ایسی بات منہ سے نہ نکال۔" مولوی عبدالصمد نے اسے تنبیہ کی۔

"اللہ سے معافی مانگ۔"

مولوی صاحب چائے لے کر اندر چلے گئے تھے پھر دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ صفیہ کو تجسس ہوا تھا کہ وہ اس سے بات کیا کر رہے تھے مگر باپ نے اسے سمجھایا تھا دوسروں کی ٹوہ میں رہنا اللہ کو پسند نہیں ہے۔ اسلئے وہ دل پر جبر کر کے بیٹھی رہی۔ اندر جان محمد مولوی صاحب کو اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ چند سال کا تھا کہ باپ چل بسا۔ بہادل

نگر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس کے باپ کے پاس چند ایکڑ زمین اور چند مویشی تھے۔ان سے ہی وہ اپنی اور بیوی بچوں کی پرورش کرتا تھا۔جان محمد سے بڑے دو بھائی تھے یار محمد اور خان محمد،خان محمد بچپن میں ہی ہیضے کا شکار ہو گیا تھا۔اوپر تلے کے ہونے کی وجہ سے دونوں بھائیوں میں محبت بھی تھی اور ایک دوسرے کی حرص بھی،آپس میں ذرا ذرا سی بات پر خوب لڑائی ہوتی تھی جان محمد نے ہاتھ پاؤں چلانا بھائی سے لڑائی میں ہی سیکھا تھا پھر جب خان محمد مر گیا تو وہ ہفتوں تک گم صم رہا تھا نہ کسی سے بات کرتا اور نہ ہی کھیلتا تھا۔بڑی مشکل سے ماں اور یار محمد نے اسے چپ کے حصار سے نکالا تھا۔یار محمد نے کوشش کی کہ وہ اس سے بے تکلف ہو جائے۔اسے خان محمد کا متبادل سمجھ لے مگر بڑے بھائی سے جو بھیک بچپن سے تھی وہ قائم رہی پھر ماں نے اسے سکول میں داخل کرا دیا۔باپ کے مرنے کے بعد زمین اور جانوروں کی ساری ذمہ داری ماں اور یار محمد پر آن پڑی تھی جو ابھی مشکل سے بارہ سال کا تھا۔دونوں ماں بیٹے مل کر زمین پر کام کرتے تھے۔گاؤں کے دوسرے لوگ سادہ اور ہمدرد تھے لیکن اشرف نامی زمیندار جس کی زمین ان سے ملی ہوئی تھی۔فیض محمد کے مرنے کے بعد اس کی زمین پر نظر لگائے بیٹھا تھا۔اس نے فیض کی بیوہ کو پیغام بھیجا۔

''یہ زمین مجھے بیچ دو۔تو عورت ذات کہاں زمین دیکھتی پھرے گی۔''

''میں عورت ذات ہوں لیکن میرے دو بچے بڑے ہو کر مرد ہی بنیں گے۔میں نہ سہی وہ ضرورا سے سنبھال لیں گے۔''فیض محمد کی بیوہ نے جواب دیا تھا۔

اشرف علی نے گاؤں کے چند لوگوں کو درمیان میں ڈالا جنہوں نے آتے جاتے جان محمد کی ماں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ وہ زمین اشرف علی کے ہاتھ بیچ کر رقم حکومت کی سیونگ اسکیموں میں لگا دے اور گھر بیٹھے آمدنی حاصل کرے۔اسے کیا ضرورت ہے باہر بھاگے پھرنے کی۔عورت ذات ہے اور ابھی جوان بھی ہے دو اچھی نظریں ہیں تو چار بری نظریں بھی ہوں گی۔ان ناصحین میں گاؤں کے مولوی صاحب بھی تھے جو خاص طور سے اسے بتانے آئے تھے کہ عورت کا اصل مقام عورت کا گھر ہوتا ہے جہاں وہ دوسروں سے محفوظ ہے۔

''مولوی صاحب!عورت گھر میں رہ کر بھوکی مر جائے یہ تو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا

ہے مجھے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے باہر جانا ہی پڑتا ہے۔''

''نیک بخت!تو چوہدری صاحب کی بات مان کیوں نہیں لیتی۔زمین بیچ کر پیسا بینک میں رکھوا دے اور ہر مہینے منافع لیتی رہ۔''

''مولوی صاحب!میں آپ جتنا دین نہیں جانتی لیکن مجھے معلوم ہے اس طرح ملنے والی رقم سود کی ہوتی ہے اور سود کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔''

''بی بی!یہ بات تو علوم جانے۔۔۔اگر سود ہے تو اس کے ذمے۔۔۔عوام کو گناہ کیوں ملنے لگا۔''

''مولوی صاحب اپنی قبر میں مجھے حساب دینا ہوگا۔''اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''اگر آپ چوہدری اشرف کی حمایت کرنے آئے ہیں تو جا سکتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔۔۔بی بی!مجھے کسی کی حمایت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔بات یہ ہے کہ تمہیں باہر کی ہوا لگ گئی ہے گھر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں ہو۔''مولوی باہر جانے لگا۔

''جیسے تجھے چوہدری کی روئیاں لگ گئی ہیں حرام کھا کر ہی حرام کھانے کی حمایت کر رہا ہے۔''

اس نے جواب دیا تھا۔جب اس نے زمین بیچنے سے انکار کیا اور کسی صورت ماننے کو تیار نہیں ہوئی تو وہ ستانے پر آ گیا۔اکثر اس کی زمین کا پانی بند کر دیتا اور جب فیض محمد کی بیوہ کھولنے پر کہتی تو انکار کر دیتا۔بیوہ نے کئی بار یہ معاملہ گاؤں کی پنچائت کے سامنے اٹھایا مگر شنوائی نہیں ہوئی۔پنچائت اس کا پانی کھولنے کو کہتی تو چوہدری صاحب وہاں مان جاتا اور بعد میں کسی بہانے سے پانی کھولنے سے انکار کر دیتا۔برابر والا زمیندار رحمت الٰہی اس سے ہمدردی رکھتا تھا۔کبھی کبھی اسے اپنے حصے سے پانی دے دیا کرتا تھا۔پنچائت میں بھی اس کی حمائت کرتا تھا۔رحمت الٰہی کی وجہ سے اس کی زمین کو پانی ملتا تھا اور اتنی فصل ہو جاتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتے تھے۔اشرف علی نے اس حمائت کو بھی اس کے لیے عذاب بنا دیا۔اس نے اپنے حواریوں کی مدد سے پورے گاؤں میں افواہ پھیلا دی کہ رحمت الٰہی کے بیوہ فیض محمد نوراں سے ناجائز تعلقات ہیں۔ان تعلقات کے حصے میں

رحمت الٰہی نہ صرف اس کی زمین کو اپنے حصے کا پانی دیتا ہے بلکہ پنچائت میں بھی اس کی بے جا حمایت کرتا ہے۔ یہ تہمت سُن کر نوراں کی جان نکل گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد خود کو اپنی چادر تلے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ کسی کو اس کے کردار پر اُنگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور اب۔۔۔۔۔ اُس نے اس دن رحمت الٰہی کو پیغام بھجوادیا کہ وہ اس کی زمین کے لئے پانی کھولنا بند کر دیا در پنچائت میں اس کے معاملے سے لاتعلق ہو جائے۔ رحمت الٰہی فیض محمد کا دوست تھا۔ اس پیغام پر وہ حیران رہ گیا تھا وہ خود معاملے کی وضاحت چاہنے نوراں کے پاس آ گیا۔

''بھرجائی تو نے ایسا پیغام کیوں بھیجا؟''

''کیونکہ اب یہ تعلق میری بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔''

جب رحمت الٰہی کو اشرف علی کی جانب سے پھیلائے گئے الزام کا پتہ چلا تو وہ بپھر گیا۔ وہ شریف آدمی تھا اس لیے اب تک اشرف علی کے منہ لگنے سے گریز کرتا آیا تھا مگر اس الزام سے اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اس نے بھری پنچائت میں اشرف علی کا گریبان پکڑ کر اس الزام کی وضاحت چاہی۔

''مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ باتیں گاؤں والے کر رہے ہیں۔'' اشرف علی نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔

''میں نے جس سے پوچھا اس نے بالآخر تمھارا ہی نام لیا۔ اشرف علی میں ایک شریف آدمی ہوں اور میں اس طرح کا الزام برداشت نہیں کر سکتا۔ نوراں میری بہن ہے اور میرے دوست کی بیوہ ہے اگر اب کسی نے اسکے بارے میں کوئی بے ہودہ بات کی تو میں اُس کا خون پی جاؤں گا۔''

''کیوں؟'' اشرف علی نے کمینی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا تھا۔

''اتنا تعلق ہے اس سے۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔ وہی تعلق جو تمھارا تمھاری بہن سے ہے۔''

''بکواس نہ کر۔'' اشرف علی دھاڑا تھا اور رحمت الٰہی سے لپٹ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں دونوں کے حامی میدان میں آ گئے۔ جب تک گاؤں والوں نے ہنگامہ فرو کیا۔ رجن بھر

افراد زخمی ہو گئے۔ رحمت الٰہی نے نے پولیس میں اشرف علی کے خلاف رپورٹ لکھوادی اس طرح زمینداروں میں دشمنی کی بنیاد پڑ گئی تھی اشرف علی بڑا زمیندار تھا۔ رحمت الٰہی کے پاس بھی خاصی زمین تھی لیکن وہ ذرا مختلف مزاج کا آدمی تھا۔ اشرف علی نے بدمعاش جمع کر رکھے تھے اور رحمت الٰہی سادہ مزاج آدمی تھا جو ہر معاملے کو افہام و تفہیم سے سلجھانے کا قائل تھا۔ لڑائی جھگڑے سے گریز کرتا تھا لہذا جب اس میدان میں اسے اشرف علی کا مقابلہ کرنا پڑا تو وہ خود کو کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کمینگی کی اس سطح پر نہیں آ سکتا تھا۔ دوسری طرف اشرف علی اور اس کے ساتھیوں کی زبان مزید کھل گئی تھی اور وہ ایسے ایسے الزام تراش رہے تھے کہ شیطان بھی شرما جائے۔ نوراں کا کردار گاؤں والوں کے سامنے تھا۔ وہ نہ تو کسی کے گھر جاتی تھی اور نہ ہی کوئی مرد اس کے گھر آتا تھا مگر جب جھوٹ تواتر سے بولے جانے لگے تو اس پر یقین کرنے والے چند افراد پیدا ہو جاتے ہیں نوراں کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے لیے گاؤں کی فضا بردن کے ساتھ دشوار ہوتی جا رہی تھی۔ نوراں باہر جاتی تو لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جن کی نظروں میں حقارت اور تمسخر نہیں ہوتا تھا عورتیں بھی اسے رحم آمیز انداز میں دیکھتی تھیں۔ کوئی اس سے معمول کے مطابق پیش نہیں آتا تھا۔ عورتیں اس سے یوں گریز کرتی تھیں جیسے وہ کسی چھوت کے مرض میں مبتلا ہو۔ عورتیں اپنے بچوں کو بھی اس کے بیٹوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے اور کھیلنے سے روکا کرتی تھیں۔ بچے یار محمد اور جان محمد کا مذاق اڑاتے تھے۔ یار محمد بڑا تھا اس قسم کی باتوں سے زیادہ متاثر ہوتا تھا۔ اسے اپنی ماں کے خلاف لگائے جانے والے الزامات کی سنگینی کا احساس تھا۔ وہ کسی سے نظر ملاتے ہوئے شرمندہ ہو جاتا تھا۔

ایک دن اشرف علی کے بڑے پوتے شیر علی نے کھیت سے آتے ہوئے یار محمد پر حملہ کر دیا۔

''دیکھ بے حیا عورت کے بیٹے کو۔۔۔'' یہ سن کر یار محمد غصے سے بھر گیا تھا۔ شیر علی اس سے عمر اور قد و قامت میں کہیں بڑا تھا اسکے ساتھ دو لڑکے اور بھی تھے یار محمد ان کی طرف بڑھا اور ابھی انہیں کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ شیر علی اس پر ٹوٹ پڑا۔ یار محمد نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش اور ایک بار اسے نیچے گرا دیا۔ یہ دیکھ کر شیر علی کے دونوں ساتھی بھی اسکے

ساتھ شامل ہو گئے انہوں نے یار محمد کو بے دریغ مارنا شروع دیا۔ اسے زمین پر گرا کر ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ شیر علی نے بھاری چپل پہن رکھی تھی جس کا اگلا سرا موٹا اور سخت تھا اس نے اپنے پاؤں سے خاص طور سے یار محمد کے سر کو نشانہ بنایا تھا اور کئی بار اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ ایک ٹھوکر پر یار محمد نے فلک شگاف چیخ ماری تھی اور اپنا سر تھام لیا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اس کے منہ سے ہذیانی سی چیخیں نکل رہی تھیں۔

''اوئے اسے کیا ہوا؟'' شیر علی کے ایک دوست نے گھبرا کر پوچھا۔

''فکر نہ کرو۔۔۔ مکر کر رہا ہے۔ ابھی دو تین لاتیں اور پڑیں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

شیر علی نے بے پروائی سے کہا مگر جب یار محمد اسی طرح سر تھامے زمین پر لوٹیں لگاتا رہا تو تینوں ہی متوحش ہو گئے۔ اتفاق سے یہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا سوائے ننھے جان محمد کے جو ابھی صرف چھ سال کا تھا۔ بھائی کے پاس آتے ہوئے اس نے ان تینوں کو یار محمد پر ٹوٹتے دیکھا تھا اور سہم کر ایک درخت کے پیچھے ہو گیا تھا۔ وہ تینوں بے دریغ اس کے بھائی کو مارتے رہے پھر یار محمد کے سر پر ایک ضرب لگی اور وہ سر تھام کے پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ تینوں ڈر کے بھاگ گئے تب جان محمد بھائی کے پاس آیا۔

''کیا ہوا بھائی؟''

اس نے پوچھا مگر یار محمد نے کچھ سنا نہیں وہ اسی طرح چلاتا رہا پھر یکدم زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ اس نے بھائی کو جھنجھوڑا۔ وہ ساکت رہا تو جان محمد ڈر کر بھاگا۔ وہ سیدھا ماں کے پاس گیا اور روتے ہوئے اسے بھائی کے بارے میں بتانے لگا اس کے ٹوٹے الفاظ سے جو نوراں نے سنا تھا اس کا دل دہل گیا تھا وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر بھاگی تھی۔ راستے میں اسے دو بھائی ملے جو یار محمد کو اٹھا کر لا رہے تھے۔

''کیا ہوا میرے پتر کو کیا ہوا؟''

''ناسی! یہ ادھر بے ہوش پڑا تھا۔''

نوراں اسے تانگے میں ڈال کر قصبے سے بارہ میل دور واقع ہسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ یار محمد کے حلیے سے ظاہر تھا کہ اس پر تشدد ہوا ہے۔ جسم اور چہرے پر ضربوں کے

خون آلود نیلگوں نشانات تھے۔ سارے راستے وہ اس کے منہ کے زخموں پر دوپٹہ پھیر کر خون صاف کرتی رہی اور روتے ہوئے یار محمد کا یہ حشر کرنے والوں کو بددعائیں دے رہی تھی۔

''خدا اینو جہنم وچ سڑے۔''

ہسپتال میں ڈاکٹروں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ نوراں نے منت سماجت کی تو ایک ڈاکٹر نے ترس کھا کر یار محمد کا معائنہ کیا اور نوراں سے کہا۔

''بی بی! اپنے بیٹے کو بہاولپور لے جاؤ۔ اس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ دماغ کا ڈاکٹر ہی صحیح دیکھ سکتا ہے۔''

''بھائی کچھ تو کر۔۔۔ میرا بچہ مر جائے گا۔''

ڈاکٹر ہمدرد تھا اس نے یار محمد کو ممکن حد تک طبی امداد دے کر ایمبولینس کے ذریعے بہاولپور روانہ کر دیا وہاں یار محمد کو ہسپتال کے دماغی امراض کے وارڈ میں داخل کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا اسکی طویل بیہوشی ظاہر کر رہی تھی کہ اسکے سر پر آنے والی چوٹوں نے دماغ کو متاثر کیا ہے۔ یار محمد کو ایک ہفتے تک ہوش نہیں آیا تھا اور یہ ہفتہ نوراں نے یار محمد کے سرہانے گزارا تھا آخر ڈاکٹروں نے یار محمد کے سر کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ آپریشن میں اس کے دماغ پر سے خون کے جمے ٹکڑے نکال دیے گئے اور آپریشن کے بعد اسے ہوش بھی آ گیا مگر یہ دیوانے کا ہوش تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ کبھی روتا اور کبھی ہنسنے لگتا۔ اس کی حالت دیکھ کر نوراں دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ اس کا جوان بازو ٹوٹ گیا تھا۔ جس سے اس نے اپنی ساری توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اسے اپنی خبر نہیں رہی تھی۔

ایک مہینہ کے بعد نوراں دیوانے یار محمد کو لے کر گاؤں آئی۔ جان محمد نے اسے بتا دیا تھا کہ شیر علی اور اسکے ساتھ دو لڑکے یار محمد کو مار رہے تھے۔ اس نے پنچائت میں لاحاصل فریاد کی مگر جان محمد کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا گیا۔ شیر علی صاف مکر گیا تھا کہ اس کی یار محمد سے لڑائی ہوئی تھی۔ پنچائت نے اسے اس الزام سے بری قرار دے دیا تھا۔ نوراں کا کلیجہ خون ہو گیا تھا اس کے بیٹے پر ظلم کرنے والے اسے دیوانہ بنانے والے کتنی آسانی سے بری الذمہ ہو گئے تھے۔

''اے خدا تو دیکھ رہا ہے۔'' اس نے بھری پنچائت میں فریاد کی تھی۔

"تجھے تو کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تو ظالم کو جانتا ہے اے خدا میرے بچے کا یہ حال کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنا دے۔"

وہ روتی ہوئی یار محمد کو لے کر وہاں سے چلی آئی۔ یار محمد کی مدد سے کسی حد تک وہ زمین کو آباد کیے ہوئے تھی۔ وہ اپنی عمر اور ہمت سے بڑھ کر ماں کی مدد کرتا تھا۔ دیوانہ ہو کر وہ زمین گھر والوں اور ماں بھائی سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ سارا دن مارا مارا پھرتا تھا۔ خود سے باتیں کرتا۔ روتا یا ہنستا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے پتھر مارتے تھے اور گاؤں کے بڑے ان بچوں کو مارتے تھے۔ نوراں زمین سنبھالتی یا گھر دیکھتی۔ جان محمد کو سنبھالتی یا یار محمد کے پیچھے پیچھے ماری ماری پھرتی۔ حالات دن بدن اس کے لیے دشوار ہوتے جا رہے تھے۔ آخر ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے رحمت علی سے مدد طلب کی۔

"رحمت بھائی! آپ ہمیشہ میرے کام آتے رہے ہیں اب یہ زمین پٹے پر لے کر مجھ دکھیاری پر ایک احسان اور کریں میں زمین نہیں سنبھال سکتی۔"

درحقیقت رحمت الٰہی خود بھی نوراں کی زمین پٹے پر لینا چاہتا تھا۔ اس کی زمین سے ملی ہوئی تھی۔ اپنے مزدوروں کے ساتھ اسے بھی وہ بآسانی کاشت کر سکتا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر معاملات طے کر کے اس نے زمین پٹے پر لے لی۔ اشرف علی کو پتا چلا تو وہ تلملا کر رہ گیا تھا مگر اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ رحمت الٰہی بازی لے گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ رحمت الٰہی نے طے کیا تھا کہ زمین کے عوض پیداوار کا چوتھائی نوراں کو دیا کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یار محمد کو میو ہسپتال کے دماغی امراض کے شعبے میں داخل کروانے میں بھی نوراں کی مدد کی تھی۔

جان محمد پرائمری سکول جاتا تھا۔ زمین سے سال بھر کا اناج آ جاتا تھا۔ باقی اخراجات پورے کرنے کے لیے نوراں نے جانور پال رکھے تھے۔ کبھی کبھی کھیتوں میں محنت مزدوری کا کام مل جاتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔ ہر تیسرے چوتھے مہینے نوراں جان محمد کو لے کر لاہور جاتی تھی اور یار محمد کو دیکھ کر واپس آ جاتی اسکی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے نوراں کو بتایا کہ سر پر لگنے والی چوٹ کی بنا پر یار محمد کے دماغ پر خون جم گیا تھا اگر اس کا فوری آپریشن ہو جاتا تو شاید وہ ٹھیک ہو جاتا لیکن اب

اسے ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا۔ کوئی معجزہ ہی یار محمد کو ہوش میں لا سکتا تھا۔ کبھی کبھی اسے دورہ پڑتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے تھے اور منہ سے جھاگ نکلنے لگتا۔ اس دورے میں اس کی ایک بار زبان بھی کٹ گئی تھی۔ جس کے بعد وہ توتلا کر بولنے لگا تھا۔

زندگی کسی قدر پرسکون ہو گئی تھی۔ زمین پٹے پر دے کر نوراں اپنی ساری توجہ گھر اور جان محمد کو دے رہی تھی۔ وہ باقاعدگی سے سکول جاتا تھا۔ وہاں سے آ کر ماں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا تھا۔ نوراں کے دل میں یار محمد کا کانٹا تھا۔

دن میں جب بھی اس کی یاد آتی اس کی آنکھیں برسنے لگتی تھیں۔ اس کی نظر جب بھی شیر علی یا اشرف علی پر پڑتی اس کے دل سے بے اختیار بددعائیں نکلنے لگتی تھیں۔ مگر یہ نفرت اس نے خود تک رکھی ہوئی تھی۔ جان محمد کو اس میں حصہ دار نہیں بنایا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اس میں اتنا شعور تھا کہ وہ جانتی تھی کہ نفرت کی آگ سب سے زیادہ نفرت کرنے والے کو جلاتی ہے۔ یہ آدمی سے اس کا سکھ بھی چھین لیتی ہے اور اسے سوائے انتقام کی آرزو کے کچھ نہیں دیتی ہے۔

مگر ماں نہ سہی گاؤں کے دوسرے لوگ تھے جو اسے بتاتے تھے کہ اس کے گھرانے پر آنے والی آفت کی ذمے داری اشرف علی کے خاندان پر ہے۔ اسکا بھائی آج ہوش وحواس سے بیگانہ گھر سے دور ہسپتال میں پڑا تھا تو اشرف علی کے خاندان کی وجہ سے۔ ان کی زمین ان کے پاس نہیں رہی تھی تو یہ بھی ان کی کارستانی تھی۔ جان محمد خود بخود نفرت کے ماحول میں پرورش پاتا رہا تھا وہ جب شیر علی کو دیکھتا۔ اس کے تن بدن میں چنگاریاں دوڑ جاتی تھیں۔ شیر علی اس سے عمر میں دس سال سے زیادہ بڑا تھا وہ بیس برس سے بڑا گھبرو جوان تھا اور اپنی جوانی کے زعم میں دندناتا پھرتا تھا جان محمد اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ نفرت اسکے اندر پرورش پا رہی تھی۔ کئی سال گزرنے کے باوجود وہ منظر اس کے ذہن میں تازہ تھا جب اس کا بھائی سر تھامے زمین پر لوٹ رہا تھا اور ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلا رہا تھا اس کے پاس یہی شیر علی اپنے دوستوں کے ہمراہ کھڑا بے پروائی سے یار محمد دیکھ رہا تھا۔ وہ جب شیر علی کو دیکھتا تو اس کی رگوں میں دوڑتی نفرت اسے دہکا دیا کرتی تھی اور اپنی بے بسی اور کم مائیگی اس نفرت کو ہلکا کر دیتی تھی مگر ختم نہیں ہوتی

تھی۔ اسی بجھتی بجھتی نفرت کے ساتھ وہ جوانی کی سرحدوں کی طرف بڑھتا رہا۔

جان محمد اوسط درجے کا طالب علم تھا بہت اچھے نمبر نہیں لیتا تھا لیکن کسی کلاس میں فیل نہیں ہوا۔ مڈل کر کے وہ میٹرک کے لیے دوسرے سکول میں داخل ہوا جو اس کے گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ جان محمد روزانہ اتنی دور جاتا اور پھر وہاں سے واپس آتا تھا۔ سردیوں کی کڑکڑاتی صبحیں ہوں یا گرمیوں کی تپتی دوپہریں اسے یہ فاصلہ چل کر طے کرنا پڑتا تھا۔ پیدل طویل فاصلہ طے کرنے کی عادت اسے اسی زمانے میں پڑی تھی۔ دو سال میں اس نے میٹرک کر لیا۔ اس کا ارادہ شہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ مگر دونوں ماں بیٹے کھاتے بڑی مشکل سے تھے۔ اس کی تعلیم کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے۔ اس موقع پر جان محمد کو زمین کا خیال آیا اس نے ماں سے کہا۔

''ماں یہ زمین بیچ کر میں شہر میں تعلیم حاصل کر سکتا ہوں۔''

''ناپتر! یہ زمین تیرے پرکھوں کی نشانی ہے۔ بھلا پرکھوں کی نشانی بھی کوئی بیچتا ہے۔''

''پرکھوں کی نشانی۔'' جان محمد نے تلخی سے کہا۔

''کیا دے رہی ہے ہمیں یہ پرکھوں کی نشانی۔ دو وقت کی روٹی۔۔۔ وہ تو آدمی کام کر کے بھی کما لیتا ہے۔''

''ناپتر! میں یہ زمین نہیں بیچنے دوں گی۔'' جان محمد نے ماں کو دوسرے زاویے سے سمجھایا۔

''ماں زمین بیچ دے لاہور چل کر رہیں گے۔ میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ کوئی کام بھی کر لوں گا پھر ماں ہم تیسرے چوتھے مہینے کے بجائے دوسرے تیسرے دن بھائی کو دیکھنے جا سکیں گے۔''

اس بات نے نوراں کو بھی لبھا دیا تھا مگر زمین سے چمٹے رہنے کی موروثی فطرت غالب آ گئی۔ اس نے زمین بیچنے سے انکار کر دیا۔

''نہ پتر! کوئی اور طریقہ دیکھ۔ اب تو کام کر لے۔۔۔ اپنی زمین آباد کر لے سترہ [illegible] رہا ہے۔''

شہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں تھی مجبوراً اسے ماں کی بات ماننا پڑی۔ نوراں نے رحمت الٰہی سے زمین واپس مانگی کہ اب اس پر جان محمد خود کاشت کرے گا۔ رحمت الٰہی جانتا تھا کہ جان محمد نے اپنی زمین خود سے کاشت کی تو پرانے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ اشرف علی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس نے نوراں کو سمجھایا۔

''پھر جائی زمین بے شک لے لے۔۔۔ مگر جان محمد میرے ساتھ مل کر کاشت کرے جو فصل میں لگاؤں وہ بھی وہی لگائے اس میں دونوں کا فائدہ ہوگا۔ جان محمد کو بہت سارے مسائل سے نجات مل جائے گی۔''

رحمت الٰہی کی تجویز معقول تھی اس لیے نوراں اور جان محمد مان گئے۔ جان محمد نے زمین پر کام شروع کر دیا لیکن الگ سے حد بندی نہیں کی۔ رحمت الٰہی نے بیج، پانی اور کھاد اپنے ذمہ لے لیے تھے اس کے بدلے جان محمد اپنے حصے کی چوتھائی پیداوار لیتا تھا۔ اجرت کی معقول رقم جان محمد کو ادا کرنا پڑتی تھی۔ اس میں سراسر اس کا فائدہ تھا پھر اسے رحمت الٰہی کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا موقع بھی ملتا تھا۔ وہ جالندھر سے ہجرت کر کے اس جگہ آباد ہوا تھا اور کاشت کاری کا ماہر تھا۔

اشرف علی اب بوڑھا ہو چکا تھا مگر حرص کم نہیں ہوئی تھی اس نے گزشتہ سالوں میں دھونس، دھاندلی اور خرید کر اپنی زمین میں اضافہ کیا تھا اور اب بھی اس کی نظر نوراں کی زمین پر تھی۔ جب اس نے سنا کہ نوراں کا بیٹا جان محمد زمین کاشت کرنے لگا ہے تو اس کی پرانی خواہش پھر سے جاگ اٹھی مگر یہ جان کر وہ کسی قدر ٹھنڈا ہوا کہ جان محمد رحمت الٰہی کے ساتھ ملک کر کاشت کر رہا ہے اور اس نے اپنی زمین کی حد بندی بھی نہیں کی ہے۔ اس سے کسی جھگڑے کا مطلب تھا رحمت الٰہی سے جھگڑنا جو اس سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ اس کے چھ جوان بیٹے اس کا دست و بازو تھے پھر اب جان محمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے خاصا قد کاٹھ بنا لیا تھا کھیتوں میں کام کرنے لگا تو جسم نے مزید جان پکڑ لی تھی۔ سال بھر میں تین گنا زیادہ آمدنی ہوئی تو اسے ماں کے فیصلے سے خوشی ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ جان محمد کے کام کرنے سے گھر میں اتنی خوش حالی ضرور آئی تھی کہ نوراں اب ہر مہینے لاہور جا کر بیٹے سے مل آتی تھی۔ گھر کی حالت بھی بہتر بنائی

تھی۔ جان محمد جب زمین سے لگا اور اس کام میں دلچسپی لی تو اس کے ذہن میں نئی تجویزیں آنے لگیں اس نے رحمت الٰہی کو مشورہ دیا۔

''چاچا! کیوں نہ زمین پر کپاس لگائی جائے۔''

''پتر! سوچ تو میں بھی رہا ہوں لیکن ادھر زمینوں پر کپاس کم لگاتے ہیں لوگ۔''

''چاچا ہماری زمین اچھی ہے پانی بھی ہے پھر کپاس کی فصل کئی گنا دیتی ہے۔''

رحمت الٰہی نے سوچا اور مان گیا۔ انہوں نے ساری زمین پر کپاس کاشت کی کپاس کے کیڑے نہ ہونے کی وجہ فصل اچھی ہوتی تھی اور پہلی بار نوراں کے پاس پیسہ آیا تھا۔'' اس نے جان محمد سے کہا۔

''پتر! پیسہ مشکل سے آتا ہے اور آسانی سے چلا جاتا ہے اسے کسی نفع والے کام میں لگا۔''

''کیا کروں ماں؟''

''ایسا کر ایک بھینس لے لے۔ دودھ دہی کی آسانی ہوگی اور اوپر سے آمدنی بھی ہوگی۔'' نوراں نے تجویز دی۔

''بھینس کی دیکھ بھال میں کرلوں گی۔''

جان محمد نے بھینس لے لی۔ رحمت الٰہی نے اس کی مدد کی اسے اچھی نسل کی بھینس دلوادی تھی۔ کھانے پینے میں فراغت آئی تو جان محمد کی صحت بھی شاندار ہوگئی تھی مگر یہ بھینس فساد کی وجہ بن گئی۔ دن بھر یہ رحمت الٰہی اور جان محمد کی حد بندی پر اگی گھاس چرتی رہتی تھی۔ جان محمد اس پر نظر رکھتا تھا لیکن اس روز اس سے چوک ہوگئی۔ اس نے نظر نہیں رکھی تھی اور بھینس چرتے چرتے اشرف علی کے کھیت کی طرف جا نکلی گندم کی بوائی ہوئی تھی اور پودے چھ سات انچ اٹھے تھے۔ بھینس نے خاصے رقبے میں پودے چر ڈالے۔ اسی لمحے اشرف کے آدمی وہاں آنکلے۔ انہوں نے بھینس پکڑ لی اور اپنے باڑے میں لے جا کر باندھ دی۔ جان محمد اور رحمت الٰہی کو اطلاع ملی تو وہ چوہدری اشرف علی کے گھر جا پہنچے۔ جان محمد نے کہا۔

''چوہدری صاحب آپ کے کارندے میری بھینس پکڑ کر لے آئے ہیں۔''

''اوئے تیری بھینس نے میری زمین سے فصل چری ہے۔ پہلے اس کا حساب کر۔'' اشرف علی نے رعونت کہا تھا۔

''ارے ہماری زمین پر کوئی دوسرا کام نہیں ہوسکتا۔ تیری بھینس نے دو تین من گندم کا ستیاناس کیا ہے اتنی قیمت دے اور بھینس لے جا۔''

''یہ زیادتی ہے چوہدری صاحب! میں اتنی رقم تو ہرگز نہیں دوں گا۔''

''تب بھینس بھی نہیں ملے گی۔''

''میں دیکھتا ہوں کیسے نہیں ملے گی۔'' جان محمد جوش میں آگیا تھا۔

''کس میں جرات ہے مجھے روکے۔''

وہ باڑے کی طرف جانے لگا۔ اشرف علی کے دو آدمیوں نے روکا تو وہ ان سے بھڑ گیا۔ ذرا سی دیر میں دھواں دھار لڑائی ہو رہی تھی۔ جان محمد نے دو کارندوں کو لہولہان کر دیا اسے بھی چوٹیں آئیں تھیں۔ جان محمد اندر جا کر بھینس کھول کر لے آیا تھا اس لیے چوہدری اشرف سوائے دھمکیاں اور گالیاں دینے کے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ رحمت الٰہی اس صورت حال پر پریشان ہوگیا۔

''پتر! تجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''چاچا! ان لوگوں سے دبنے پر حال میرے بھائی جیسے ہوتا ہے۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔ تو رحمت الٰہی خاموش ہوگیا جان محمد نے بھینس لا کر گھر میں باندھ دی اور ماں کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ اشرف علی نے اس کے خلاف تھانے میں رپورٹ کروادی تھی۔ آدھی رات کو پولیس نے اسے گھر سے اٹھالیا اور صبح تک اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا اقبال جرم کروانے سے زیادہ اس مشق ستم کی وجہ اشرف علی کی طرف سے دی جانے والی رقم تھی اس پر الزام تھا کہ اس نے اشرف علی پر قاتلانہ حملہ کیا اور اس کے کارندوں کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ اشرف علی نے ان کی ڈاکٹری رپورٹ لے کر کیس پکا کر دیا تھا۔ جب تک اسے رحمت الٰہی ضمانت پر رہا کرواتا پولیس نے اس پر بے پناہ تشدد جاری رکھا تھا۔ وہ تھانے سے نکلا تو اس سے از خود چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ نوراں اس کی حالت دیکھ کر رونے پیٹنے لگی۔

''ہائے ربا! میرے بچے کے ساتھ کیا کیا؟''

جس بھینس کے لیے جان محمد نے جرات کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی بک گئی تھی اس کی ضمانت کے لیے اشرف علی نے کیس پکا کر دیا تھا اور رحمت الٰہی کی کوششوں کے باوجود ضمانت منسوخ ہوگئی کیونکہ بقول اشرف کے اس کے خاندان کے لوگوں کی جان کو خطرہ تھا پولیس اسٹیشن میں جان محمد کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی صورت میں پولیس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہتا تھا اس لیے وہ ں اور رحمت الٰہی کے روکنے کے باوجود روپوش ہوگیا تھا۔ وہ اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ بھارت کی سرحد کے نزدیک اس کا گاؤں تھا۔ اس کے پاس جا کر جان محمد کو پتا چلا کہ اس کا دوست اصل میں اسمگلروں کا ساتھی ہے۔ اس نے جان محمد سے کہا۔

''اگر پولیس سے بچنا چاہتے ہو تو کچھ دن کے لیے بھارت چلے جاؤ۔''

''وہاں بھارتی پولیس پیچھے پڑ جائے گی۔''

''کچھ نہیں ہوتا یار! ہم تو ایسے آتے جاتے رہتے ہیں جیسے اپنے چاچے مامے کے پاس آ جا رہے ہیں۔''

دوست نے جان محمد کو اس طرح راضی کیا کہ وہ سرحد پار چلا گیا۔ وہ تین مہینے بھارت میں رہا اور مختلف علاقوں کی سیر کرتا رہا اس کے تمام اخراجات اس کے میزبانوں کے ذمے تھے۔ اسکا صلہ انہوں نے واپسی میں اسے کیریئر کے طور پر استعمال کر کے وصول کر لیا۔ وہ واپس آیا تو اشتہاری بن چکا تھا۔ ایک سال اپنے اس دوست اسمگلر کے ساتھ گزار کر وہ جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ دوسری طرف اس کے گھر کے حالات خراب ہو رہے تھے۔ ہسپتال میں یار محمد کی حالت بگڑنے لگی تھی اور ڈاکٹر دوبارہ آپریشن کرنے کے لیے خاصی رقم مانگ رہے تھے۔ جان محمد نے جرم کو اپنا پیشہ نہیں بنایا تھا ایک رات ماں اور رحمت الٰہی سے ملا انہیں زمین کا سودا کرنے کو کہا۔ رحمت الٰہی نے زمین خریدنے کی پیشکش کی اور اس بار نوراں بیٹے کی خاطر مان گئی۔ رحمت الٰہی نے زمین خرید لی۔ یار محمد کے آپریشن کے لیے مطلوبہ رقم اس نے فوری طور پر دے دی تھی۔ نوراں لاہور گئی فیس جمع کروائی۔ یار محمد کا آپریشن ہوا اور یار محمد آپریشن کے دوران ہی زندگی ہار گیا۔ نوراں اس کی لاش لے کر

واپس آئی تھی۔

جان محمد کو اطلاع مل گئی تھی مگر وہ بھائی کے جنازے میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا اور اس کے اندر اشرف علی اور اس کے خاندان کے خلاف نفرت بھڑک اٹھی تھی۔ جس رات یار محمد کو دفنایا گیا تھا اس رات جان محمد اپنے دو ساتھیوں سمیت آیا اور اشرف علی کی زمین پر کھڑی گندم کی تقریباً پک جانے والی فصل کو آگ لگا دی۔ وہ تینوں مسلح تھے اور اشرف علی کے ملازم انہیں دیکھ کر رفو چکر ہو گئے تھے جان محمد نے ایک جلتا کپڑا لے کر اطمینان سے پوری زمین کا چکر لگایا اور چند منٹوں میں اشرف علی کی زمینوں سے شعلے اٹھ رہے تھے جانے سے پہلے جان محمد نے اشرف علی کی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر اسے للکارا

''تم لوگوں نے جو ظلم کیے ہیں ان کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

جب تک جان محمد عام سا کاشتکار تھا اشرف علی اسے ستاتا رہا مگر اب اس نے ہتھیار اٹھا لیے تھے اس لیے اشرف علی ڈر گیا اسے اپنی اولاد کی فکر پڑ گئی تھی۔ لہٰذا اس نے مصالحت کی کوشش شروع کر دی وہ نوراں کے پاس آیا نوراں اسے دیکھ کر بپھر گئی تھی۔

''اب کیوں آیا ہے میرا پتر چھین لیا ہے۔ دوسرا مارا مارا پھر رہا ہے تیری وجہ سے میرا گھر تباہ ہو گیا۔ زمین کی اتنی حوس تھی تجھے کیا قبر میں جا کر چھین آئے گا۔''

اشرف علی سننے پر مجبور تھا۔ وہ ضبط کر کے بولا۔ ''میں مصالحت کی بات کرنے آیا ہوں اور تو مجھے گالیاں دے رہی ہے۔''

''میں کیا گالیاں دوں گی میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑا ہے چوہدری مجھے اس سے انصاف چاہیے۔''

''پر تیرا پتر میرے لیے خطرہ بنا ہوا ہے میں چاہتا ہوں وہ خود بھی سکون سے رہے اور مجھے بھی رہنے دے۔ تجھے پتا ہے اس نے میری فصل کو آگ لگا دی ہے۔''

''تو کسی کے گھر کو آگ لگائے گا تو وہ تیرے گھر کو ہی آئے گی۔''

''میں اس کے خلاف مقدمے ختم کرا دوں گا۔''

''تو کرا دے، میرا اس سے رابطہ نہیں۔'' نوراں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔

نوراں سے مایوس ہوکر اشرف علی نے پولیس پر زور دیا کہ وہ جلد از جلد جان محمد کو گرفتار کرے۔ اس نے جان محمد کے خلاف مزید کیس رپورٹ کرائے تھے۔ ان میں فصل کو آگ لگانے اور حویلی پر حملہ کرنے کا کیس تھا۔ دشمنی کی یہ آگ ٹھنڈی ہونے کی بجائے بھڑک رہی تھی۔ یار محمد کے مرنے کے بعد نوراں صدمے کے ہاتھوں اپنی صحت کھوتی جا رہی تھی۔ ایک سال بعد وہ ایک رات سوتی رہ گئی۔ جان محمد کو ماں کے مرنے اور دفن کرنے کی اطلاع چار دن بعد ملی تھی۔ پولیس قبرستان پر پہرے دے رہی تھی اس لیے وہ قبر تک بھی نہ جا سکا۔ اس نے اشرف علی کے باڑہ پر دھاوا بولا اور وہاں موجود چارے کو آگ لگا دی اس آگ میں اشرف علی کی اعلیٰ نسل کی چار بھینسیں بھی جل گئی تھیں۔ جان محمد نے اشرف علی کو پیغام دیا تھا اگر اسے نقصان ہوا ہے تو اب سکون سے اشرف علی کا خاندان بھی نہ رہے گا۔ جان محمد نے زمین رحمت الٰہی کو دے کر باقی ماندہ رقم لے لی تھی اس طرح اس نے گاؤں اور اس زمین سے اپنا آخری ناتا توڑ لیا تھا۔ چند سال بعد اس نے اپنا گروہ بنا لیا اور اس نے کئی بار اشرف علی کے خلاف کارروائی کی۔ دو بار اسکی فصلوں کو آگ لگائی۔ ایک بار شیر علی کو اتنا مارا کہ اس کے بازو اور پاؤں کی ہڈیاں توڑ دیں۔

اس واقعے کے بعد پولیس زیادہ سرگرمی سے جان محمد اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس لیے وہ جنوب مغربی پنجاب کی طرف نکل گیا۔ اس نے اپنا ٹھکانہ سندھ پنجاب اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں کو بنایا اس طرح اسے پولیس سے بچنے میں آسانی رہا کرتی تھی۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جنگلات اس کی پناہ گاہ تھے۔ جہاں اس نے کئی ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ ڈاکو ہونے کے باوجود "عرف جانو" نے کچھ اصول بنا رکھے تھے ایک تو یہ کہ ہمیشہ بڑا ہاتھ مارو۔ وہ دیہاتیوں اور بسوں کو لوٹنے کے خلاف تھا۔ اس کا نشانہ پیسے والے لوگ بنا کرتے تھے۔ عام طور سے ایک ہی واردات میں وہ اتنا حاصل کر لیا کرتا تھا کہ اس کے ساتھی مہینوں آرام سے کھاتے تھے۔ واردات کر کے وہ ہمیشہ شہروں کی طرف نکل جاتے تھے اور اس وقت واپس آتے تھے جب پولیس کی سرگرمیاں ماند پڑ جاتی تھیں۔ واردات سے پہلے جان محمد اور اس کے ساتھی تمام تیاریاں مکمل کر کے جاتے تھے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ صرف معلومات پر بھروسا کر کے چلے گئے اور انہوں نے

حالات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ نتیجے میں جان محمد کو اپنے تین ساتھی گنوانے پڑے تھے۔ وہ خود بھی زخمی ہوا تھا اگر مولوی عبدالصمد اسے پناہ نہ دیتا اور علاج نہ کرتا تو یہ ممکن تھا کہ وہ بچ جاتا لیکن پولیس کے ہتھے ضرور چڑھ جاتا۔

مولوی عبدالصمد کے لیے جان محمد کی داستان کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کے رہنے والے تھے روز و شب ان کی آنکھیں دیکھا کرتی تھیں۔ زورداروں کا جبر روز کا حصہ بن جاتا تھا اور پھر جبر کی پیداوار خود جبر کے نظام کا حصہ بن جاتا تھا۔ اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم کرنے لگتا تھا۔ فرار کی زندگی اور ذلت کی موت ان کا مقصد ہوتی تھی۔ چاہے وہ پولیس کی گولی سے ہو یا پھانسی کے پھندے سے۔ اکثر ڈاکو مارے جاتے تھے۔ ان میں سے شاذ ہی کسی کو طبعی موت آتی تھی مگر نجانے کیوں انہیں ڈر لگتا تھا کہ جان محمد عام ڈاکوؤں سے مختلف ہے شاید اس کا انجام بھی عام ڈاکوؤں سے مختلف ہو رات سونے سے پہلے جب انہوں نے اللہ سے دعا کی تو خاص طور سے جان محمد کے لیے دعا کی تھی۔

صبح صفیہ کی آنکھ فجر سے ذرا پہلے خود بخود کھل گئی تھی۔ وہ اٹھی تو مولوی صاحب مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اندر جا کر جان محمد آواز دی۔

"پتر جاگ رہے ہو کیا؟" جان محمد کی آنکھ کھل گئی۔

"جی مولوی صاحب!"

"فجر کا وقت ہو گیا ہے۔" جان محمد جھجک گیا۔

"مولوی صاحب میں پاک نہیں ہوں۔ وضو کیے بغیر نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"نماز معاف نہیں۔ وضو معاف ہے۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"کیا نماز آتی ہے۔"

"جی مولوی صاحب! ماں نے کبھی ایک نماز قضا نہیں ہونے دی تھی۔"

"جنتی عورت تھی۔ دنیا میں اس کی خدمت نہ کر سکے۔ آخرت میں اسکی خدمت کرو۔ نیک اعمال کرو۔ بچوں کی نیکی کا ثواب ماں باپ کو جاتا ہے۔"

مولوی عبدالصمد کہہ کر چلے گئے اور وہ ندامت میں غرق ہو گیا۔ واقعی اس نے زندگی میں ماں کو کوئی خوشی نہیں دی تھی۔ بہر حال اس نے اشاروں سے نماز پڑھی اور ماں کی

مغفرت کے لیے دعا مانگی۔

دعا مانگ کر اسے سکون ملا تھا جیسے اس نے اپنے حصے کے فرض کا ایک چھوٹا سا لیکن مضبوط حصہ ادا کیا ہو۔ نماز پڑھ کر اس نے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ پہلو میں ہلکی سی ٹھیس اٹھی۔ مگر یہ تکلیف ناقابل برداشت نہیں تھی۔ مولوی عبدالصمد کی دوا نے حیرت انگیز تیزی سے زخم کو بھرا تھا اسے یاد آیا تھا جب اس کے پاؤں میں گولی لگی تھی تو ڈاکٹر سے علاج کروانے کے باوجود مشکل سے دسویں دن اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ مولوی عبدالصمد نے اسے ابھی حرکت کرنے سے منع کیا تھا لیکن اپنی بہتر کیفیت کی وجہ سے اس نے چانس لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پٹی پکڑ کر دونوں پاؤں نیچے لایا۔ اس حرکت سے تکلیف نسبتاً زیادہ ہوئی تھی۔ لیکن ابھی بھی قابل برداشت تھی۔ اس نے سہارا کے لیے دیوار پر ہاتھ رکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ پیروں پر کھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ کسی خلا میں گر رہا ہو۔ اس نے دوسری غلطی یہ کی کہ دیوار سے ہاتھ ہٹا کر دونوں پاؤں پھیلا کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

صفیہ وضو کر کے نماز پڑھنے کے لیے اندر جا رہی تھی۔ جب اس نے جان محمد کو چارپائی کے پاس کھڑے اور ڈگمگاتے دیکھا تھا تو اسے لگا کہ وہ خود کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے پھر وہ آگے کی طرف جھکنے لگا تب وہ بے اختیار اس کے قریب چلی آئی اسے احساس تھا کہ جان محمد گرنے کو ہے اس سے پہلے ہی اس نے نرمی سے اسے سہارا دے دیا۔

جان محمد کو محسوس ہوا کہ اندھیرے میں اسے کوئی نرم لیکن مضبوط سہارا میسر آ گیا ہے۔ وہ گرنے سے بچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھانے والا اندھیرا چھٹ رہا تھا اس نے اپنے لمبے چوڑے وجود کو نازک سی صفیہ کے ساتھ لگے دیکھا تھا۔ اس نے جان محمد کو اتنی خوبی سے سہارا دے رکھا تھا کہ اس کا زخم متاثر نہ ہو۔ جان محمد دو دن سے اسے دیکھ رہا تھا ایک بار اس سے بات کی تھی۔ مولوی صاحب نے اسکا نام لیا تو اسے اسکا نام پتا چلا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ کاش یہ سہارا ہمیشہ رہے پھر اسے اپنی سوچ پر شرم آنے لگی۔ اس نے ہڑبڑا کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر صفیہ نے اسے نرمی سے تھامے تھامے چارپائی پر بٹھا دیا۔

"تمہیں اس طرح نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ابھی زخم صحیح نہیں ہوا ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" مشقت سے زیادہ کسی اور وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"درد بھی کم ہے۔"

"اب تم بابا سے پوچھے بغیر کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" اس کے لہجے میں تحکم آ گیا تھا۔

"مجھے اس طرح بندھ کر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"اس زخم نے مجبور کر دیا ہے۔"

"ہر آدمی کہیں نہ کہیں مجبور ہوتا ہے۔ یہ اللہ کے ہونے کی نشانی ہے۔"

"کیا تم بھی کہیں مجبور ہوتی ہو؟" صفیہ اب تک نگاہیں جھکا کر اس سے باتیں کر رہی تھی اس نے پہلی بار نظر اٹھا کر دیکھا۔

"عورت بھی بعض اوقات مجبور ہوتی ہے۔"

"لہجے سے لگتا ہے تم پڑھی لکھی ہو۔" جان محمد نے موضوع بدل دیا۔

"نہیں مجھے بابا نے پڑھنا سکھایا ہے۔ ابھی میں لکھنا سیکھ رہی ہوں۔ کیا تم بھی پڑھے ہوئے ہو؟"

جان محمد نے سر ہلایا۔ "میں نے سکول پڑھا ہے پھر کالج جانے موقع نہیں ملا۔"

"کالج۔۔۔" صفیہ نے کہنا چاہا تو اسے یاد آیا کہ وہ نماز پڑھنے جا رہی تھی۔

"اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔"

"ہاں..... نماز پڑھو۔" جان محمد آہستہ سے بولا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صفیہ اس سے بات کرتی رہے اسے محسوس ہوا کہ صفیہ بھی اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ صفیہ کے جانے کے بعد وہ سیدھا لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد مولوی عبدالصمد آ گئے تھے۔ انہیں نجانے کیسے علم ہو گیا تھا۔

''کیا تم نے اٹھنے کی کوشش کی تھی؟''

''جی مولوی صاحب! میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔''

''میں نے کہا نا ابھی زخم کچا ہے بظاہر بھر رہا ہے لیکن ذرا سی غلطی اسے دوبارہ ہرا کر دے گی۔ مجھے دکھاؤ۔'' مولوی عبدالصمد نے اس کے زخم کا معائنہ کیا۔

''ہاں اس پر زور پڑا ہے رکو میں مرہم لگا دوں پھر تمہیں ضروریات سے فارغ کراتا ہوں۔''

جان محمد کو مولوی عبدالصمد کی جانفشانی پر تعجب ہوتا تھا۔ کہ اتنی محنت سے اس کی دیکھ بھال کرتے تھے کہ اس کا سگا بیٹا ہوتا تب بھی شاید اس سے زیادہ جانفشانی سے اس کا خیال نہ رکھ پاتے۔ اسکی ایک ایک ضرورت اور ایک ایک چیز کا خیال رکھنا۔ اسے کس وقت خوراک اور پانی کی ضرورت ہے، کس وقت اسے دوا لگانی ہے، پٹی بدلنی ہے، اسے رفع حاجت کرانی ہے، وقتے وقتے سے اس کے زخم کا معائنہ کرنا۔ یہ تمام امور مولوی عبدالصمد اسی طرح انجام دیا کرتے تھے جسطرح وہ باقاعدگی سے نماز پڑھانے جاتے تھے۔ اس کے زخم پر تازہ تیار کیا مرہم لگا کر انہوں نے اسے دوسرے کاموں سے فارغ کرایا۔ انکا جو جوڑا اس نے پہن رکھا تھا وہ بھی میلا ہو رہا تھا انہوں نے ایک اور صاف جوڑا اسے بدلوایا۔ کھانا اب وہ خود کھاتا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب اپنا کھانا بھی اسکے ساتھ لا کر کھاتے تھے۔ ناشتے کے بعد مولوی صاحب زمین کی دیکھ بھال کرنے چلے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ذرا سورج بلند ہو جائے تو اسے دھوپ سینکانے باہر لے جائیں گے۔ وہ بے تابی سے سورج بلند ہونے انتظار کرنے لگا۔ صفیہ باہر تھی۔ نجانے کیا کر رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد جب خاصی روشنی ہو گئی تھی۔ مولوی صاحب اندر آئے اور اسے سہارا دے کر اس طرح آہستہ آہستہ باہر لے آئے کہ اس کے زخم پر بالکل زور نہ پڑے اور چھوٹی سی چادر دیواری کے اندر پڑی چارپائی پر لٹا دیا۔ صفیہ پہلے ہی اس پر صاف ستھری رلی بچھا چکی تھی۔ رلی اس چادر کو کہتے ہیں جو کپڑے کے مختلف رنگ اور ڈیزائنوں کے ٹکڑے سے تیار کی جاتی ہے اس میں بعض اوقات متعدد تہیں بنا کر ہلکا سا لحاف بھی تیار کر لیا جاتا ہے۔ سندھ اور زیریں پنجاب میں دیہات کی عورتیں یہ کام گھروں میں کرتی

ہیں۔ صرف سوتی دھاگے اور رنگ برنگے کپڑوں کی مدد سے دلکش ڈیزائن تیار کرتی ہیں۔ صفیہ بھی فارغ اوقات میں رلی تیار کرتی تھی۔ مولوی عبدالصمد کا یہ گھر چھوٹا سا اور کچا تھا مگر صفیہ نے اسے صاف اور چمکا کر رکھا تھا۔ دیواریں اور فرش ساتھ ستھرے تھے۔ چھت پر لکڑی اور گھاس تھی۔ سامنے مختصر سا برآمدہ تھا جس کے نیچے چولہا تھا۔ وہیں کھانا بنتا تھا۔ صفیہ اس وقت بھی اس کے لیے مرغ کا شوربہ تیار کر رہی تھی۔ جس کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب اسے بٹھا کر پھر کام پر چلے گئے اور صفیہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ یعنی مولوی صاحب اس پر اعتماد کر کے اپنی بیٹی کو اس کے سامنے چھوڑ کر گئے تھے۔ دھوپ میں نرمی اور گرمی تھی۔ جان محمد ممکن حد تک سیدھا ہو کر لیٹ گیا اور اس نرمی سے لطف اندوز ہونے لگا اس کیفیت میں نجانے اسے کب نیند آ گئی۔ غنودگی میں اس نے کسی کو اپنے پاس محسوس کیا چند لمحے کے لیے وہ پھر سو گیا۔ جاگا تو اسے اپنی کمر تلے کوئی شے محسوس ہو رہی تھی۔ یہ چھوٹا سا تکیہ تھا جو اس کے زخم کو چارپائی پر لگنے سے بچانے کے لیے رکھا تھا۔ دھوپ اسی قدر تیز ہو گئی تھی۔ لیکن اب بھی بھلی لگ رہی تھی۔ مولوی صاحب شاید مسجد کے لیے جا چکے تھے اور صفیہ اندر سے نکلی۔

''دھوپ بری تو نہیں لگ رہی۔ میں چادر لا دیتی ہوں۔''

''نہیں اچھی لگ رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مولوی صاحب کہاں ہیں؟''

''بابا مسجد گئے ہیں۔ آ جائیں تو تم دونوں کا کھانا دیتی ہوں۔''

''یہ تکیہ کس نے رکھا ہے؟''

''میں نے۔'' صفیہ لجا کر بولی۔

''تمہارا زخم بے خبری میں دب جاتا تو میں نے تکیہ رکھ دیا۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔''

''نہیں پتا تو چلا تھا۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

صفیہ شرما کر چولہے کی طرف چلی گئی۔ وہ خود سے یہ سوال کرتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی کہ وہ ایک اجنبی کے لیے جو کل یہاں سے چلا جاتا اتنا کیوں کر رہی تھی اسے اس کے

لیے یہ سب کرنا اچھا کیوں لگ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد مولوی صاحب مسجد سے آ گئے اور جان محمد کو سہارا دے کر اندر لے گئے۔

''میں آیا تھا تمہیں اندر لے جانے کے لیے مگر تم گہری نیند میں تھے۔ اس لیے میں نے چھیڑا نہیں۔''

''دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔''

مرہم لگا کر مولوی صاحب نے اس بار ململ کی صاف پٹی کی۔ کھانا کھلا کر مولوی صاحب ایک بار پھر مسجد چلے گئے تھے۔ صفیہ بھی کمرے کا دروازہ بند کر کے بھیڑ بکریاں چرانے لے گئی۔

جان محمد ان باپ بیٹی کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا۔ وہ اجنبیت جس کا احساس اس کے دل میں دو دن سے تھا۔ وہ اب ایک انسیت میں بدل گیا تھا۔ کبھی کبھی صفیہ کے حوالے سے اس کے دل میں خوش گمانی سی آ جاتی تھی۔ تب وہ جلدی سے خود کو یاد دلاتا کہ اب وہ ایک قاتل اور مفرور مجرم ہے پولیس اس کے پیچھے ہے اور اس کا یہ پیچھا کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کبھی وہ سوچتا کہ نام اور حلیہ بدل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پیسہ بھی تھا مگر سوال وہی تھا کیا اس حالت میں مولوی صاحب صفیہ کے لیے اسے قبول کریں گے۔ یہ بات طے تھی کہ صفیہ کا رشتہ نہیں ہوا تھا۔

بیگ میں پونے دو لاکھ کی رقم تھی۔ اس سے با آسانی وہ نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ مگر اسے مولوی صاحب کی طرف سے ایک اشارہ چاہیے تھا۔ وہ ان سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا اور جھجک رہا تھا۔ ممکن ہے وہ بات کرے اور مولوی صاحب انکار کر دیں اس انکار کے بعد وہ یہاں کیسے رہے گا ہاں وہ جاتے وقت بات کر سکتا ہے۔ اگلی صبح تک اس کی حالت میں خاصی بہتری آئی تھی۔ پہلی بار وہ رفع حاجت کے لئے خود باہر گیا۔ البتہ مولوی عبدالصمد نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو دیکھا جو اپنے مالک کو خیریت سے پا کر ہنہنانے لگا۔

''اچھا گھوڑا ہے مولوی عبدالصمد بولے۔''

''جی! اب یہی ایک ساتھی باقی رہ گیا ہے۔'' وہ افسردہ ہو گیا تھا۔

ناشتہ کر کے مولوی صاحب نے اپنے کام نمٹائے پھر اسے لا کر صحن کی چارپائی پر بٹھا دیا۔ تیز روشنی میں اس کے زخم کا معائنہ کرتے رہے۔

''بس ایک دن اور لگے گا۔ زخم اندر سے کافی خشک ہو گیا لیکن ابھی تمہیں دو تین دن ٹھہرنا ہوگا۔''

جان محمد نے کہنا چاہا کہ اب وہ ساری عمر ان کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ لیکن الفاظ اس کی زبان پر آ کر رک گئے۔

''مولوی صاحب! انسان کی زندگی میں سب سے بڑی نعمت کیا مل سکتی ہے؟''

''اچھی اور نیک بیوی۔''

''کیا میں اس نعمت کا حقدار ہوں؟'' وہ جھجکا۔

''کیوں نہیں، ہر انسان ہر شخص اس کا حقدار ہے۔''

اس نے سرد آہ بھری۔

''لیکن میں ایک بیوی کو کس طرح خوش رکھ سکوں گا۔ جب کہ مجھے اگلے لمحے کا پتا نہیں ہے۔''

''یہ سب تو مجھے نہیں پتا لیکن نکاح اللہ کا حکم اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے جسے کسی حال میں ترک نہیں کیا جا سکتا ہے اگر اپنی زندگی کو خطرہ محسوس ہو تب بھی۔۔۔ کیونکہ زندگی تو اللہ نے دی ہے وہی موت کا وقت جانتا ہے ممکن ہے تم لمبی عمر جیو۔ اس لیے یہ سوچ کر ترک سنت کرنا درست نہیں ہوگا۔''

''لیکن مولوی صاحب! مجھ جیسے آدمی کو رشتہ دے گا کون؟ میں مجرم ہوں، ڈاکے مارتا رہا ہوں، قتل کر چکا ہوں، میرے خلاف بے شمار مقدمے ہیں، پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر اللہ نے تمہارے مقدر میں بیوی لکھی ہے تو وہ بہر صورت ملے گی۔''

تب اس نے جرات کر لی۔

''مولوی صاحب! اگر میں آپ سے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگوں تو؟''

مولوی عبدالصمد چونکے نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے لیے جان محمد کا سوال غیر متوقع نہیں تھا انہوں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''پتر! اگر تم کوئی حلال ذریعہ معاش تلاش کرو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' جان محمد دنگ رہ گیا تھا۔

''یعنی آپ کی نظر میں میرا مجرم، مفرور ہونا کوئی برائی نہیں ہے۔ اگر تم مجرم ہو تو یہ حکومت کا معاملہ ہے تمہیں سزا دے اگر گناہ گار ہو تو وہ معاملہ اللہ کا ہے میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کیوں کروں تقدیر بنانے والا وہی ہے۔ اگر تم آئندہ کے لئے توبہ کرتے ہو اور حرام رزق سے گریز کرو گے تو میں بخوشی اپنی بیٹی کا رشتہ تمہیں دوں گا۔''

''اور، اور۔۔۔ اگر میں آپ سے جھوٹ بولوں۔۔۔ دھوکہ دوں۔''

''انسان خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ وہ کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

''تب مجھے بتائیں میں کیا کروں؟''

جان محمد کے لئے اپنی کیفیت چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ جس کام کو اس نے ناممکن سمجھا تھا وہ اتنی آسانی سے ہو جائے گا، اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ مولوی عبدالصمد نے اسے اب تک حیران کیا لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ اس کی کیفیت بھانپ گئے تھے۔

''شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے؟''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔'' اس نے بمشکل کہا۔

مولوی صاحب نے گہری سانس لی۔

''بات بہت آسان ہے۔ ایک مسلمان کے طور پر میں نے اپنے دین کو جس طرح سمجھا ہے میرا فرض ہے اس پر پوری طرح عمل کروں۔ میں عمل کر رہا ہوں اگر میں ایسا نہ کروں تو مجھ میں اور ایک منافق میں کیا فرق رہ جائے گا۔ علم اور عمل کا یہ تضاد مجھے قیامت کے دن خدا اور اس کے رسولؐ کے سامنے شرمندہ کر دے گا۔ اس ذلت سے بہتر ہے میں آج مشکل بھگتوں۔''

''کیا آج کے دور میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں؟'' جان محمد نے دل میں

کہا۔ اس نے پہلے بھی مولانا دیکھے تھے ان میں ایسے بھی تھے اور ایسے بھی جنہوں نے دین کو تجارت بنا لیا تھا۔ ایسے بھی تھے جو خلق خدا کو گمراہ کر کے قتل و غارت گری پر اکساتے تھے۔ اپنے فرقے کو مسلمان اور دوسرے فرقے کو کافر قرار دیتے تھے۔ ان میں کوئی مولوی عبدالصمد جیسا نہیں تھا جو دین کو جتنا سمجھتا اتنا عمل ضرور کرتا۔ بے شمار عالم تھے جو مولوی عبدالصمد سے ہزار گنا زیادہ دین کے مسائل سمجھتے تھے مگر وہ مسائل میں ہی الجھے رہتے تھے۔ اصل دین پر ان کی توجہ کم جاتی تھی۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے ایک انسان کو زندگی گزارنے کے جو آداب، قرینے اور اصول دیئے تھے یہ عالم ان کو جانتے اچھی طرح ہیں لیکن ان پر عمل کی توفیق کم ہوتی ہے۔'' مولوی عبدالصمد نے اسے جواب دے دیا تھا۔ اب اس پر تھا کہ وہ کس حد تک مولوی صاحب کی شرط پوری کرتا ہے۔

دو دن میں اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی۔ وہ اتنے دن سے یہاں تھا اور اس نے کسی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مولوی عبدالصمد سے پوچھا۔

''کیا یہاں آپ کے رشتے دار نہیں ہیں۔'' انہوں نے ''نہیں'' میں جواب دیا۔

''میں اس جگہ کا رہنے والا نہیں ہوں۔ جالندھر کا مہاجر ہوں۔ میرے والد وہاں ایک مسجد میں پیش امام تھے۔ فسادات میں خانہ خدا کو چھوڑنے پر انہوں نے شہادت کو ترجیح دی مجھے اور میری بیوی کو انہوں نے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلے ہم بہاولپور میں آباد ہوئے لیکن وہاں میرے ہی بھائیوں نے میرا جینا حرام کر دیا انہیں خطرہ تھا کہ میں ان کی مسجد پر قبضہ نہ کر لوں حالانکہ میں نے اسے کبھی معاش نہیں سمجھا تھا۔ جدی پشتی کاشت کار ہیں۔ جالندھر میں بھی زمینیں تھیں۔ مجبور ہو کر میں یہاں آیا۔ اس نخلستان کو دیکھا تو یہیں آباد ہو گیا کلیم میں یہ زمین اپنے نام کروالی۔ اللہ اس سے عزت کیساتھ روزی دیتا ہے میرے گھر پر کوئی نہیں آتا ہے سب کو پتا ہے میں مسجد میں ہوتا ہوں اور گھر پر صرف میری بیٹی ہوتی ہے۔''

''اسے میں اللہ کی حفاظت میں چھوڑ کر جاتا ہوں اس سے بہتر حفاظت کرنے والا کون ہے؟''

''ہاں۔۔۔ لیکن شاید میں ایسا نہ کر سکوں۔''

''جب تم کسی بیٹی کے باپ بنو گے اور اس کی حفاظت کے لیے پریشان ہو گے تب تمہیں اس ذات سے بڑھ کر کوئی اس کا حفاظت کرنیوالا نظر نہیں آئے گا۔''

''مولوی صاحب! اس دنیا میں ہر روز بے شمار لوگوں کی بیٹیاں حادثوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

''یہ ان کی اعتقاد کی مضبوطی کا معاملہ ہے۔ اللہ کہتا ہے۔ مجھ سے جیسا گمان کرو گے میں پورا کروں گا اگر کوئی حفاظت کرتا ہے اور جو اپنے زور بازو پر بھروسا کرتا ہے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں اس سے بھی زیادہ زور بازو رکھنے والے لوگ ہیں۔''

''مگر میں نے تو سنا ہے پہلے تدبیر کرنی چاہیے پھر اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' مولوی عبدالصمد مسکرائے۔

''پتر! میں نے تدبیر بھی کی ہے میں اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا مگر سمجھ لو کہ صفیہ پر انسانوں کی طرف سے کوئی مصیبت آئی تو وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔'' جان محمد کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے مولوی عبدالصمد سے پوچھا۔

''یہاں پر کوئی حجام ملے گا؟''

''گاؤں میں ایک شخص ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ میری داڑھی اور سر کے بال اس طرح تراش دے کہ میں آسانی سے نہ پہچانا جاؤں۔''

''میں اسے لے آؤں گا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہے۔ میں منع کر دوں گا تو پھر کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔''

''اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو اسے لے آیئے گا پھر مجھے ایک جوڑا چاہیے۔ مزدوروں جیسا، میں پیدل جاؤں گا۔''

''میرا مشورہ ہے کہ جنگل تک گھوڑے پر جاؤ، میدانی علاقے میں پیدل جانے سے دیر بھی لگے گی دوسرے اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو تم بھاگ بھی نہیں سکو گے۔ جنگل میں جانور چھوڑو گے تو یہ چرچگ بھی لے گا۔ یہاں پر یہ بھوکا مر جائے گا۔''

''میں نے سوچا تھا کہ اسے آپ رکھ لیں۔'' اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔

مولوی عبدالصمد نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہارے پاس اس وقت جو ہے اس میں سے ماچس کی ایک تیلی بھی میں قبول نہیں کر سکتا اور میرا مشورہ ہے یہاں پر ہر چیز سے نجات حاصل کر کے آنا، تم مسجد رکو گے میں سب کے سامنے تمہیں بے سہارا ظاہر کر کے اپنی فرزندی میں لے لوں گا۔''

''میں ۔۔۔۔ میں خیال رکھوں گا مگر آپ نے سوچا ہے اس صورت میں میرا ذریعہ روزگار کیا ہو گا؟'' مولوی عبدالصمد شفقت سے مسکرائے۔

''پتر! جب میں تجھے بیٹی دے سکتا ہوں تو یہ زمین کیا قبر میں لے کر جاؤں گا۔ مجھ اکیلے میں ہمت نہیں ہے کہ اسے آباد کر سکوں دو آدمی ہوں تو زمین اچھی طرح آباد کر سکیں گے۔ اپنی محنت سے تم اپنا اور بیوی کا پیٹ پال سکو گے۔''

جان محمد نے تشکر آمیز انداز میں مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

''میں اتنا خوش قسمت ہوں یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا مگر مولوی صاحب! میں ایک بار کہوں گا آپ سوچ لیں میں مجرم ہوں پولیس میری تلاش میں ہے۔ مجھ پر ایسے الزامات ہیں اگر میں ایک بار گرفتار ہو گیا تو تب بھی عمر قید لازمی ہے ممکن ہے پولیس عدالت میں پیش ہی نہ کرے مجھے باہر ہی گولی مار دے۔''

مولوی صاحب نے گہری سانس لی۔

''پتر! یہ سب میں نے اللہ کے اوپر چھوڑ دیا ہے میری بچی کی قسمت میں جتنی خوشیاں ہیں وہ اسے ضرور ملیں گی۔''

''مولوی صاحب! کیا آپ مجھ جیسے شخص پر زیادہ ہی اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔'' جان محمد نے آہستہ سے پوچھا۔

''ممکن ہے میں نے آپ سے جھوٹ بولا ہو۔''

''جان محمد! اللہ کا ایک احسان یہ بھی ہے مجھ پر ۔۔۔ میں آدمی کے بارے میں جان جاتا ہوں ۔۔۔ جان محمد میں نے تمہیں جان لیا ہے تم مجھے ہی نہیں بلکہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے ہو۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میں کل معلوم کراؤں گا ممکن ہے پولیس اب بھی تمہیں سرگرمی سے تلاش کر رہی ہو جب تک ان کی تلاش سرد نہ پڑ جائے تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔''

''آپ فکر نہ کریں میں آپ کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔''

دو دن بعد مولوی عبدالصمد حجام علی بخش کو لے کر آئے۔ اس نے کوئی سوال کیے بغیر جان محمد کے بال کاٹے اور داڑھی تراش کر چھوٹی کی۔ اس نے سر کے بال مختصر کرا لیے تھے علی بخش اپنا کام مکمل کر کے چلا گیا تو جان محمد نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اس وقت وہ بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا مولوی صاحب بھی اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ اگرچہ اس کی صحت خاصی گر گئی تھی۔ لیکن جسم اب بھی مضبوط تھا پہلے کی طرح بھرا بھرا نہیں رہا تھا۔ جان محمد کا زخم تقریباً بھر گیا تھا وہ آرام سے چلتا تھا۔ ایک ہفتے بعد اس نے گھوڑے پر سواری شروع کر دی اندر خاصی جگہ تھی۔ وہ آرام سے گھوڑا پھراتا تو توت حاصل کرنے کے لیے وہ مولوی کے ساتھ زمین پر کام کرتا۔

دسویں روز جب وہ جانے کے لیے تیار ہوا تو اسکی صحت نوے فیصد بحال ہو چکی تھی۔ اس کا زخم پوری طرح بھر چکا تھا اور اس جگہ سوائے ایک دبے ہوئے گول نشان کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ جان محمد نے گھوڑے کو اچھی طرح کھلایا پلایا۔ صفیہ نے راستے میں کھانے کے لیے میٹھی روٹیاں تیار کی تھیں۔ رات کے کھانے میں اس نے آلو گوشت بنایا تھا۔ مولوی صاحب عشاء پڑھانے گئے تو جان محمد کمرے سے نکل کر اس کے پاس آ گیا۔ صفیہ چولہے کے پاس بیٹھی دودھ ابال رہی تھی۔ آج دودھ والا لڑکا نہیں آیا تھا اس لیے دودھ رہ گیا تھا صفیہ نے بڑے سے گلاس میں دودھ ڈال کر اسے تھما دیا۔

''صفیہ مجھے تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''کیا بات کرنی ہے؟''

صفیہ کی نظریں جھک گئی تھیں اور چولہے میں سلگتی آگ کی روشنی سے اس کا رنگ بھی آتشیں ہو گیا تھا۔ اس کا دل بے انداز دھڑکنے لگا تھا۔

''صفیہ میں نے مولوی صاحب سے تیرا ہاتھ مانگا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے۔۔۔ مجھے پتا ہے۔''

''کیسے، کیا مولوی صاحب نے۔۔۔؟''

''بابا ایسی بات کیسے بتا سکتے ہے۔'' وہ شرما گئی تھی۔

''بس مجھے پتا ہے۔ مجھ سے نہ پوچھ۔''

''مم۔۔۔ مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔'' وہ بمشکل بولی۔

''تجھے پتا ہے میں ڈاکو ہوں، قاتل ہوں۔'' جان محمد نے کہا۔

''پولیس میرے پیچھے ہے۔''

''جان محمد! میں اپنے بابا پر پورا اعتماد کرتی ہوں۔ وہ میرے لیے ہمیشہ اچھا سوچتے اور کرتے ہیں اگر بابا کہیں صفیہ کنویں میں کود جا تو میں کنویں میں بھی کود جاؤں گی۔''

جان محمد بجھ گیا تھا۔

''یعنی میں تجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس بابا کی خاطر۔۔۔؟''

''اب ایسی بات بھی نہیں۔'' صفیہ نے کہا اور بے اختیار شرما کر وہاں سے بھاگ گئی۔

''ارے۔۔۔ دودھ ابل رہا ہے۔'' اس نے آواز دی اور مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس روز سردی بہت تھی مولوی صاحب عشا پڑھا کر جلدی آ گئے تھے۔ وہ دونوں برآمدے میں چولہے کے پاس آ بیٹھے تھے۔

''یہاں سے کہاں جاؤ گے؟''

جان محمد سوچ میں گم تھا وہ چونکا۔

''مولوی صاحب میں سب سے پہلے یہ رقم ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا جو اس کے حق دار ہیں۔''

''جزاک اللہ۔'' مولوی عبدالصمد خوش ہو گئے تھے۔

''تم اپنی ساری ذمے داریوں سے سبک دوش ہو کر آؤ اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔'' جان محمد نے دل سے کہا۔

رات بھیگتی جارہی تھی وہ خاموش تھے۔ بارہ بجے جان محمد کھڑا ہوگیا۔ اب میں چلتا ہوں مولوی صاحب!"

اس نے جا کر باڑے سے گھوڑا نکالا۔ مولوی عبدالصمد اس کے ساتھ تھے انہوں نے ایک تھیلی جیب سے نکال کر جان محمد کو دی۔

"اس میں کچھ رقم ہے۔ ممکن ہے تمہیں کہیں ضرورت پڑ جائے۔ اس حرام رقم کو خرچ کرنے کی بجائے اسے خرچ کرنا۔"

جان محمد نے تھیلی لے لی۔

"مولوی صاحب! آپ کے احسانات مجھ پر بڑھ رہے ہیں۔" جان محمد ہچکچایا۔

"ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے کام آئے بغیر مسلمان کس طرح ہوسکتا ہے۔"

"مولوی صاحب! آپ نے اس رشتے کے بارے میں صفیہ سے پوچھا؟"

"وہ میری بیٹی ہے۔" مولوی عبدالصمد نے اعتماد سے کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں میں جو اس سے کہوں گا وہ مانے گی۔"

"آپ جیسے شخص کی بیٹی سے یہ امید ہے پھر بھی آپ ایک بار اس کی رائے لے لیں۔"

"پتر! میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ کس بات سے خوش ہوتی ہے اور کس بات سے نہیں۔ اس رشتے میں اس کی خوشی شامل ہوگی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

"اللہ حافظ مولوی صاحب!" جان محمد گھوڑے پر سوار ہوگیا تھا۔

"خدا نگہبان پتر!" مولوی صاحب نے جواب دیا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ ریتلے علاقے کی طرف جارہا تھا اور نخلستان کی جھاڑیوں سے ایک سایہ اسے باقاعدہ دیکھ رہا تھا۔ مولوی صاحب اندر آئے تو صفیہ نہیں تھی۔ انہوں نے اسے آواز دی۔

"صفیہ کہاں ہو؟"

"آئی بابا!" صفیہ بابا کی آواز سے دور سے آئی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ جھاڑیوں سے

نمودار ہوئی تھی۔

"بابا ضرورت سے گئی تھی۔"

"جا۔۔۔۔ جا کر سو جا۔" مولوی صاحب اپنی چارپائی کمرے میں لاتے ہوئے بولے۔

صفیہ نے چارپائی پر بستر بچھایا۔ "بابا۔۔۔! وہ کہاں گیا ہے؟" اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

"اس نے کچھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہیں وہ ادا کر پھر آجائے گا۔"

صفیہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"وہ پھر آئے گا بابا۔۔۔! مگر کیوں؟"

"اس لیے دھی رانی! کہ میں نے تیرے حوالے سے اس سے ایک وعدہ کیا ہے۔ جب وہ آئے گا تو میں وہ وعدہ ضرور پورا کروں گا۔"

"کیسا۔۔۔ کیسا وعدہ بابا؟" صفیہ بمشکل بولی تھی۔

"بیٹی میں نے تیرا ہاتھ جان محمد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ تجھ سے پوچھے بغیر اس اعتماد کے ساتھ کیا ہے کہ تو میرے فیصلے کو خوشی سے قبول کرے گی لیکن اگر تجھے اس فیصلے پر اعتراض ہے تو میں اس فیصلے کو بدلنے میں خوش ہوں گا۔ میرے لیے سب سے اہم تیری رضامندی ہے۔"

"بابا جان! آپ کا فیصلہ میرا فیصلہ اور آپ کی رضامندی میری رضامندی ہے میرے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ بابا! آپ کا ہر فیصلہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔" مولوی عبدالصمد نے اٹھ کر اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھے گی کہ میں نے تیرا رشتہ ایک مجرم کو دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"اول تو مجھے ایسا کوئی حق نہیں ہے۔ دوسرے آپ نے سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے آپ کی سمجھ بوجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

"جیتی رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔"

مولوی عبدالصمد خوش ہو گئے تھے ''لیکن میں تجھے ضرور بتاؤں گا بیٹی! جب میں نے جان محمد کو پہلی بار دیکھا تو مجھے لگا کہ اس کے اندر ایک اچھی روح ہے حالات نے اسے مجرم بنا دیا ہے اگر اسے کوئی سہارا ملے تو وہ جرائم کی دنیا سے نکل سکتا ہے۔ اتنے دن وہ ہمارے ہاں رہا اور اس نے ایک بار بھی تیری طرف غلط نظر سے نہیں دیکھا۔ اس میں اچھی بات قبول کرنے کی صلاحیت ہے اگر ایک بھٹکا ہوا شخص تیری وجہ سے گناہ سے نکل آئے تو یہ بات شاید آخرت میں بخشش کا ذریعہ بن جائے۔''

''میرے لیے اللہ کی رضا آپ کی رضا میں ہے بابا۔۔۔!''

اس رات مولوی عبدالصمد صاحب سونے کے لیے لیٹے تو خاصے مطمئن تھے۔ اندر صفیہ میٹھے خوابوں میں کھو رہی تھی۔

جان محمد چادر اوڑھے گھوڑا دوڑا رہا تھا ریتلے میدان میں دور دور تک کوئی نہیں تھا اس کے باوجود وہ کوشش کر رہا تھا کہ ریت والے حصوں سے گزرے۔ تاکہ سناٹے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نہ گونجے۔ اس سرد رات میں کسی کے باہر نکلنے کا امکان کم تھا وہ زندگی میں کبھی اتنا محتاط نہیں رہا تھا۔ اسے معلوم تھا اس کی ذرا سی غلطی اس کی زندگی کے ساتھ آئندہ زندگی کے خوابوں کا بھی خاتمہ کر دے گی۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر گھومتا تھا اپنے ساتھیوں میں وہ اس وجہ سے سردار تھا۔ اس کے تین ساتھی محتاط رہا کرتے تھے کتنی عجیب بات تھی وہ محتاط نہیں تھا اور زندہ تھا اور جو زندگی کی حفاظت کرتے تھے وہ جان ہار چکے تھے۔ اپنے ساتھیوں کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ خان محمد اسے اس وجہ سے زیادہ پیارا تھا کہ وہ اس کے مرحوم بھائی کا ہم نام تھا۔ اس کی چند مہینے پہلے شادی ہوئی تھی اور وہ اکثر چھپ کر بیوی سے ملنے جاتا تھا۔ باقی لوگوں نے ان کو سمجھایا تھا کہ ان کو شادی راس نہیں آتی ڈاکو اگر بیوی بچوں کا بکھیڑا پال لے تو اس کی زندگی مختصر ہو جاتی ہے مگر اس پر بھوت سوار ہو گیا تھا لڑکی اس کو پسند آ گئی تھی بیوہ تھی ماں باپ نے پہلی شادی قریب المرگ بڈھے سے کر دی تھی۔ محض اس لیے کہ وہ اس کے قرض خواہ تھے۔ یہ قرض انہوں نے بیٹی کی صورت میں اتار دیا تھا۔ بڑے میاں کے مرنے کے بعد اسکے بیٹوں نے میراں کو گھر سے نکال دیا اور وہ پھر سے ماں باپ کے گھر آ بیٹھی۔

خان محمد نے اسے کہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ کوشش کر کے اس سے ملا تو چنگاری دوسری طرف بھی بھڑک اٹھی۔ میراں نے ماں باپ کی مرضی کے بغیر خان محمد سے شادی کر لی۔ اس نے میراں کو ملتان میں گھر لے کر دیا تھا۔ خان محمد اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اسے بھجوا دیا کرتا تھا آخری بار وہ آیا تو خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ میراں نے اسے باپ بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔ خان محمد نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ رقم جمع کر کے کاروبار کرے گا اور جرائم کی دنیا کو خیر آباد کہہ دے گا لیکن اب وہ دنیا کو خیر آباد کہہ گیا تھا۔ سلطان اور عجب خان کے گھرانے تھے لیکن ان کا انحصار ان پر نہیں تھا ان کا برسوں سے اپنے گھرانوں سے رابطہ نہیں تھا۔

چاندنی میں اسے راستہ دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی وہ ریتلے میدان سے نکل کر جھاڑیوں اور چھوٹے درختوں والے جنگل میں داخل ہوا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ اس جنگل سے نکل کر اس جگہ آیا جہاں اس کے ساتھی ایک ایک کر کے مارے گئے تھے ایک جگہ اسے خون کا بڑا سا دھبہ نظر آیا وہ کچھ دیر وہاں ساکت کھڑا رہا پھر آگے چل دیا۔ اس لمحے اسے لگا ماضی سے اس کا رابطہ ختم ہو گیا ہے اس نے سڑک سے کچھ دور گھوڑا چھوڑ دیا۔ اس کی لگام زمین میں اٹکا کر اس نے اس کی گردن پر تھپکی دی۔

''دوست ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب تم اپنی راہ پکڑو اور میں اپنی۔۔۔''

وفادار جانور اسکے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ شاید وہ اکیلے رہ جانے سے خوف زدہ تھا مجبوراً جان محمد نے اس کی لگام درخت کی شاخ سے اس طرح اٹکا دی کہ وہ کوشش کرے تو لگام آسانی سے نکل جائے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک ڈھابا تھا لیکن اس وقت وہ بند تھا وہ صبح کے وقت کھلتا تھا۔ البتہ اس میں چارپائیاں ہر وقت ملتی تھیں۔ وہ وہاں رک جاتا تو اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا۔ صبح وہ کسی بھی بس سے ملتان روانہ ہو سکتا تھا۔ اس نے چرمی بیگ راستے میں ایک طرف پھینک دیا تھا مولوی عبدالصمد نے اسے ایک جوڑا دیا تھا جان محمد نے رقم اس کے درمیان میں لپیٹ کر اسے چادر کی گٹھڑی میں باندھ لیا تھا۔ ڈھابے کے آگے چھپر تلے متعدد چارپائیاں پڑی تھیں جن پر راہ میں رکنے والے ٹرک ڈرائیور آرام کر رہے تھے۔ ایک روپیہ چارپائی کا اور پچاس پیسے کمبل کے بجائے صرف چارپائی لینا کافی سمجھا اور اپنی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ صبح ہونے میں دو ڈھائی گھنٹے تھے۔ کھلی جگہ پر سردی بھی

غضب کی تھی۔ وہ ٹھہرتا رہا اور جاگتا رہا۔ شاید اس وجہ سے اسے کام کی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔ دو چارپائی آگے دو افراد آپس میں بات کر رہے تھے۔ موضوع دس دن پہلے ہونے والی ڈکیتی کا تھا، پولیس اب تک چوتھے ڈاکو کی تلاش میں ہے جس کے پاس لوٹ کی رقم تھی متاثر خاندان نے اس ڈاکو کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے نقد انعام کا اعلان کیا تھا۔ جس نے میاں فتح علی پر گولی چلائی تھی اگرچہ موقع پر موجود دوسرے افراد کا بیان تھا کہ میاں فتح علی نے ڈاکو کی وارننگ کے باوجود اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی تھی۔ جس پر اس نے گولی چلادی۔ اس کے باوجود اس سے قتل کی نوعیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تین سو دو کا کیس ہی تھا۔ ایک شخص نے خواہش ظاہر کی کہ کاش وہ ڈاکو اس کے ہاتھ لگ جائے تو وہ پچاس ہزار حاصل کر سکتا ہے۔ جان محمد چادر تلے مسکرایا۔ ان بے چاروں کو خبر نہیں تھی وہ جس کی آرزو کر رہے تھے وہ ان سے دو چارپائی ادھر لیٹا تھا۔ دو گھنٹے بعد ڈھابے والے نے برتن کھڑکھڑانا شروع کر دیے تھے۔ جان محمد نے اٹھ کر اس سے گرم پانی لے کر وضو کیا۔ نماز پڑھی اور پھر چولہے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ڈھابے والا ناشتے کی تیاری کر رہا تھا اس نے جان محمد کی فرمائش پر اسے چائے دی۔

''ملتان جانے والی بس کتنے بجے آتی ہے؟'' اس نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔

''سات بجے جائے گی ایک بس۔۔۔ پھر آٹھ بجے۔۔۔ اس کے بعد دن کے بارہ بجے نکلے گی۔'' ہوٹل والے نے اسے تفصیل سے بتایا۔

''آٹھ بجے والی بس سیدھی جاتی ہے اور سات بجے والی گھوم پھر کر۔''

جان محمد نے سات بجے والی میں ہی جانے کا فیصلہ کیا تھا اس جگہ زیادہ دیر رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ پولیس والے اکثر اس طرف آتے تھے وہ اس کے بارے میں مشکوک ہو جاتے وہ مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کے انداز میں تبدیلی سے عام لوگوں کے لیے اس کے حلیے میں تبدیلی آئی تھی۔ لیکن پولیس والوں کو چہرے پڑھنے کی تربیت دی جاتی تھی انہیں دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے ناشتہ کیا اور سات بجے جو بس آئی اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے ملتان سے ذرا پہلے ایک جگہ اترنے کو کہا۔ اسکا خیال تھا کہ ممکن ہے

ملتان میں داخل ہونے سے پہلے پولیس والے بس چیک کریں۔

مذکورہ جگہ اتر کر اس نے ملتان کی طرف پیدل سفر شروع کر دیا۔ اس کا حلیہ اس مزدور سے مل رہا تھا جو گاؤں سے مزدوری کرنے شہر کی طرف جاتا ہے وہ تھیلا شانے پر لادے آہستہ آہستہ چلتا شہر میں داخل ہو گیا۔ اسے خان محمد کی بیوی بلکہ بیوہ کا پتا معلوم تھا۔ خان محمد نے اسے ایک متوسط بستی میں مکان خرید کر دیا تھا اس نے اپنی ساری جمع پونجی اس پر لگا دی۔ افسوس کہ وہ اپنے بچے کی خوشی دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا۔ اسے خان محمد کی بیوہ کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وسیع احاطے والا یہ مکان نئی آبادی ہونے والی جگہ پر تھا۔ عقب میں کھیت تھے اور مکان بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے تھے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔

''مجھے میراں سے ملنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نا کیوں ملنا ہے؟'' عورت نے لڑنے والے انداز میں کہا۔

''بس ملنا ہے اسے بلاؤ اگر وہ اندر ہے۔''

جان محمد کو اس کے لہجے پر غصہ آ گیا۔ مکان تلاش کرنے کے بعد اس نے اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لیا تھا اسے ڈر تھا کہ پولیس نے خان محمد کی بیوہ کا سراغ نہ لگا لیا ہو اس صورت میں وہ اس کی نگرانی کرتے مگر اسے دور تک کوئی بندہ نظر نہیں آیا تھا۔ قریب ترین مکان بھی کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بوڑھی عورت زیرلب کہتی اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی سنوری نوجوان لڑکی آئی۔ صحت مند جسم پر اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور دوپٹے کے تکلف سے بے نیاز تھی اسے دیکھ کر جان محمد کی آنکھیں جھک گئیں تھیں۔

''ہاں بھئی کیا بات ہے؟'' لڑکی نے گنواروں کے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے میراں سے ملنا ہے۔''

''میں ہی میراں ہوں۔'' وہ بولی۔

''میں خان محمد کا دوست۔۔۔''

''ہم کسی خان محمد کو نہیں جانتے۔''

لڑکی تیز لہجے میں بولی۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی تھی کہ جان محمد نے پاؤں اڑا دیا۔

"میں اس کا ایک دوست ہوں اگر تم نے میری بات نہ سنی تو اپنا نقصان کروں گی۔"

لڑکی کی آنکھیں چمک گئی تھیں۔ اس نے سر ہلا کر دروازہ ذرا سا کھول دیا۔

"بول بھی کیا بات ہے؟"

"بات یہاں کرنے کی نہیں اندر کرنے کی ہے۔"

میراں حسین لڑکی تھی۔ خان محمد ایسے ہی اس کے پیچھے پاگل نہیں ہوا تھا مگر اسکے انداز میں کوئی بات جان محمد کو کھٹک رہی تھی اس نے متوقع نقصان والی بات پر کتنی تیزی سے پترہ بدلا تھا، جان محمد محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اس کی خاطر اتنا بڑا خطرہ لے کر غلطی کی تھی۔ صرف دس دن پہلے اس کا شوہر پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا وہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح بھی سنوری تھی۔ اس کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ اسے اپنی بیوگی کا غم ہے وہ جان محمد کو بادل نخواستہ اندر لے آئی۔ مکان اندر سے خاصا سجا سنورا تھا ڈرائنگ روم میں ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈ بھی رکھا تھا۔

"ہاں بول کیا بات ہے؟ بات جلدی کر مجھے کہیں جانا بھی ہے۔"

"بیوہ چار مہینے دس دن سے پہلے باہر نہیں جاتی۔" وہ ہنسی۔

"میں دوسری بار بیوہ ہوئی ہوں۔ اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"گویا تمہیں خان محمد کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں۔"

"ناجی! میں نے شادی بیوہ ہونے کے لیے کی تھی۔"

ڈاکو بھلا بیماری کی موت کب مرتا ہے۔ میں نے پہلے ہی دل پکا کر لیا تھا کہ کام کی بات کرو۔"

"خان محمد نے بتایا تھا کہ تو بچے سے ہے۔"

"ناجی! دھوکا ہوا تھا مجھے۔۔۔ بعد میں ڈاکٹرنی کے پاس گئی تھی اس نے بتایا کہ کوئی چکر نہیں ہے مجھے ایسے ہی چکر آ رہے تھے۔" وہ ہنسی تو اسکے انداز میں بے حیائی تھی۔

"سنا ہے خان محمد نے مرنے سے پہلے تیرے پاس کوئی بڑی رقم رکھوائی تھی۔"

اس نے ناگواری سے جان محمد کو دیکھا۔

"پہلے تو اس نے کوئی پیسا نہیں رکھوایا اگر رکھوایا بھی تھا تو تجھے اس سے کیا۔"

"اس میں میرا حصہ بھی تھا۔ میں اپنا حصہ لینے آیا ہوں۔"

"میں نے کہا نا کہ اس نے کچھ نہیں رکھوایا تھا۔ اب تو جا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"ویسے تو ہے کون۔۔۔؟"

"اس چکر میں نہ پڑ میں کون ہوں میں صرف تجھے دیکھنے آیا تھا۔" جان محمد کھڑا ہو گیا۔

"اگلی بار رقم لینے آؤں گا تیار رکھنا۔"

"لے۔۔۔ تو تو مجھے کچھ دینے آیا تھا۔" میراں اس کے پیچھے لپکی۔

"الٹا مجھ سے لینے کی بات کر رہا ہے۔" جان محمد دروازے پر آیا۔

"اگر میں دینے کی بات نہ کرتا تو تو مجھے اندر آنے دیتی۔"

"دفع ہو جا۔" میراں اسے دروازے سے باہر دھکیلتے ہوئے غرائی تھی۔

میں نے شاید اس طرف آ کر غلطی کی ہے۔ اس نے سوچا مجھے رقم وہیں کہیں کسی مستحق کو دے دینی چاہیے تھی۔ پھر اسے مولوی عبدالصمد کی بات یاد آئی۔ رقم کو حقدار تک پہنچا کر ہی وہ اپنی اس ذمہ داری سے سبک دوش ہو سکتا تھا۔ رقم کے صحیح حقدار میاں فتح علی کے وارثین تھے مگر ان تک رقم کیسے پہنچائی جائے۔ وہ ایک جھونپڑی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے اس پر غور کرتا رہا تھا۔ اس کے پاس ذاتی رقم محدود تھی۔ مولوی عبدالصمد نے اسے تین سو روپے دیے تھے۔ وہ جتنی دیر کرتا اس کی رقم اتنی ہی تیزی سے خرچ ہوتی جاتی۔ اسے جانے سے پہلے ایک لاکھ اور اسی ہزار کی رقم بہرصورت اس کے حق دار تک پہنچانی تھی۔

اگلے تین دن تک وہ میاں فتح علی کے وارثوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ بمشکل اسے معلوم ہوا کہ میاں فتح علی کی بیوہ ملتان شہر میں اپنے ماں باپ کے پاس رہ رہی ہے۔ اس کے بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ جان محمد نے اس کے پاس جانے سے پہلے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ اس نے داڑھی صاف کرا دی تھی اور شلوار کرتے کی بجائے پتلون قمیض میں گیا تھا۔ میاں فتح علی کا سسرال کھاتا پیتا اور ملتان کے پوش علاقے میں بڑی سی کوٹھی میں رہائش پذیر تھا۔ جان محمد نے خود کو میاں فتح علی کا دوست بتا کر اس کی بیوی سے

ملنے کی فرمائش کی اگرچہ وہ عدت میں تھی لیکن جان محمد نے اس ملاقات کو اشد ضروری قرار دیا۔ اس نے فتح علی کے سسر نصیب ملک سے کہا!

''میں بیرون ملک سے آیا ہوں اور دو روز بعد میری واپسی ہے اس لیے بے حد مہربانی کر کے مجھے ایک بار بھابھی سے مل لینے دیں۔ میں نے ایک امانت ان کے حوالے کرنی ہے۔''

بادل نخواستہ نصیب ملک اس بات پر رضامند ہوا۔ فتح علی کی بیوہ پردے میں اس کے سامنے آئی تھی۔ اس کی صرف آنکھیں اور ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ ان سے جان محمد نے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی نوجوان ہی ہے جبکہ فتح علی کس طرح چالیس بیالیس برس سے کم نہیں تھا۔

''بھابھی سب سے پہلے تو میری طرف افسوس اور دکھ کے جذبات قبول کریں مجھے فتح علی کے مرنے کا بے حد دکھ ہے۔''

''شکریہ بھائی صاحب!'' فتح علی کی بیوہ نے جواب دیا۔

''لیکن میں نے آپ کے بارے میں کبھی فتح علی سے نہیں سنا۔''

جان محمد نے خود کو لاہور کا رہنے والا بتایا تھا۔ جو تین سال پہلے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا نام خاور محمود بتایا تھا۔

''جی بدقسمتی سے باہر جانے کے بعد فتح علی سے میرا رابطہ نہیں رہا تھا۔ درحقیقت میں باہر بھی اس کی وجہ سے ہی گیا تھا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کی رہائش اپنی زمین پر تھی اور آپ۔۔۔؟''

''زمین پر اب اس کے بھائیوں کا قبضہ ہے۔'' فتح علی کی بیوہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''مجھے اور میرے بچوں سے ان کو خطرہ تھا اس لیے مجھے عدت میں وہاں سے نکلنا پڑا۔ خدا غارت کرے اس شخص کو جس نے فتح علی کو قتل کیا۔''

جان محمد لرز گیا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے بتایا تھا کہ مظلوم کی بددعا عرش کو لرزا دیتی ہے۔

''اس شخص نے واقعی بہت برا کیا ہے۔''

''اس نے میرے اور میرے بچوں کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ خدا اسے بھی اسی طرح دنیا اور آخرت میں برباد ہوا اس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

جان محمد کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا پھر اس نے جیب سے رقم کا پیکٹ نکال کر فتح علی کی بیوہ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''بھابھی مجھے اس ملاقات کے لیے چند منٹ دیے گئے ہیں میں یہ امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ فتح علی نے مجھے ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم باہر جانے کے لیے قرض دی تھی۔ میں اسے بے حد شکریے کے ساتھ واپس کرنے آیا ہوں۔''

خدانخواستہ میں اس کا بدل دے بھی نہیں رہا ہوں۔ یہ تو مجھ پر ذمے داری تھی جو میں نے ادا کرنی تھی اب مجھے اجازت دیں بھابھی! ممکن ہے دوبارہ اس طرف آؤں تو آپ سے ملاقات ہو سکے۔''

''ضرور بھائی۔۔۔!'' فتح علی کی بیوہ کھڑی ہو گئی۔

''اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔''

''بھابھی میں پھر کہوں گا یہ مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری تھی۔''

جان محمد نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ سے ایک سوال ہے اگر کبھی مستقبل میں فتح علی کا قاتل آپ کے سامنے آ کر معافی کا طلب گار ہو اور آپ کو پتا ہو کہ اس نے برائی کا راستہ ترک کر دیا ہے تو آپ کا ردعمل کیا ہو گا؟''

''میں اسے قیامت تک معاف نہیں کروں گی۔'' فتح علی کی بیوہ نے دو ٹوک جواب میں کہا۔

''اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے لیے بدترین عذاب کی بددعا کروں گی۔''

جان محمد ایک بار پھر لرز گیا تھا اس نے بمشکل کہا۔

''اچھا بھابھی! اب اجازت چاہوں گا۔''

''خدا حافظ بھائی!''

فتح علی کی بیوہ نے کہا تو وہ فوری طور پر باہر نکل گیا تھا اس کے جاتے ہی فتح علی کا

سر نصیب ملک اندر آیا تھا۔

''یہ کیا کہنے آیا تھا؟''

''ابا جان اس نے فتح علی سے قرض لیا تھا وہ واپس کرنے آیا تھا۔ دیکھیں اس میں ایک لاکھ اسی ہزار روپے۔'' نصیب ملک نے پیکٹ دیکھا اور حیرت سے بولا۔

''فتح علی نے اتنی بڑی رقم کسی کو قرض دے رکھی تھی اور تمہیں پتا بھی نہیں۔''

''یہ پرانی بات ہے۔''

نصیب ملک نے پیکٹ کھولا تو اندر سے سو کے نوٹوں والی اٹھارہ گڈیاں نکلیں۔ ہر گڈی میں سو نوٹ تھے اس حساب سے کل ایک لاکھ اسی ہزار روپے کی رقم بنتی تھی۔ گڈیاں بالکل نئی تھیں اور ان پر اسٹیٹ بنک کی مہر لگی تھی اچانک نصیب ملک کو خیال آیا۔

''فاطمہ۔۔۔!'' اس نے اپنے بیٹی سے کہا۔

''فتح سے اتنی رقم لوٹی گئی تھی اور مجھے یاد پڑتا ہے پولیس نے رپورٹ میں اتنی ہی نئی گڈیوں کا ذکر کیا تھا۔ رقم کی ادائیگی کرنے والے ٹھیکیدار نے پولیس کو بتایا تھا کہ اس نے بینک سے تازہ مہر لگی ہوئی گڈیاں نکلوائی تھیں۔''

فاطمہ نے پریشانی سے باپ کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ابا جان۔۔۔؟''

نصیب ملک کچھ سوچ رہا تھا اس نے فون اٹھا کر کسی کو نمبر ملایا۔

''ہاں، اے ایس پی صاحب! میں نصیب ملک بات کر رہا ہوں۔ جی اللہ کا کرم ہے۔ ایک بات کہنی تھی۔ میرے داماد فتح علی کو قتل کر کے ڈاکوؤں نے جو رقم چھینی تھی کیا اس کی تفصیل آپ کے پاس ہے؟''

''جی اٹھارہ گڈیاں تھیں ان پر بینک کی مقامی برانچ کی مہر بھی لگی تھی۔''

''شکریہ۔ بس یہی معلوم کرنا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ایسے ہی خیال آ گیا تھا۔'' اس نے فون رکھ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

''فاطمہ! میرا شک درست نکلا یہ وہی رقم ہے جو فتح علی کے پاس سے لوٹی گئی تھی۔ دیکھو اس پر نیشنل بینک کی اس برانچ کی مہر بھی لگی ہے جہاں سے ٹھیکیدار نے ادائیگی کے لیے

رقم نکلوائی تھی اس کا مطلب ہوا؟''

فاطمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ ''ابا جان! یہ شخص کون تھا؟''

''میرا خیال ہے اس کا ڈاکو سے کوئی تعلق ہے ممکن ہے یہ ڈاکو ہو جو پولیس سے بچ نکلا تھا۔''

''پر ابا جان! اس نے رقم کیوں واپس کر دی۔ اس رقم کے لیے تو اس نے فتح علی کی جان لی تھی۔''

''شاید اس کا ضمیر جاگ گیا ہے اس نے کیا کہا تھا کہ تم اس قاتل کو معاف کر دو گی اگر وہ کبھی تائب ہو کر تمہارے سامنے آیا تو۔۔۔؟''

''ابا جان! کیا وہ وہی شخص تھا۔ فتح علی کا قاتل۔۔۔؟'' فاطمہ روہانسی آواز میں بولی۔

''کیوں آیا تھا یہ میرے زخم ہرے کرنے کے لیے۔''

''شاید وہ پچھتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے رقم واپس کر دی۔''

''اگر اتنا ہی پچھتا رہا ہے تو خود کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟'' فاطمہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

شاید اس لیے کہ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ رقم بھی پولیس کے قبضے میں چلی جاتی ہمیں نہ ملتی ممکن ہے اب وہ خود کو پولیس حوالے کر دے۔''

''ابا جان! میں اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے ہمارے سر سے سایہ چھین لیا ہے۔''

''خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا بیٹی!'' باپ نے سسکتی بیٹی کو بازو میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

''مجھے روپیہ نہیں، قصاص چاہیے۔''

جان محمد نے دور تک کھیتوں کو دیکھا۔ گندم کی فصل سنہری ہو چکی تھی بس کچھ دن کی بات تھی۔ بالیوں میں دانے پک جاتے اس نے ذرا فاصلے پر کھیتوں کے درمیان اس کچے مکان کو دیکھا جو آج مولوی عبدالصمد کی خواہش پر کیا تھا مرتے وقت انہوں نے خواہش

ظاہر کی تھی کہ اسے بڑا اور پکا مکان بنا سکتا تھا۔ گزشتہ پانچ سال میں اس نے زمین کا حلیہ بدل دیا تھا۔ مولوی عبدالصمد کے پاس دو مربع زمین تھی جس کا بیشتر حصہ بے کار پڑا تھا جان محمد چشمے کے پانی کی مدد سے اس پوری زمین کو زیر کاشت لے آیا تھا۔ اس کے اردگرد ہر طرف ریتلا میدان تھا۔ درمیان میں یہ واحد سرسبز حصہ تھا کھیتوں سے ملے ٹیلے والی مسجد اب پختہ ہو چکی تھی اور اس میں خاصی وسعت بھی آ گئی تھی۔ بیٹری کی مدد سے اس کے لاؤڈ سپیکر سے دن میں پانچ بار اذان کی آواز آتی تھی۔ مسجد میں مدرسہ سکول بھی کھل گیا تھا جہاں دو استاد علاقے کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ان استاذہ اور موذن کی تنخواہ جان محمد نے اپنے ذمے لی تھی اس نے علاقے میں کئی ایک کنویں کھدوائے تھے۔

علاقے کے لوگ اسے ایک بدحال اجنبی کے طور پر جانتے تھے جس کے سر پر مولوی عبدالصمد نے بہت شفقت رکھا تھا اسے اپنی زمین ہی نہیں بیٹی بھی دے دی تھی لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ ایک بے خانماں شخص کے پاس اب اس علاقے کے لحاظ سے سب کچھ تھا۔ اپنا اکھاڑی اور ہر ایک کے کام آنے کی وجہ سے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ مولوی صاحب کے بعد وہی امام بھی تھا۔ لوگ اس کی بے پناہ عزت کرتے تھے کبھی کبھی اسے شک ہوتا کہ کیا وہ واقعی اتنی عزت کے لائق ہے۔

مولوی عبدالصمد نے اسے بیٹی دی، زمین دی، مرتبہ دیا۔ حتیٰ کہ مر گئے تو اپنی جگہ بھی اسے دے گئے لیکن جان محمد کے خیال میں ان کا سب سے بڑا احسان وہ دین کی تعلیم اور سمجھ تھی جو انہوں نے دی تھی۔ ان پانچ سالوں میں اس نے ان سے پڑھا۔ قرآن ناظرہ سے شروع کیا اور انتقال سے مہینے پہلے تک مولوی صاحب نے اسے تفسیر مکمل کروا کے حدیث شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی دینی کتب پڑھاتے تھے۔ ان کے پاس بے شمار کتابیں تھیں۔ گھر کی مغلی شے وہ ٹرنک تھا جس میں جان محمد کے مطابق مولوی صاحب اپنی قیمتی اشیاء رکھتے تھے ایک بار ٹرنک کھلا تو وہ اس میں رکھی کتابیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''آپ نے یہ کتابیں اتنی حفاظت سے کیوں رکھی ہیں؟''

''میری پاس یہی قیمتی شے ہے۔'' مولوی صاحب نے محبت سے کتابوں کو دیکھا تھا۔

''یہ کون سی کتابیں ہیں؟''

''کئی ایسی نایاب کتابیں ہیں جو آج کل شاید ہی کسی کے پاس ہوں لیکن یہ سب دین پر، بڑے علماء کی لکھی کتب ہیں۔ میں تمہیں پڑھاؤں گا لیکن ابھی نہیں بعد میں۔''

مولوی صاحب اس کے اندر کے آدمی کی پالش کرتے رہے۔ جرائم اور مال حرام نے اس میں جو کھردرا پن پیدا کیا تھا اسے نرمی سے ہموار کرتے رہے جیسے کوئی مجسمہ تراش معمولی نقائص کو ہلکے روے سے گھس کر درست کرتا ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ کب بدلتا چلا گیا اس کے اندر کی وحشت اور چوکنا پن نرمی اور سکون میں بدلنے لگا اس کا خوف کم ہونے لگا۔ ابتدا میں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ سوتا تو چونک جاتا۔ اسے لگتا کہ اس کا پیچھا کرنے والے نزدیک آ گئے ہیں۔ برابر والی چارپائی پر سوئی صفیہ کو دیکھ کر اسے تسلی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اس کی بے چینی اتنی بڑھ جاتی کہ وہ اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ صحن میں یا اس کے آس پاس وہ بے قدموں ٹہلتا رہتا۔ مولوی صاحب سے اس کی کیفیت چھپی نہیں تھی اور وہ اس کی وجہ بھی سمجھتے تھے۔ جنگل کے آزاد جانور کو پنجرے میں بند کر دو تو اس کی جو کیفیت ہوتی ہے وہی جان محمد کی تھی۔ وہ جانتے تھے اسے رفتہ رفتہ صبر آئے گا۔

شروع میں مولوی صاحب کو بعض اوقات گمان ہوتا تھا کہ یہ صفیہ تھی جس کی وجہ سے جان محمد نے یہاں آنا اور رہنا قبول کیا تھا کہ صفیہ کے ساتھ رہ کر اسے قرار آ جائے گا مگر اس کی بے چینی دیکھ کر انہیں اپنا اندازہ غلط لگا۔ بے شک وہ صفیہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا اس کا حد سے زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ عقبی کوٹھڑی خاصی چھوٹی تھی اور صفیہ اب تنگی محسوس کرتی تھی اس لیے جان محمد نے مولوی صاحب کی اجازت سے عقبی کوٹھڑی کی دیوار بڑھا کر اسے کشادہ کر لیا تھا پھر اس نے بارش میں تکلیف کی وجہ سے چھت پر سیمنٹ کی ٹینیں ڈلوائیں کمروں کا فرش اونچا کرایا۔ نئے دروازے اور کھڑکیاں لگوائیں۔ صفیہ تبدیلیوں سے بے حد خوش تھی۔ کیونکہ اب چاروں طرف کھیت ہو گئے تھے اس لیے جان محمد نے گھر کے گرد چار دیواری بلند کروا کے اس میں بھی دروازہ لگوا لیا تھا۔ مولوی صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ صفیہ نے برآمدے کے ساتھ پھولدار بیلیں لگائی تھیں۔ گرمیوں میں اب بیلوں کی وجہ سے گھر اندر سے ٹھنڈا

رہتا تھا۔ صحن میں صفیہ نے تختے بنا کر ان میں پھولوں والے پودے لگائے تھے۔ ایک طرف نیم کا گھنا درخت تھا جس کا سایہ باورچی خانے والے حصے تک آتا تھا۔

جان محمد کی زندگی میں تبدیلیاں آئی تھیں تو اس کی وجہ سے مولوی صاحب اور صفیہ کی زندگی میں بھی بے انتہا تبدیلیاں آئی تھیں۔ صفیہ اس کے ساتھ خوش تھی۔ مولوی صاحب ذاتی طور پر اس سے خوش تھے لیکن ان کے لیے اصل اہمیت صفیہ کی خوشی تھی۔ اس کے چہرے کی دمک اور اس کی کھلکھلاہٹ اور اس کی ہنسی کی کھنک بتاتی تھی کہ وہ بے پناہ خوش اور مطمئن ہے۔ ابتدا میں اسے بھی خدشات رہتے تھے کہ یہ خوشیاں اس سے چھن نہ جائیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مطمئن ہوتی گئی تھی پھر وہ امید سے ہوئی۔ یہ شادی کا ساتواں مہینہ تھا۔ اسے چکر آئے اور طبیعت خراب ہوئی تو مولوی صاحب نے فوری طور پر علاقے میں دائی کا کام کرنے والی عورت کو بلوا لیا تھا اور اس نے خوشخبری سنائی تھی کہ صفیہ ماں بننے والی ہے۔

جان محمد خوش تھا مگر صفیہ نے محسوس کیا کہ وہ اتنا خوش نہیں ہے جتنا اسے ہونا چاہئے۔ اس نے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے آپ کو اتنی خوشی نہیں ہو رہی ہے؟ کیا سوچتے ہو؟'' صفیہ نے نرمی سے پوچھا۔

''میں نے ایک عورت کو بیوہ اور دو بچوں کو یتیم کیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بچہ بھی بغیر باپ کے رہ جائے۔''

''خدا نہ کرے۔'' صفیہ دہل گئی تھی۔

''یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟''

جان محمد نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

''صفیہ آدمی کو اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔''

''اس وقت کو بھول جائیں اب تو آپ بدل گئے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں۔'' صفیہ نے التجا کی۔

''ہمارا بچہ آنے والا ہے۔ اس کا خیال کیجیے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں لیکن اندر سے کوئی مجھے ڈراتا ہے۔''

''آپ مجھے اور ہمارے آنے والے بچے کے بارے میں سوچا کریں۔''

اندر کی بے چینی کم کرنے کے لیے جان محمد خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتا تھا وہ کھیتوں میں کام کرتا۔ بعض دفعہ تو پندرہ سولہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ پھر مسجد اور تعلیم کے لیے وقت نکالتا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں سے بمشکل وہ چھ گھنٹے آرام کرتا تھا لیکن آرام کے یہ لمحے اسے سکون دینے کے بجائے اس کی بے چینی میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ سوچوں میں الجھ کر رہ جاتا تھا اسے رہ رہ کر فتح علی بیوہ فاطمہ سے آخری ملاقات یاد آتی تھی۔ اس کی بددعا یاد آتی تو وہ لرز جاتا تھا۔ شاید انسان کو کسی کی بددعا ڈراتی ہے جب اس کے پاس گنوانے کے لیے کچھ ہو اور اب اس کے پاس بہت کچھ تھا۔ بیوی تھی ہونے والا بچہ تھا۔ مولوی صاحب جیسا سہارا تھا۔ روزگار تھا۔ ایک حیثیت تھی۔ لوگ اس سے عزت سے پیش آتے تھے مگر وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ایسے جہاز پر تھا جس کے پیندے میں سوراخ تھا اور وہ کسی وقت بھی ڈوب سکتا تھا اس طرح اس کے پاس جو تھا وہ ایک لمحے میں چھن جاتا اگر پولیس ڈاکو جان محمد کو تلاش کرتی وہاں تک آ جاتی۔

اب وہ جان محمد نہیں تھا غلام محمد تھا یہ نام مولوی عبدالصمد نے تجویز کیا تھا۔ علاقے کے لوگ اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ شروع میں وہ سنتا نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ اسے اس نام پر متوجہ ہونے کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ بھولنے لگا کہ اس کا نام جان محمد تھا۔ آدمی اپنا نام بھول سکتا ہے لیکن اپنا ماضی بھلانا آسان کام نہیں ہوتا۔ ماضی اسے رہ رہ کر یاد آتا تھا خاص طور سے ان تعلیمات کی روشنی میں جو وہ ان دنوں حاصل کر رہا تھا۔ یہ تعلیم اسے اس آئینے کی طرح قبول کر رہی تھی جس میں صاف ہوتے ہوئے اسے اس آئینے میں زیادہ بہتر نظر آنے لگا تھا اور یہی چیز اس کے لیے پریشان کن تھی ایک بار صبح فجر کے بعد جب وہ مسجد سے آتے ہوئے کھیتوں کے پاس رک گئے تھے۔ گندم کی کٹائی کے بعد اس نے مکئی کاشت کی تھی۔ غلام محمد نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

''مولوی صاحب! جب آدمی اپنے راستے پر چلتا ہے تب بھی اسے ضمیر کی خلش بار بار کیوں محسوس ہوتی ہے۔''

''سے اللہ کا انعام سمجھو پتر۔۔۔!''

وہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھتا تھا تو انہیں بابا کے بجائے مولوی صاحب ہی کہا کرتا تھا۔

''آدمی جب معافی مانگ کر اور توبہ کر کے گناہوں سے پلٹ کر راست بازی کی زندگی گزارنے لگتا ہے اور شیطان اسے گناہوں کی طرف راغب کرنے میں ناکام رہتا ہے تو وہ اسے ضمیر کی خلش سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے اگر انسان ضمیر کی خلش سے آزاد ہو جائے تو اس کے بہک جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ جو لوگ ضمیر کی خلش کا شکار رہتے ہیں ماضی کی غلطیاں اور گناہ بار بار ان کے سامنے آتے ہیں۔ اس کے بھٹکنے کا خطرہ کم ہوتا ہے اپنی غلطیوں اور گناہوں کو یاد رکھنے والا انہیں کم ہی دہراتا ہے۔ اسے اللہ کا انعام سمجھو۔''

''یہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر ضمیر کی یہ خلش کس طرح سے ہوتی ہے۔''

''اس کا ایک ہی طریقہ ہے آدمی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرے۔ کسی کا دل دکھایا ہے تو اس کو راضی کرے۔ اس سے معافی طلب کرے حتیٰ کہ وہ اس سے راضی ہو جائے کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ اپنی جان پر ظلم کیا تو اللہ سے معافی چاہے۔''

''اور مولوی صاحب کسی نے قانون توڑا ہو تو۔۔۔؟''

''قانون کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اللہ کے قوانین اور دنیا کے قوانین مختلف ہوتے ہیں اللہ کا قانون بہت سادہ اور واضح ہے ہر غلطی کرنے والا کفارہ و قصاص ادا کرے تبھی وہ اس دنیا اور آخرت میں اس غلطی سے بری الذمہ ہو سکتا ہے۔''

''کیا اس صورت میں وہ آخرت کے مواخذے سے بچ جائے گا۔''

''یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اس صورت میں انسان کے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہوگا۔ دراصل میں اسے ان گناہوں سے ڈرنا چاہیے جو اس کی نظر میں چھوٹے ہوں۔ کیونکہ آخرت میں ان کی وجہ سے انسان کی زیادہ پکڑ ہوگی۔''

عبداللہ کی پیدائش تک غلام محمد نے قرآن ترجمے سے پڑھ لیا تھا جب وہ قرآن پڑھ رہا تھا تو خود بخود اس کی توجہ ان آیات کی طرف چلی جاتی تھی جو قصاص اور کفارے کے

بارے میں تھیں۔ وہ ان پر سوچتا اور غور کرتا تھا عبداللہ کی پیدائش پر وہ اتنا خوش اور مگن ہوا کہ اسے ماضی کی سوچوں سے چھٹکارا مل گیا مگر یہ عارضی تھا۔ رفتہ رفتہ اسے پرانی سوچیں پھر سے ستانے لگیں، ڈرانے لگیں۔ عبداللہ جب تک اس کے سامنے ہوتا وہ اس میں مگن رہا کرتا تھا مگر جب وہ اس سے دور ہوتا تو پرانی کیفیت لوٹ آتی۔ حتیٰ کہ نماز یا قرآن پڑھتے ہوئے بھی ان سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔

کبھی کبھی وہ اتنا وحشت زدہ ہو جاتا کہ اس کا دل چاہتا سب چھوڑ کر یہاں سے بھی کہیں دور چلا جائے مگر جاتا تو کہاں جاتا۔ اس زمین کے سوا اس کی امان کہاں تھی اس گھر کے سوا اور کہاں پناہ تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا کہ یہ سوچیں اس کا دماغ نہ الٹ دیں۔ اسے حیرت ہوتی تھی جب وہ مجرم تھا۔ لوگوں کو لوٹتا تھا انہیں تنگ کرتا تھا تب سکون سے تھا اور جب وہ توبہ کر کے جرائم سے پاک زندگی گزارنے لگا۔ اس کے پاس وہ سب تھا جس پر لوگ رشک کرتے تھے۔ محبت کرنے والی بیوی اور پیارا سا بیٹا تھا پھر بھی وہ اندر سے بے چین تھا کسی کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا وہ کسی بے جان مشین کی طرح کام کرتا تھا اور اپنی اس کیفیت پر حیران و پریشان رہا کرتا تھا۔

وہ قرآن میں جا بجا پڑھتا تھا کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی غم نہیں ہوتا اور وہ سوچتا تھا کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دکھ اور بے چینی میں مبتلا ہے۔ یعنی وہ اللہ کا دوست نہیں تھا اس نے مولوی عبدالصمد سے اس ارشاد ربانی کا مفہوم پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا۔

''کیا تم یہ پوچھ رہے ہو کہ اللہ کے دوستوں کو کوئی دکھ یا تکلیف نہیں ہوتی۔''

''بے شک اللہ کے نیک بندوں کو بھی دنیاوی لحاظ سے دکھ ملتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو زیادہ ہی ملتے ہیں اب اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انہیں زیادہ ہی پریشان اور دکھی ہونا چاہیے۔ لیکن تم نے دیکھا ہوگا اللہ کے یہ نیک بندے صابر و شاکر رہتے ہیں۔''

''ہاں میں نے انہیں شکوے کرتے کم ہی دیکھا ہے۔''

''اس ارشاد ربانی کا مفہوم یہی ہے۔ اللہ کے یہ نیک بندے اس کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تکلیفیں اور دکھ ان پر اثر انداز نہیں ہوتے

ہیں۔صرف دکھ ہی نہیں جب انہیں کوئی خوشی یا نعمت ملتی ہے تو یہ آپے سے باہر نہیں ہوتے اور اس نعمت یا خوشی پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔"

"شکریہ مولوی صاحب! یہ بات کئی دن سے مجھے پریشان کر رہی تھی۔اپنی بے صبری اور بے چینی پر مجھے لگتا ہے کہ میں اللہ کے اچھے بندوں میں سے نہیں ہوں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

مولوی عبدالصمد اچانک رنجیدہ ہو گئے تھے۔

"پتر! تیرے اوپر بوجھ ہے جب اس بوجھ کو اتار دے گا تو یہ بے چینی اور بے تابی خود ختم ہو جائے گی۔"

"کیسا بوجھ مولوی صاحب؟"

"یہ بھی تجھے خود سوچنا ہوگا اور یہ بات بھول جا کہ تو اللہ کے نیک بندوں میں سے نہیں ہے جو بھی خلوص سے اللہ کی طرف بڑھتا ہے اللہ اسے ضرور اپناتا ہے اسے سکون دیتا ہے لیکن شرط ہے انسان مکمل طور پر اس پر بھروسا کرے دنیا کو اہمیت دینا بند کر دے۔"

بات کسی قدر غلام محمد کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔اسکے بعد اس نے سارے معاملات اور ساری سوچیں اللہ پر چھوڑنا شروع کر دیں۔یہ حرکت وہ شعوری طور پر کرتا تھا اس طرح یہ رفتہ رفتہ اس کی لاشعوری عادت بننے لگی جب بھی کوئی سوچ اسے پریشانی کرتی تو وہ دعا مانگتا یا نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔زمین کے سارے معاملات اب وہی دیکھتا تھا۔اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے دو ملازم رکھ لیے تھے جن میں سے ایک جانوروں کو چرانے لے جاتا تھا اب اس کے پاس سو سے زائد بھیڑ بکریاں تھیں اور چار عدد دودھ دینے والی گائیں تھیں دودھ اس لڑکے کے حوالے کیا جاتا تھا اور وہ اپنا کمیشن رکھ کر باقی رقم مولوی صاحب کے حوالے کر دیا کرتا تھا زمین کی آمدنی سے دوسرے کام ہوتے تھے رقم آنے لگی تو مولوی صاحب نے مسجد پختہ کرانی شروع کر دی۔اس پر چھت ڈلوائی۔مدرسے اور نمازیوں کے لیے دریاں ڈلوائیں۔نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے اور خاص طور پر جمعے کے دن بہت ہجوم ہونے کی وجہ سے مسجد چھوٹی پڑنے لگی تھی۔ٹیلے پر اس کا احاطہ جہاں تک ممکن تھا بڑھا لیا گیا اور ناہموار حصوں کو بھر کر اس کا فرش سیمنٹ سے پکا کر لیا تھا۔

تیسرے سال غلام محمد نے زمین پر کپاس لگائی تھی۔اس کے تجربے نے بتایا کہ یہ زمین کپاس کی کاشت کے لیے موزوں ہے۔مولوی عبدالصمد نے زمین کے سارے معاملات اس پر چھوڑ دیے تھے اسلئے وہ اپنی مرضی سے کاشت کر رہا تھا۔زمین کے خاصے [illegible] پر سبزیاں لگائی تھیں کیونکہ اس علاقے میں سبزی باہر سے آتی تھی اور خاصی مہنگی پڑتی تھی۔غلام محمد کی کوشش سے سستی سبزی ملنے لگی۔گندم بھی دو مقامی طور پر بیچتا تھا کیونکہ نہ پاری اس سے لیکر یہ گندم اور مکئی مہنگے داموں عوام کو بیچا کرتے تھے۔رقم پاس آئی تو اس نے اچھے بیج کھاد اور کیڑے مار دوائیاں بھی لینا شروع کر دیں۔بلڈوزر اور ٹریکٹر کرائے پر لینے لگا۔کام کے دنوں میں چھ سات آدمی لگ جاتے تھے۔

غلام محمد کی وجہ سے ہارنگ نامی یہ چھوٹا سا گاؤں ترقی کرنے لگا۔یہاں فصل کے دنوں میں منڈی لگتی تھی۔رفتہ رفتہ اردگرد کے کاشت کار بھی اپنی فصل لیکر ادھر ہی آنے لگے۔سبزی کی مارکیٹ بھی بن گئی تھی۔علاقے کے باسی اس ترقی سے بے حد خوش تھے۔اضافی آمدنی مولوی صاحب مسجد پر لگا دیتے تھے انہوں نے مسجد میں ایک مہمان خانہ کھول لیا تھا۔اس علاقے میں جو بھی شخص آتا وہ مسجد میں ٹھہر سکتا تھا۔اسے تین وقت کا کھانا مولوی صاحب کے گھر سے جاتا تھا۔جب مسجد وسیع ہو گئی تو بچوں اور بچیوں کے لیے اسکول مدرسہ کھولا گیا اس میں علاقے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو رکھا گیا کہ وہ آنے والے بچوں اور بچیوں کو تعلیم دے۔چند مہینے کے اندر آنے والے بچوں اور بچیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔صبح فجر کے بعد سے ظہر تک اسکول کی تعلیم دی جاتی تھی۔ظہر کے بعد مولوی صاحب بچوں کو قرآن پاک پڑھاتے تھے اور انہیں اسلامی طرز زندگی کے آداب سکھاتے تھے۔ان کی تعلیم کی وجہ سے مسجد میں نماز کے لیے آنے والوں میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوئی تھی۔

ایک رات سخت سردی تھی۔مولوی صاحب رات بھر طبیعت کی خرابی کے باوجود صبح فجر پڑھنے کے لیے مسجد چلے گئے وہاں سردی لگی اور واپسی پر بخار تیز ہو گیا۔انہوں نے غلام محمد کو اپنی حکمت بھی سکھائی تھی اسے پودوں اور بوٹیوں کے خواص بتائے تھے۔اس نے ان دواؤں کی مدد سے مولوی صاحب کا علاج کیا تین دن بعد ان کا بخار اتر گیا تھا لیکن کمزوری بے انتہا ہو گئی تھی ذرا چلنے سے ہانپنے لگے تھے ایک مہینے تک مسجد بھی نہ جا سکے۔اس

کے بعد یہ کمزوری اور بخار انہیں چمٹ گیا تھا بار بار اس کا حملہ ہوتا تھا مولوی صاحب دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ غلام محمد نے کئی بار کوشش کی کہ انہیں ہسپتال لے جائے مگر وہ ہر بار انکار کر دیتے۔

''پتر! اگر اللہ نے موت مقدر کر دی ہے تو کیا اسے ڈاکٹر ٹال سکتا ہے؟''

''لیکن کوشش کرنے کا تو اللہ نے بھی حکم دیا ہے۔''

''تو دوائیاں تو کھا رہا ہوں اب اللہ نے شفا دینی ہے تو ان سے ہی دے دے گا۔''

صفیہ باپ کے لیے بے حد پریشان تھی۔ عبداللہ بڑا ہو گیا۔ چلنے پھرنے لگا۔ اس کے چکر میں وہ باپ کی طرف اتنی توجہ نہیں دے پاتی تھی۔ حالانکہ مولوی صاحب کے خیال میں وہ ان کا ہر ممکن خیال رکھتی تھی۔ عبداللہ میں مولوی صاحب کی جان تھی اس کے بغیر ان کا کھانا پینا حلق سے نہیں اترتا تھا۔ کبھی کبھی صفیہ شکوہ کرتی کہ ''وہ اب اس سے محبت نہیں کرتے اپنے نواسے کرنے لگے ہیں۔'' اس پر مولوی صاحب ہنستے۔

''او بھلیے! تیری اولاد ہے تو پیاری ہے ورنہ اسے کیوں پیار کرتا۔''

''بس آپ مجھ سے پیار نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے لاڈ سے سر باپ کے شانے سے لگا دیا اور شانے کی ہڈی محسوس کر کے تڑپ گئی تھی۔

''اس جگہ پہلے گوشت ہوتا تھا بابا! آپ کتنے کمزور ہو گئے ہیں روٹی بھی کم کھاتے ہیں۔''

''بس جتنی بھوک ہوتی ہے کھا لیتا ہوں۔''

صفیہ باپ کے لیے ان کے پسندیدہ کھانے بناتی تھی لیکن وہ معمولی سا کھا کر چھوڑ دیتے تھے۔ ساری گرمیوں میں وہ اس طرح کمزور ہوتے گئے خاص سور پر بارش کے دنوں میں اتنے لاغر ہو گئے کہ ان کے کپڑے بدن پر جھولنے لگے تھے۔ زیادہ وقت وہ چارپائی پر لیٹے عبداللہ سے کھیلتے اور اسے سکھاتے رہتے تھے۔ اسے بسم اللہ قرات سے کہنا سکھائی۔ اللہ کے نام اور دعائیں یاد کروائیں اور یہ بھی کونسی دعا کس موقع پر پڑھنی

چاہیے۔ اسے چھوٹی سورتیں یاد کرواتے تھے اور پھر اس سے سنتے تھے۔ گویا سکھانے کا عمل بستر پر بھی جاری تھا۔ کبھی کبھی غلام محمد کو ان کے ایمان اور روحانی مضبوطی پر رشک آتا تھا کوئی تکلیف یا پریشانی انہیں ان کے نصب العین سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔ اسے لگا وہ اللہ کے ان بندوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہ انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔

سردیوں کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی حالت بگڑنے لگی اکثر بخار ہوتا اور کھانسی اتنی شدت سے آتی کہ بے حال ہو جاتے تھے۔ ایک دن وہ کھانس رہے تھے کہ کھانسی کے ساتھ تازہ خون ان کے منہ سے نکل کر کپڑوں پر بکھر گیا۔ صفیہ جو پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی خون دیکھ کر چیخ اٹھی۔

''بابا یہ کیا ہے؟''

''کوئی بات نہیں میری بچی۔۔۔!'' وہ سانس پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

''شاید زور سے کھانسنے میں گلے میں خراش آئی ہے اس سے یہ خون نکلا ہے۔''

صفیہ رونے لگی۔

''خراش سے اتنا خون نہیں نکلتا بابا! آپ کو ہسپتال جانا چاہیے۔''

''اوہ نہیں میری دھیے! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں ہسپتال گیا تو وہ داخل کر لیں گے اور بھلا آدمی اپنے پیاروں سے دور مرے کیا فائدہ اس کا۔''

''بابا ایسی بات نہ کریں۔'' صفیہ رونے لگی۔

''نہ میری بچی! نہ رو۔۔۔ دیکھنا جانا سب نے ہے۔۔۔ اللہ جلدی بلا لے تو یہ بھی اس کا احسان ہے۔''

''بابا! میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اس بار وہ تڑپ کر رو دی تھی۔

''سب رہ جاتے ہیں دیکھ آج میں نے جانا ہے پھر تو بھی میرے پاس آ جائے گی۔''

مولوی صاحب اس کا سر تھپکتے رہے اور وہ روتی رہی۔ غلام محمد مسجد سے واپس آیا تو مولوی صاحب کے خون آلود کپڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟''

''دیکھیں بابا کے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ ان کو بہت کھانسی آ رہی تھی۔''

''بابا میں آپ کو ہسپتال لے جا رہا ہوں۔'' غلام محمد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''صفیہ بابا کے کپڑے نکالو جب تک میں تانگے والے کو کہہ کر آتا ہوں۔''

اس کے لہجے سے مولوی صاحب نے جان لیا کہ اب وہ ان کا انکار نہیں سنے گا اس لیے وہ چپ رہے البتہ دبی زبان میں اتنا کہا۔

''پتر تیرا ہسپتال لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''بابا! کچھ نہیں ہوتا میں نے سب اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ ہسپتال چالیس میل دور ہے میں تو ملتان تک ہو آیا ہوں۔''

غلام محمد جا کر تانگا لے آیا۔ اس علاقے میں بیل گاڑی کے علاوہ یہ ایک سواری میسر تھی اگر کسی کو کہیں جلدی جانا ہوتا تو وہ تانگا ہی کرتا تھا۔ غلام محمد نے عقبی حصے میں کمبل بچھا کر مولوی صاحب کو لٹا دیا۔ پکی سڑک کوئی بائیس میل کے فاصلے پر تھی۔ تانگے میں اتنی دور جاتے ہوئے صحت مند آدمی کے جوڑ الگ ہونے لگتے تھے مولوی صاحب تو پھر بھی بیمار تھے مگر مجبوری تھی تین گھنٹے کے طویل سفر کے بعد وہ پکی سڑک تک پہنچے۔ یہاں سے تانگے کو ہسپتال تک جانے میں مزید ایک گھنٹہ لگا تھا راستے میں ہی مولوی صاحب کو دوبارہ کھانسی کے دوران منہ سے خون آیا تھا۔

ڈسٹرکٹ ہسپتال میں رات کے وقت ایک ہی ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھا اس نے بے دلی سے معائنہ کیا اور بولا۔

''ٹی بی لگتی ہے آخری مرحلے میں ہے مہینے پہلے تک تو بالکل ٹھیک تھے۔''

''اوہ بھائی صاحب! ٹی بی کا مرض آدمی کو اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''اس کا کوئی تو علاج ہوگا۔'' غلام محمد نے عاجزی سے کہا۔

''ادھر داخل کرا دو صبح دیکھیں گے۔''

مولوی صاحب رات بھر اسے واپسی کے لیے اصرار کرتے رہے مگر غلام محمد نے کسی نہ کسی طرح انہیں بہلائے رکھا۔ اگلے روز ڈاکٹر نے مولوی صاحب کو دیکھا۔ ان کے

ایکسرے لیے اور ان سے تصدیق ہوگئی کہ انہیں چوتھے درجے کی ٹی بی تھی اور لاعلاج تھی لہٰذا دوائیں دے کر انہیں رخصت کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے پانچ چھ ہفتے دیے تھے گھر آ کر بھی غلام محمد نے صفیہ کو صحیح بات نہیں بتائی تھی۔ اس نے مولوی صاحب سے بھی چھپایا تھا مگر وہ ڈاکٹروں کے تاثرات سے بھانپ گئے تھے۔ اسی وجہ سے بار بار اصرار کرتے رہے۔

''پتر مجھے واپس لے چل، مجھے اپنی دھی اور نواسے کے سامنے مرنا ہے۔''

واپسی کے لیے غلام محمد نے ایمبولینس کرائی تھی اس وجہ سے مولوی صاحب بغیر دھچکے کھائے جلدی گھر آ گئے تھے۔ صفیہ بار بار اس سے پوچھتی رہی کہ بابا ٹھیک تو ہیں۔ غلام محمد نے اسے ٹالا۔

''پھیپھڑے پر معمولی سا زخم ہے ڈاکٹروں نے دوائی دی ہے بابا جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان کو مکمل آرام کی ضرورت ہے تو کھانے پینے کا خیال بھی رکھ۔''

''یہ کوئی کہنے کی بات ہے میں بابا کی خدمت نہیں کروں گی تو کس کی کروں گی۔''

مولوی صاحب ڈاکٹروں کے اندازے سے کم تھے صرف تین ہفتے جیے اور اس دوران میں وہ زیادہ بستر پر دراز رہے۔ اس حالت میں بھی نماز، ذکر اور تلاوت قرآن پاک کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ غلام محمد اور صفیہ نے دل و جان سے ان کی خدمت کی تھی۔ مولوی صاحب ان سے بے حد خوش تھے۔ دعائیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ جس رات ان کا انتقال ہوا غلام محمد ان کے پاس تھا۔ صفیہ بہت تھکی ہوئی تھی اسلئے غلام محمد نے اسے زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا تھا۔ شدت کی سردی تھی اور اس سے مولوی صاحب کو بچانے کو بڑی انگیٹھیاں لگا کر رکھی تھی۔ دھوئیں سے مولوی صاحب کو تکلیف ہوئی تھی۔ اس لیے غلام محمد نے اچھی لکڑی کا بنا ہوا کوئلہ لیا تھا مولوی صاحب جاگ رہے تھے۔

''غلام محمد پتر!'' انہوں نے دھیمی آواز میں کہا تو وہ تیزی سے ان کے پاس آیا تھا۔

''جی بابا۔۔۔!''

''پتر! میں تجھ سے خوش ہوں۔''

''یہ میری خوش نصیبی ہے۔''

"لیکن میں پتر خود سے خوش نہیں ہوں۔"

"کیوں بابا؟ آپ نے مثالی زندگی گزاری ہے۔"

انہوں نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "اللہ مجھے معاف کرے میں بھی انسان ہوں۔ مجھ میں بھی کمزوریاں آجاتی ہیں میں تم لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ ایک عالم ایک آدمی کو دین کا کوئی بھی حکم بلاتر دو بتا دیتا ہے مگر جب سامنے اس کا کوئی پیارا ہو تو وہ کمزور ہو جاتا ہے حق کو حیلے بہانوں سے چھپانے لگتا ہے۔ خاموشی کی آڑ لیتا ہے۔"

"بابا آپ نے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔" غلام محمد نے یقین سے کہا۔

"پتر! چھپایا نہیں پر کھل کر بتایا بھی نہیں۔" مولوی صاحب گہری سانس لے کر بولے۔

"یہ میری کوتاہی تھی اور کمزوری تھی کہ مجھ پر داماد اور بیٹی کی محبت غالب ہو گئی تھی اب میں مرنے سے پہلے اپنا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ پتر! تو نے جرم کیے، ڈاکے ڈالے، قتل کیا اور بھی لوگوں کو دکھ دیئے جب تک تو ان کا قصاص ادا نہیں کرے گا اللہ کے نیک بندوں میں شامل نہیں ہوگا۔ یہ میری رائے ہے لیکن حکم وہی ہے۔

"اے ایمان والو تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔"

غلام محمد لرز گیا تھا۔ مولوی صاحب کے الفاظ جیسے اس کے اندر اتر گئے تھے مولوی صاحب چپ ہو گئے تھے اسے لگ رہا تھا کہ ساری کائنات چپ ہے بس رب العالمین ارشاد فرما رہا ہے۔

"اے ایمان والو تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔"

اور وہ اس سے گریز کرتا رہا۔ اسے پتا نہیں چلا کب مولوی صاحب کے ہونٹ کلمے کے لیے ہلے اور وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔

وہ سست قدموں سے چلتا مکان تک آیا تھا۔ مکان سے چار سالہ عبداللہ بھاگتا ہوا نکلا تھا اور اس سے لپٹ گیا تھا۔

"بابا! آج میں نے پورا سبق سنا دیا۔" وہ جوش سے چلایا۔

"میری جان!" غلام محمد نے اسے گود میں لیا۔

"اچھا یہ بتا کہ سورۃ رحمٰن سنائی تھی آج؟"

"جی بابا! مجھے پوری یاد ہو گئی ہے۔ سناؤں آپ کو۔"

"ہاں بابا کی جان! سناؤ۔"

اس نے عبداللہ کو گود سے اتار دیا اس نے سینے پر ہاتھ باندھے اور قرات سے سورۃ رحمٰن سنانے لگا اور اس کا ذہن خود بخود اس کا ترجمہ کرنے لگا اور اس کی سوچیں بار بار ایک ہی جملہ دہرانے لگیں۔

"اور تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

عبداللہ سورہ رحمٰن سنا کر اچھلتا کودتا کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ وہ اسے دیکھتا رہا تھا اسکے ذہن میں عجیب سا خیال آیا اگر پولیس اسے گرفتار کر لے اور اسے پھانسی ہو جائے تو اس کی بیوی اور بچہ بھی اس کے بغیر زندگی گزار لیں گے۔ جیسے فتح علی کے بیوی بچے اس کے بغیر رہ رہے تھے۔ اس کے ذہن میں فتح علی کی بیوی کے الفاظ گونجنے لگے اور وہ جھرجھری لے کر رہ گیا تھا۔ اسے مولوی صاحب کے آخری الفاظ یاد آنے لگے۔

"بے شک ایمان والوں کے لیے قصاص میں ہی زندگی ہے۔"

اس نے زیر لب کہا۔ صفیہ اندر سے دیکھ رہی تھی وہ کتنی دیر سے ساکت کھڑا تھا صفیہ محسوس کر رہی تھی وہ بدل رہا تھا۔ بابا کے بعد اس میں چپ کی تبدیلی آئی تھی وہ کم سخن ہو گیا تھا اندر سے بدل رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بات اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہی ہے۔ اس نے کئی بار کریدا غلام محمد نے ہر بار اسے ٹال دیا تھا۔ اس کے معمولات ویسے ہی تھے گھر اور زمینوں کی ساری ذمہ داری نبھاتا تھا۔ فجر اور عشا کی نماز وہی پڑھاتا تھا پھر سارا دن زمین اور جاڑے میں مصروف رہتا تھا رات کے وقت وہ پڑھتا تھا مطالعے کے لیے مولوی صاحب کی کتابیں تھیں۔ اسکے علاوہ وہ نزدیکی قصبے تک جا کر مزید کتب لے آتا تھا مگر گزشتہ مہینے بھر سے اس نے مطالعہ بھی چھوڑ دیا تھا فارغ اوقات میں سوچوں میں گم نظر آتا تھا۔ صفیہ نے کئی بار گھر سے دیکھا کھیتوں میں کام کرتے کرتے وہ اسی طرح ساکت ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگا تھا جیسے وہ اس وقت خلاؤں میں نجانے کیا دیکھ رہا تھا۔

"سنیے۔۔۔" اس نے دروازے کے پاس آ کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ چونکا اور اندر آ گیا۔

صفیہ نے صحن میں مونڈھے رکھ دیئے تھے۔ غلام محمد بیٹھا تو صفیہ اس کے لیے نمکین لسی لے آئی تھی۔ آج گرمی کی شدت زیادہ تھی۔ سورج ڈھل گیا تھا مگر گرمی کی شدت اور حبس میں خاص کمی نہیں آئی تھی۔

"شاید رات کو بارش ہو جائے۔"

"سنیں۔۔۔ کیا میں آپ کی بیوی نہیں ہوں۔" غلام محمد چونکا تھا۔

"ہاں ہو۔"

"تب آپ مجھ سے اپنی ہر بات کر سکتے ہیں اگر آپ میری دل آزاری یا تکلیف کے خیال سے بھی مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں تو مت چھپائیں۔ آپ مجھ سے ہر بات کر سکتے ہیں۔"

"ہر بات؟" غلام محمد نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہر بات۔" غلام محمد نے گہری سانس لی۔

"صفیہ! اگر کوئی شخص کسی گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہو اور اس کی کچھ ذمہ داریاں ہوں جو اسے یہ کفارہ ادا کرنے سے روکتی ہوں تو وہ کیا کرے۔ اپنی آخرت برباد کر لے یا اپنے پیاروں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے۔"

"آپ۔۔۔ کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" صفیہ کی آواز لرزنے لگی تھی۔

غلام محمد نے تھکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صفیہ! تم سے کچھ چھپا نہیں ہے؟ تم جانتی ہو میں مجرم ہوں۔"

"آپ مجرم تھے۔" صفیہ تڑپ کر بولی۔

"آپ شریف آدمی ہیں اچھے انسان ہیں۔"

"میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ میں مجرم تھا لیکن صفیہ میں نے کفارہ ادا نہیں کیا۔ میں نے قصاص نہیں دیا تو میں کس منہ سے خود کو پاک صاف کہہ سکتا ہوں۔ بے شک لوگ مجھے

اچھا سمجھتے ہیں مگر میرا اللہ تو جانتا ہے کہ میں گناہ گار ہوں اور میں نے اب تک اپنے کیے کی سزا نہیں لی۔ مجھ پر لوگوں کے قرض باقی ہیں۔ صفیہ میں ان قرضوں کی ادائیگی کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" صفیہ بری طرح لرزنے لگی تھی۔

غلام محمد نے محبت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ جس سے اسے ملا ہی ملا تھا اسے محبت ملی، اولاد ملی، گھر ملا، مولوی صاحب جیسا شفیق انسان ملا، عزت ملی اور ایک آزاد حیثیت ملی۔ جواب میں صفیہ نے کچھ نہیں مانگا۔ آج وہ پھر اسے مانگنے جا رہا تھا۔

"صفیہ! میں نے تمہارے پاس آنے سے پہلے جو کیا اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ توبہ کر چکے ہیں۔ اللہ آپ کو معاف کرے گا۔" صفیہ رونے والی ہو رہی تھی۔

"اللہ معاف کرنے والا ہے لیکن صفیہ انسان نے اس دنیا میں جو بویا ہوتا ہے اسے کاٹنا پڑتا ہے۔ تب ہی وہ روز محشر اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل ہوگا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس روز بے شمار لوگ اللہ کے حضور میرے خلاف فریاد کر رہے ہوں؟"

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔"

"صفیہ! مجھے یقین ہے اللہ بابا جیسے انسان اور تم جیسی وفادار عورت کے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے۔ ایک میں ہی گناہگار ہوں اس ہمیشہ رہنے والی زندگی میں شاید تمہارے ساتھ نہ ہوں۔"

"اللہ نہ کرے۔" صفیہ کے منہ سے نکلا تھا۔

"ذرا سوچو۔۔۔ اس چند روزہ دنیا میں ہمارا جدا ہونے کے خیال سے دل پھٹنے لگتا ہے وہاں دائمی جدائی ہوگی کیا تم وہ برداشت کر لو گی۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" صفیہ منہ چھپا کر سسکنے لگی تھی۔

"صفیہ! میں اب تک ہمت کرتا رہا ہوں میں جس وقت یہاں آیا تھا تب سے تم سے بچھڑنے کا خوف مجھے ستا رہا تھا میں سمجھتا تھا کہ شاید میں پولیس سے خوف زدہ ہوں جو

کسی وقت آ کر مجھے پکڑ لے گی لیکن میں پولیس سے نہیں اپنے ضمیر سے خوفزدہ تھا مجھے اندر سے احساس تھا کہ یہ کبھی نہ کبھی مجھے مجبور کرے گا کہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں اور اب صفیہ میں اپنے ضمیر کے آگے ہار رہا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔" صفیہ کے منہ سے نکلا تھا۔غلام محمد مرجھا گیا تھا۔

"صفیہ! مجھے تمہاری ضرورت ہے اتنی ضرورت پہلے کبھی نہیں تھی۔صفیہ میرا ساتھ دو۔"

"کیا آپ نے سوچا ہے کہ آپ کے بغیر میں اور عبداللہ کیسے رہیں گے؟"

غلام محمد مایوسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"صفیہ! اس عورت کے بارے میں سوچو جو شوہر کے بغیر اپنے دو بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔اس کا شوہر میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

غلام محمد باہر کی طرف بڑھ گیا۔صفیہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر دھندلائی نظروں سے اسے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میرے اللہ میں کیسے اپنا دل اتنا بڑا کروں میرے مالک مجھے حوصلہ دے میرے مالک مجھے صبر دے۔"

"امی۔۔۔امی۔۔۔! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اسے پاس سے عبداللہ کی آواز آئی تھی۔اس نے بے اختیار اسے اپنی گود میں کھینچ لیا۔عبداللہ ماں کو یوں روتے دیکھ کر سہم گیا تھا اور پھر خود بھی رونے لگا تھا۔چار دیواری کے باہر کھڑے غلام محمد نے ان کے رونے کے بوجھ کو دل پر محسوس کیا تھا اور مسجد کی طرف چل دیا تھا۔مغرب کا وقت قریب تھا۔مغرب اس نے پڑھائی اور پھر دعا مانگ کر وہیں بیٹھ گیا۔لوگ نماز پڑھ کر جا چکے تھے البتہ ایک کونے میں ایک شخص گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اس نے ٹوپی سے پہچانا۔

"سلامت کیا ہوا؟" اس نے بلند آواز سے پکارا۔

"تو کب واپس آیا؟"

سلامت نے سر اٹھایا۔"آج ہی آیا ہوں۔"

غلام محمد اس کے پاس آ بیٹھا۔"ڈاکٹروں نے تیرے بیٹے کے بارے میں کیا کہا

ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے سر ہلایا۔"وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تب ایسی صورت بنانے کی کیا بات ہے؟"

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے غلام محمد کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہیں میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں؟"

وہ رونے لگا اور غلام محمد گم صم ہو گیا تھا اس کے آنے سے پہلے سلامت موذن اور مولوی صاحب نائب کے فرائض انجام دے رہا تھا پھر اس نے خود ہی غلام محمد کو اپنی جگہ دے دی۔دونوں گہرے دوست بن گئے تھے۔سلامت کی شادی کے سات سال بعد اولاد ہوئی تھی بیٹا۔۔۔لیکن وہ بچپن سے کمزور اور لاغر تھا۔چار سال کا تھا اور مشکل سے دو سال کا لگتا تھا غلام محمد کے مشورے سے اس نے ملتان جا کر بڑے ہسپتال میں بچے کو دکھایا تھا تو انکشاف ہوا کہ اسے خون کی بیماری ہے سلامت غریب آدمی تھا اس کے لیے آنا جانا ہی دشوار تھا دوسری مرتبہ وہ غلام محمد کے اصرار پر گیا۔غلام محمد نے اسے پیسے دیے تھے تاکہ بچے کے علاج کے بارے میں معلوم کرے اور اب سلامت اسے بتا رہا تھا کہ اس کے بچے کی جان بچ سکتی ہے بشرطیکہ ایک لاکھ روپے مل جائیں سلامت کچی جھونپڑی میں رہنے والا شخص تھا۔جو منڈی میں کام کر کے اتنے پیسے کماتا تھا کہ اپنا گھر چلا سکے۔اس لیے بیٹے کو ہسپتال تک لے جانا محال تھا۔بھلا ایک لاکھ روپے کہاں سے لاتا۔

"سلامت فکر نہ کرو۔۔۔اللہ کہیں نہ کہیں سے کر دے گا۔" غلام محمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"کہاں سے ہو گا؟ میرا لاڈا مر جائے گا۔"

"سلامت! مرد بن۔۔۔حوصلہ رکھ اور خدا پر بھروسہ رکھ۔"

"میرا لاڈا مر گیا تو ہم دونوں میاں بیوی مر جائیں گے وہ ہماری زندگی ہے۔"

غلام محمد اچھی طرح جانتا تھا کہ منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوئے اس لڑکے میں ماں باپ کی جان تھی۔اس کی ذرا سی سانس اکھڑتی تو ماں باپ کی سانس رک جاتی تھی اسے کچھ ہو گیا تو یہ جیتے جی مر جائیں گے۔"کیا لاڈا مر جائے گا؟" اس نے خود سے پوچھا اور

پھر نفی میں جواب دیا۔

''لاڈا کو زندہ رہنا چاہیے۔''

''سلامت! فکر نہ کرو تمہارا لاڈا زندہ رہے گا۔''

سلامت نے مایوسی کی نظروں سے اسے دیکھا تھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ غلام محمد عشا تک مسجد میں رہا اور گھر واپس آ کر اس نے صفیہ سے کہا۔

''میرے کپڑے نکال دینا مجھے کل صبح شہر جانا ہے۔''

صفیہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

''شہر۔۔۔''

''فکر نہ کرو مجھے کچھ کام ہے ایک دن میں لوٹ آؤں گا۔''

''جی اچھا۔''

صفیہ نے مردے لہجے میں کہا تھا اگلے روز غلام محمد فجر پڑھتے ہی روانہ ہو گیا تھا صفیہ وسوسوں اور خدشات کے ساتھ رخصت کرنے زمین کی جھاڑیوں کی حد تک گئی تھی۔

''آپ جلدی آیئے گا ورنہ میرا دل پریشان رہے گا۔''

غلام محمد اس کے خدشات سمجھ رہا تھا۔

''صفیہ! ایک بات یاد رکھنا میں کبھی بھی کوئی کام تمہاری لاعلمی اور اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔''

''میں۔۔۔ میں جانتی ہوں لیکن عورت ہوں ناں ڈر جاتی ہوں۔''

''میں جلدی آؤں گا۔ انشاء اللہ۔''

غلام محمد نے تانگے کی طرف قدم بڑھا دیئے جو تاریک میدان میں کھڑا تھا غلام محمد تانگے میں بیٹھا وہ حرکت میں آیا جب تک تانگہ نظر آتا رہا صفیہ وہیں کھڑی رہی پھر بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آئی۔ عبداللہ جو باپ کے ساتھ نماز پڑھ کر آیا تھا۔ اب چارپائی پر سو رہا تھا۔ صفیہ نے اس پر چادر ڈال دی اور اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگی خود اس نے شوہر کے ساتھ چند لقمے کھا لیے تھے اور اسے اب بھوک بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد عبداللہ کو اٹھایا منہ ہاتھ دھلا کر اسے ناشتہ کرا کے مدرسے کے لیے روانہ کیا۔ وہ اسکول میں پہلی

جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ قرآن ناظرہ ختم کر کے اب حفظ کر رہا تھا۔

صفیہ سارا دن کاموں میں الجھی رہی لیکن اس کا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی غلام محمد کی فکر سے آزاد نہیں ہوا تھا وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی کبھی کبھی اس پر اتنا ٹوٹ کر پیار آتا کہ خود پر قابو پانا دشوار ہو جاتا وہ شوہر ہی نہیں اس کا محبوب بھی تھا اور جب اس کی باتیں یاد آتیں تو وہ لرز جاتی۔ رونے لگتی۔ دوسرے دن اس نے پوری بے تابی کے ساتھ غلام محمد کا انتظار کیا صبح ڈھلی سورج سر پر آیا لیکن وہ شدت کی گرمی میں دروازے کے چکر لگاتی رہی اس کی پرامید نظریں دور تک جاتیں اور کسی کو نہ پا کر لوٹ آتی تھیں ان ہی چکروں میں دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ غلام محمد پر اعتماد کے باوجود اس کا دل ہولنے لگا تھا رات جب عبداللہ کو لے کر برآمدے میں لیٹی تب بھی ہر آہٹ پر چونک جاتی۔ دن بھر کی تھکن کے باوجود اسی طرح چونکتی رہی۔ صبح ہوئی تو اس کا سر بوجھل تھا۔ فجر کے لیے عبداللہ کو اٹھا کر مسجد تک چھوڑنے گئی اگرچہ اسے اکیلے اندھیرے میں کھڑے ہونے سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن عبداللہ اکیلے واپس آئے یہ اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد نمازی نکلنے شروع ہوئے۔ عبداللہ کے ساتھ ایک لمبا شخص آیا کہ صفیہ کی ساری جان کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی تھی۔ وہ غلام محمد تھا۔ اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس لمحے اسے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ وہ ان دو رشتوں سے کتنی شدت سے محبت کرتی تھی۔ ان کے بغیر ساری کائنات اس کے لیے بے معنی تھی عبداللہ جو کل سے باپ کے بغیر اداس تھا اب کھلکھلا رہا تھا۔ آتے ہی ماں سے لپٹ گیا۔

''بابا مسجد میں تھے۔ یہ رات کو آ گئے تھے۔''

''تم گھر کیوں نہیں آئے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''فجر میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا اس لیے مسجد چلا گیا تھا۔''

''اور عبداللہ۔۔۔''

''اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ یہ مسجد ضرور آئے گا۔ یہ مولوی عبدالصمد کا نواسہ ہے جسے مسجد سے عشق تھا۔''

''ایک آواز میں اٹھ جاتا ہے۔'' صفیہ فخر سے بولی۔

''میں اس سے بھی پہلے اٹھ جاتا ہوں۔'' عبداللہ نے جلدی سے بتایا اور وہ تینوں ہنستے ہوئے گھر کی طرف چل پڑے۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ کہاں گئے تھے؟'' گھر آتے ہوئے صفیہ نے پوچھا۔

''کام ہوگیا۔ مغفرت سے ہوا؟''

''ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے جس مقصد کے لیے گیا تھا وہ پورا ہوگیا۔ راستے میں بھی کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہوئی۔ کھانا پینا بھی اچھا مل گیا تھا۔''

''میں آپ کے لیے آلو بھرے پراٹھے بناتی ہوں۔''

صفیہ نے چولہا روشن کرتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھا کر سوئیے گا۔''

''کھانا کھا کر پہلے سلامت کے بچے کو دیکھ آؤں۔ آج وہ مسجد نہیں آیا۔ شاید اس کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اللہ اسے شفا دے۔''

''وہ ٹھیک ہوسکتا ہے۔ لیکن علاج بہت مہنگا ہے ایک لاکھ روپے مانگ رہے ہیں ڈاکٹر۔''

''ایک لاکھ۔'' صفیہ دنگ رہ گئی۔

''وہ ایک لاکھ کہاں سے لائے اس کے پاس تو ایک ہزار بھی نہیں ہیں۔''

''بس اسی سلسلے میں شہر گیا تھا۔''

''اچھا۔۔۔ تو ایک لاکھ روپے کا انتظام ہوگیا۔'' صفیہ نے خوشی سے کہا تھا۔

غلام محمد نے سر ہلایا۔ ''ہاں ایک لاکھ روپیہ مل سکتا ہے۔''

''کیسے۔۔۔ کون دے گا؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ صفیہ اس کے لیے گرم گرم پراٹھے اتارتی رہی اور وہ ناشتہ کرتا رہا۔ ناشتہ کر کے اس نے لسی کا ایک گلاس پیا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔''

''آپ نے بتایا نہیں؟''

''آ کر بتاؤں گا۔'' غلام محمد نے باہر جاتے ہوئے کہا مگر وہ خاصی دیر سے آیا اور اتنا تھکا ہوا تھا کہ اندر لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ ظہر کے وقت وہ اٹھ کر مسجد گیا وہاں سے عصر کے بعد واپس آیا تھا۔ صفیہ نے پانی چھڑک کر صحن میں چارپائی بچھ دی تھی۔ غلام محمد ایک بار پھر لیٹ کر سو گیا تھا۔ اس کی تھکن ابھی اتری نہیں تھی۔ مغرب کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھلی اور مسجد سے وہ عشا کے بعد آیا تھا۔ عبداللہ آتے ہی سو گیا وہ کھانا مسجد جانے سے پہلے کھا لیتا تھا۔ آج گرمی زیادہ تھی اس لیے وہ چارپائیاں صحن میں لے آئے۔ غلام محمد اپنی غیر حاضری کی رپورٹ لیتا رہا۔ اس کے بعد صفیہ نے پوچھ لیا۔

''وہ آپ کہہ رہے تھے کہ سلامت بھائی کے بچے کے لیے ایک لاکھ روپے کا انتظام ہوگیا ہے۔''

غلام محمد نے سر ہلایا۔

''ہاں لیکن وہ ایک لاکھ روپے ایسے نہیں ملیں گے۔ ہمیں قربانی دینی پڑے گی۔''

''آپ زمین کی بات کر رہے ہیں۔ تو میری رضا آپ کی رضا ہے۔'' صفیہ نے بنا ہچکچاہٹ کہا۔

''آپ کہیں تو ابھی کاغذات لا دوں۔''

''نہیں بات زمین کی نہیں ہے۔''

غلام محمد نے اپنی وفا شعار، ایثار پسند شریک حیات کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا واحد اثاثہ پیش کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

''پھر کیا بات ہے آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟'' صفیہ کے لہجے میں بیتابی تھی۔

''شاید میں نے تمہیں بتایا تھا۔ میری گرفتاری پر میاں فتح علی کے خاندان نے پچاس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا تھا اب وہ انعام ایک لاکھ کر دیا گیا ہے۔''

''یہ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' صفیہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا جیسے پسلیوں سے پنجر توڑ کر باہر آ جائے گا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔؟''

''صفیہ! سوچو۔۔۔ میں اپنی آخرت کے لیے کچھ سامان کر لوں گا ایک گھر کا بھلا

ہو جائے گا اگلے گھر ایک ہی چراغ ہے جو پھر سے جل اٹھے گا۔"

"آپ کو میرا اور عبداللہ کا خیال نہیں۔ آپ کے بعد ہمارا کیا بنے گا؟" صفیہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مولوی عبدالصمد کی بیٹی کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے جو ہر معاملے میں اللہ پر بھروسہ کرتا تھا۔"

"میں بابا جیسی نہیں ہوں کمزور ہوں اور عورت ہوں۔"

"چاہے مرد ہو یا عورت اصل سہارا اللہ کا ہوتا ہے۔ کمزور دونوں ہوتے ہیں۔"

"نہیں میں اور عبداللہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

صفیہ اس کے بازو سے چپٹ گئی تھی اس کے آنسو آستین کو بھگو رہے تھے۔

"صفیہ یہ سوچ کل مجھے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے میں مر جاتا ہوں۔ کوئی بیماری مجھے لے جاتی ہے تب بھی تو اور عبداللہ میرے بغیر رہیں گے۔"

"اللہ کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔"

"صفیہ! جو جان کبھی بھی جا سکتی ہے انسان اسے ایسے مقصد کے لیے کیوں نہ استعمال کرے کہ آخرت میں اسے صلہ ملے یہاں میں کب تک رہوں گا۔ تین برس چالیس برس۔ جانا تو پھر بھی ہے۔"

صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کے شانے سے لگی روتی رہی۔ فضا میں جس کی کیفیت بڑھ رہی تھی آسمان پر بتدریج بادل جمع ہو رہے تھے نجانے کب ہلکی بارش شروع ہو گئی وہ دونوں چپ بیٹھے اس میں بھیگتے رہے آخر غلام محمد نے اسے اٹھایا۔

"اندر چلو۔۔۔ کب تک بارش میں بھیگتی رہو گی۔"

وہ چارپائیاں اندر لایا برآمدے میں پھوار نہیں آ رہی تھی۔ بارش کا چھینٹا پڑتے ہی خشک مٹی سے سوندھی سی خوشبو اٹھی تھی۔ گرمی کم ہو گئی تھی لیکن ان کی بے کلی کم نہیں ہوئی تھی دونوں میاں بیوی صبح تک جاگتے رہے پھر غلام محمد فجر کی اذان کے لیے اٹھ کر گیا۔ صفیہ چپ تھی۔ اس نے دوبارہ شوہر سے بات نہیں کی تھی کچھ دیر بعد اس نے عبداللہ کو اٹھایا۔

"نماز کے لیے اٹھ جا، تیرا بابا آنے والا ہے۔"

آنکھیں ملتے ہوئے عبداللہ نے چھلانگ ماری اور صحن میں رکھی ٹینکی پر جا کر وضو کرنے لگا غلام محمد اذان دینے کے بعد اسے آ کر لے جاتا تھا مگر اس روز خاصی دیر گزر گئی تھی وہ نہیں آیا۔

"امی بابا نہیں آیا نماز ہونے والی ہے۔"

"پتا نہیں کیوں نہیں آیا تیرا بابا، چل میں تجھے چھوڑ آتی ہوں۔"

"نہیں امی میں چلا جاؤں گا۔" عبداللہ نے کہا۔

"تو اکیلے کیسے جائے گا؟" صفیہ بے چین ہو گئی تھی۔

"امی اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اکیلے جا سکتا ہوں۔ بابا کے بغیر بھی۔"

"بابا کے بغیر۔" صفیہ نے دہرایا۔

"نہیں بابا کے بغیر نہیں۔"

"امی پھر میری نماز رہ جائے گی۔"

"تو چل، میں تجھے چھوڑ کر آتی ہوں۔ لیکن بابا کے بغیر نہیں۔" صفیہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"چل میرے ساتھ۔ آئندہ یہ مت کہنا کہ بابا کے بغیر۔۔۔"

وہ پورے راستے میں یہی جملہ دہراتی گئی تھی۔ عبداللہ اس کی کیفیت سے ڈر گیا تھا جیسے ہی مسجد نزدیک آئی وہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ جماعت کھڑی ہو رہی تھی۔ نماز پڑھ کر وہ باپ کے ساتھ آیا تو صفیہ چارپائی پر ساکت بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر غلام محمد کا دل کٹنے لگا اس نے اس قدر پیار کرنے والی عورت کو کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔ عبداللہ سیدھا اپنے بستر کی طرف گیا۔ اسکول جانے سے پہلے وہ لازماً سوتا تھا۔ اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اگر کسی دن وہ صبح اسکول جانے سے پہلے نہ سوتا تو اس کا سارا دن بے کل بے کل سا رہتا تھا۔

"صفیہ۔۔۔" غلام محمد نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مجھ سے ناراض ہو؟" وہ چونکی اس نے شوہر کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"نہیں۔ آپ عبداللہ کو لیتے کیوں نہیں آئے؟"

"میں دیکھنا چاہتا تھا وہ اکیلے آ سکتا ہے یا نہیں۔"

''کیا میں اسے اکیلے جانے دیتی؟''

''صفیہ دنیا میں ایسے بچے بھی ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہیں وہ ان کے بغیر ہی رہتے ہیں۔''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' صفیہ کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

''ہمارے بچے کے سر پر اس کے ماں باپ کا سایہ ہے۔''

''انسان پر اصل میں اللہ کا سایہ ہونا چاہیے۔ ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار صرف وسیلہ ہیں۔''

''اگر انسان کے پاس یہ وسیلے نہ ہوں تو اس کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ بن باپ یا بن ماں کے کس طرح پلتے ہیں کیا آپ نہیں جانتے؟''

''ایسے کتنے ہی کامیاب انسان ہیں جو بچپن میں باپ یا ماں یا پھر دونوں سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بنائی اور صفیہ بحث اسکی نہیں ہے کہ ماں باپ کے ساتھ رہنے والے بچے اچھے پلتے ہیں یا نہیں۔ بات کفارے کی ہے اگر میں نے اس دنیا میں کفارہ ادا نہ کیا تو اگلے جہان میں ادا کرنا پڑیگا۔''

صفیہ نے پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کوئی اور راستہ تو ہوگا کہ آپ کفارہ ادا کریں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''صفیہ ایک آدھ شخص کا معاملہ نہیں ہے بے شمار لوگوں کا معاملہ ہے میں نے کس کس کے ساتھ ظلم کیا ہے مجھے خود بھی صحیح سے یاد نہیں ہے۔ کیا میں کسی طرح ان سب سے معافی حاصل کر سکتا ہوں اور مجھے کون معاف کریگا۔ جن کا دل دکھایا ہے وہ مجھے سزا پاتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں بچ گیا اور۔۔۔ اور میں قانون سے چھپ کر اس دور دراز جگہ آ بیٹھا ہوں جہاں میرے جرائم سے کوئی واقف نہیں۔ مجھ تک پولیس کے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے لیکن کیا خالق کائنات کے حضور بھی انصاف کی دہائی نہیں ہوگی۔ کیا میں کہیں اس سے چھپ سکوں گا۔ کیا مجھے اس کے حضور پیش نہیں ہونا پڑیگا اور کیا مجھے گناہوں کی پاداش میں ان مظلوموں کی فریاد پر جہنم میں نہیں جھونک دیا جائیگا؟'' غلام محمد کا بدن لرزنے لگا تھا۔

''بولو صفیہ! میں اپنے گناہوں کی سزا اس دنیا میں پاؤں یا روز حشر کا انتظار کروں جن لوگوں کا مجھ پر قرض ہے ان کا سامنا ابھی کروں یا اس کے اس دن کا انتظار کروں جب نہ کوئی سفارش کام آئے گی اور نہ کوئی حمایت کرنے والا ہوگا۔''

صفیہ کو اپنا دل پگھلتا ہوا لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے اس نے خود کو گنگ اور لاجواب پایا تھا۔

''اس سوال کا جواب کیسے دوں میں بیوی ہوں، ماں ہوں۔ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''صفیہ! میں جانتا ہوں مجھے یہ فیصلہ کرنے میں برسوں لگ گئے تھے خدا نے مجھے اب تک زندگی بخشی ورنہ میں نے تاخیر کر دی ہے۔ اب تمہارے پاس وقت کم ہے اگر تم نے دیر کر دی تو سلامت کا بچہ علاج کے بغیر مر جائے گا۔''

''اللہ کے لیے مجھ پر اس قدر بوجھ مت ڈالیں۔'' اس نے التجا کی۔

صفیہ نے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتہ بنا کر اس نے عبداللہ کو جگایا اسے ناشتہ کرا کے سکول روانہ کیا پھر غلام محمد کے لیے ناشتہ نکالا۔

''تم کیوں نہیں کھا رہی؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تب یہ بھی لے جاؤ۔'' اس نے ٹرے آگے سے کھسکا دیا۔

''مجھے مجبور نہ کریں۔''

اس نے التجا کی مگر جب غلام محمد نے ناشتہ شروع نہیں کیا تو وہ بھی اس کے سامنے آ بیٹھی۔ انہوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا تھا دونوں اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔

ان کے کھیتوں میں کام کرنے والا ایک لڑکا اکرم تھا دو سال پہلے وہ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں شامل ہوا تھا اور چند مہینے پہلے بھاگ کر گھر آ گیا تھا۔ گھر اور گاؤں میں اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے فوج سے نکال دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات زیادہ دنوں تک چھپی نہ رہی تھی کہ فوج سے بھاگ کر آیا ہے۔ غلام محمد نے اس سے پوچھا تو اس نے اقرار کر لیا۔

''وہ جی! مجھے سیاچن بھیجنا چاہتے تھے۔ ادھر سے بندہ صحیح سلامت کم ہی آتا

ہے۔"

غلام محمد نے اس کو ملامت کی۔

"اوئے پاگل! لوگ تو ادھر جانے کی آرزو کرتے ہیں یہ جہاد ہے بچ گئے تو غازی اور مر گئے تو شہید۔"

"نا جی! مجھے اپنے ماں باپ کے لیے زندہ رہنا ہے ان کا میرے سوا اور کون ہے۔"

"کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ بس اللہ ہوتا ہے اور کیا موت تجھے ادھر نہیں آسکتی تو شہادت سے بھاگ کر آیا ہے ممکن ہے تجھے ادھر عام سی موت ملے اور تیرے ماں باپ تیرے بغیر رہ جائیں۔"

مگر اکرم پر اس لعنت ملامت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کسی بھرتی ملتان سے ہوئی تھی اور اس کا پتا بھی وہیں کا تھا۔ اس لیے بھگوڑے کے تعاقب میں فوجی ٹیم ادھر نہیں آسکتی تھی اور اکرم خوش تھا۔ غلام محمد نے صفیہ کو اکرم کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہوئی تھی۔

"ہمارے فوجی وطن پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ یہ کیسا فوجی ہے؟"

"بس اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرے گا۔ وہ یہ بھول گیا ہے کہ جس موت سے بچ کر وہ ادھر آیا ہے وہ اسے یہاں بھی آسکتی ہے۔"

غلام محمد نے سوچا نہیں تھا کہ اس کے الفاظ کس حد تک پورے ہو جائیں گے اکرم کو موت تو نہیں آئی مگر ایک روز کنویں سے پانی نکالتے وقت وہ اندر جا گرا لوگوں نے اسے نکالا تو اس کی حالت خراب تھی اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بیچارے ماں باپ اسے کسی نہ کسی طرح ہسپتال لے گئے جہاں وہ ایک مہینہ داخل رہا اور پھر ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا کہ اب اسے ہسپتال میں رکھنے کا فائدہ نہیں تھا ماں باپ اسے گاؤں لے آئے اور وہ جن ماں باپ کی خدمت کا سوچ کر بھاگ آیا تھا وہی الٹا اس کی خدمت کر رہے تھے۔

صفیہ اسے دیکھ کر آئی تو گم صم سی ہو گئی تھی۔ کتنا صحت مند اور لمبا چوڑا نوجوان تھا

اب لاچارگی کے عالم میں چارپائی پر پڑا تھا ہر کام کے لئے وہ دوسروں کا محتاج تھا۔ انسان کتنا بے وقعت ہے یہ اس دن صفیہ کی سمجھ میں آیا تھا جب اس نے اکرم کو دیکھا۔ اس نے ذہن کے میں ایک نئی کھڑکی کھل گئی تھی۔ اسے اپنے شوہر کی بات کسی حد تک سمجھ میں آنے لگی تھی۔ زندگی ایک ضائع ہو جانے والی شے ہے۔ اگر اسے اچھے مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے مگر جب اسے اپنی اور عبداللہ کی تنہائی کا خیال آیا تو وہ کانپ جاتی تھی۔ فطری خوف اس پر غالب آجاتے۔

اسی روز وہ عبداللہ کو لے کر سلامت کے گھر گئی۔ اس کا بچہ بیمار تھا جب اسے دورہ پڑتا تھا تو اس کی رنگت نیلگوں پڑ جاتی تھی۔ صفیہ کو اسے دیکھ کر ترس آیا وہ موم بتی کی طرح پگھل رہا تھا ایک لاکھ روپے اس کی جان بچا سکتے تھے مگر اس کے ماں باپ خالی ہاتھ تھے وہ واپس گھر آئی تو اس کے ذہن میں بار بار سلامت کا بچہ آتا تھا وہ معصوم ابھی زندگی کی چند بہاریں دیکھ پایا تھا رات عشا کی نماز پڑھ کر دعا مانگتے ہوئے اس کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔

"میرے مالک ۔۔۔ میرے معبود مجھے حوصلہ دے۔۔۔ مجھے اس کشمکش سے نکال۔ مجھے راستہ دکھا۔۔۔"

وہ مصلے پر سجدے میں گری روتی رہی۔ رفتہ رفتہ اس کی سسکیاں تھم گئیں وہ اٹھی اور کھانا گرم کرنے لگی غلام محمد عشا کے بعد کھانا کھاتا تھا وہ اس کے آنے تک کھانا گرم کر کے رکھتی تھی کچھ دیر میں باپ بیٹے آگئے اور انہوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد صفیہ نے برتن دھوئے چائے بنائی اور صحن میں بچھی چارپائی تک آئی۔ غلام محمد سر کے نیچے ہاتھ رکھے لیٹا تھا صفیہ نے اسے چائے دی۔

"آج میں سلامت کے گھر گئی تھی۔ اس کا بچہ دیکھنے۔ بیچارہ بہت تکلیف میں ہے۔"

"تمہیں اس کا خیال کیسے آیا؟" غلام محمد کے لہجے میں طنز تھا۔

اس نے تڑپ کر شوہر کو دیکھا۔

"کیوں مجھے خیال کیوں نہیں آسکتا۔ کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے۔"

''میں نے غلط بات کی۔'' غلام محمد شرمندہ ہو گیا تھا۔

''آپ دیکھیں کہ میں دوسرے کے لیے اتنا تڑپتی ہوں تو کیا آپ اور اس گھر کے لیے میرے دل میں کچھ نہیں ہے یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔''

''لیکن ناممکن نہیں ہے۔''

''ہاں اسی وجہ سے میں نے سوچا کہ۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ انسان کی زندگی اور صحت کا کچھ پتا نہیں ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔''

''سچ۔۔۔'' غلام محمد کی آواز مسرت سے لرز رہی تھی۔

''صفیہ! تم مجھے اجازت دے رہی ہو اپنی خوشی سے۔''

''میں نے یہ فیصلہ دل پر جبر کر کے کیا ہے۔'' وہ مرجھا گیا تھا۔

''صفیہ مجھے جبر سے نہیں پوری رضامندی اور خوشی کے ساتھ تمہاری اجازت چاہیے۔''

''میں۔۔۔ کیسے خوشی سے اجازت دوں۔''

جب یہاں تک سوچ لیا ہے تو پھر اپنے اندر راضی برضا والا حوصلہ بھی پیدا کرو بابا کہتے تھے کہ زندگی اور آخرت میں کامیابی اللہ کی رضا ہو جانے کا نام ہے۔''

''میں کوشش کرتی ہوں لیکن یہ دل نہیں مانتا۔۔۔ بے قابو ہو جاتا ہے۔''

''صفیہ! بس یہ آخری کانٹا ہے۔''

''لیکن کیسے نکال دوں۔۔۔!؟'' وہ جھنجھلا گئی تھی۔

''کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ میں اب آپ کے راستے کی دیوار نہیں بن رہی ہوں۔''

''صفیہ! مجھے تمہارے راستے سے ہٹنے کی نہیں بلکہ مجھے پشت سے سہارا دینے کی ضرورت ہے مجھے اطمینان رہے کہ میرے پیچھے تم نے خود کو اتنا مضبوط کر لیا ہے کہ تم خود کو اور عبداللہ کو سنبھال سکتی ہو۔''

''تب مجھے بتائیے کہ آپ کے اطمینان کے لیے میں کیا کر سکتی ہوں؟'' اس نے بے بسی سے شوہر کی طرف دیکھا۔

''خود کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مضبوط کرو۔ میرے بعد تمہارے لیے یہاں رہنا محال ہو جائیگا۔ تم عبداللہ کو لے کر شہر چلی جاؤ جہاں عبداللہ تعلیم بھی حاصل کر سکے۔''

''یہ گھر چھوڑ کر؟'' صفیہ کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''ہاں۔۔۔ کیونکہ جب میں گرفتار ہو جاؤں گا تو لوگ تم لوگوں کو برا کہیں گے تم ایک مجرم کی بیوی ہو گی۔ زمین بیچ کر تم آسانی سے شہر جا سکتی ہو۔''

''نہیں میں اپنی زمین بیچ کر شہر نہیں جاؤں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''یہ تمہاری مرضی ہے۔ کیونکہ بعد میں حالات کو تم نے دیکھنا ہے۔''

دو دن بعد غلام محمد نے سلامت کو ساتھ لیا اور ملتان پہنچ گیا بے چارے سلامت کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کس مقصد کے تحت لایا ہے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد اس نے سلامت سے کہا۔

''یار ایک لاکھ روپے مل سکتے ہیں اگر تو ذرا سی ہمت کرے۔''

''وہ کیسے غلام محمد!'' سلامت بے چین ہو گیا۔

''ایک مجرم ہے جان محمد عرف جانو ڈاکو۔۔۔ اس نے کوئی پانچ سال پہلے ملتان کے ایک زمیندار کو قتل کر کے رقم لوٹ لی تھی۔ میاں فتح علی کی بیوی نے جان محمد کی گرفتاری کرانے پر ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا ہے اگر تم جان محمد کو گرفتار کرا دو تو ایک لاکھ روپے مل جائیں گے۔''

''مگر جان محمد ملے گا کہاں۔۔۔؟''

''اس شہر میں ہوٹل ہے وہ کبھی کبھی وہاں آتا ہے۔ میں اس وجہ سے تجھے ملتان لایا ہوں کہ اگر جان محمد مل گیا تو ایک لاکھ روپے مل جائیں گے۔''

''تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو نا بھائی غلام محمد۔'' سلامت کی آنکھیں خواب دیکھنے لگیں تھیں۔

''میرا لاڈ بچ جائے گا۔''

''انشاء اللہ میں آج اس ہوٹل تک جاؤں گا اگر وہاں جان محمد آیا ہوا تو تمہارا کام

بن جائیگا۔"

"اللہ کرے وہ آیا ہو۔" اس نے خلوص دل سے کہا تھا۔ شام کے وقت وہ ہوٹل سے نکلا سلامت کو اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

"تمہارا جانا بے کار ہے تم اسے نہیں پہچانتے۔"

"جیسے تمہاری مرضی سلامت بھائی!"

دو گھنٹے بعد وہ واپس آ گیا اور پر جوش انداز میں سلامت کو آگاہ کیا۔

"تمہاری قسمت اچھی ہے جان محمد ہوٹل میں آیا ہوا ہے اب چلو میں تمہیں فتح علی کی بیوہ کے گھر تک پہنچا دوں۔ تم اسے جان محمد کا بتا کر انعام لے سکتے ہو میں چلا جاؤں گا۔"

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے غلام محمد بھائی!"

"مجھے واپس جانا ہے صنیہ اور عبداللہ اکیلے ہیں۔"

سلامت زیادہ ذہین آدمی نہیں تھا اس لیے اسے سمجھانا اور سکھانا آسان ثابت ہوا تھا۔

فاطمہ شام کی چائے لان میں پیا کرتی تھی اس وقت بھی وہ لان پر تھی۔ اس کے دونوں بچے بارہ سالہ حمیرا اور دس سالہ احمر پاس گھاس پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے کوٹھی پر اس کا اور اس کے بچوں کا راج تھا۔ میاں فتح علی کے قتل کے بعد وہ بہت دنوں تک بے چین رہی تھی۔ فتح علی عمر میں اس سے بڑا تھا لیکن اسے بہت پیار کرتا تھا۔ اب اسے یاد کر کے فاطمہ دل گرفتہ ہو جاتی تھی۔ ماں باپ کے بے حد اصرار پر بھی اس نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ماں باپ سے کہا۔

"اب میں ان بچوں کے لیے جینا چاہتی ہوں۔"

پھر ماں باپ کے بے پناہ اصرار پر اس کا انکار تبدیل نہیں ہوا۔ قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اس نے فتح علی کے بھائیوں سے اپنا اور اپنے بچوں کا حصہ نکلوا لیا تھا۔ فتح علی کے قاتل کے لیے وہ مسلسل کوشش کرتی رہی۔ فتح علی کے بھائیوں نے قاتل کے لیے پچاس ہزار روپے رکھے تھے فاطمہ نے قاتل کی گرفتاری پر انعام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس نے پچاس ہزار کی رقم دوگنی کر دی تھی۔ اخبار میں کئی بار اس کا اعلان بھی کرایا مگر قاتل گرفتار نہ

ہوا۔

فاطمہ چائے پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہی تھی کہ دروازے کا چوکیدار اس کی طرف آیا۔

"بی بی جی! ایک آدمی آپ سے ملنے کو بولتا ہے۔"

"کون ہے؟" فاطمہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں بی بی! اپنا نام سلامت بتاتا ہے آپ سے فتح علی صاحب کے بارے میں ملنا چاہتا ہے۔" فاطمہ چونکی۔

"فتح علی۔۔۔؟"

"بلاؤں اسے۔"

ذرا دیر میں صورت حال اور حلیے سے مفلوک الحال نظر آنے والا سلامت اس کے سامنے تھا وہ سہما ہوا لگ رہا تھا۔ چوکیدار سخت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات تم کرنا چاہتے ہو فتح علی کے بارے میں؟" فاطمہ نے نرمی سے پوچھا۔

"بی بی! پہلے آپ وعدہ کریں اگر میری بات درست نکلی تو آپ مجھے ایک لاکھ روپے ضرور دیں گی۔"

"ایک لاکھ۔۔۔ کس بات کے؟"

"بی بی! فتح علی صاحب کا قاتل گرفتار کرانے کے لیے۔" فاطمہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"فتح علی کا قاتل۔۔۔ تم جانتے ہو کہاں ہے وہ؟" سلامت اس کے ردعمل سے ڈر گیا تھا۔

"جی بی بی جی!"

اگر تم نے اسے گرفتار کرا دیا تو میرا وعدہ ہے تمہیں ایک لاکھ روپے ضرور دوں گی۔ یہ فتح علی کی بیوہ کا وعدہ ہے سلامت کا چہرہ چمک رہا تھا۔

"بی بی جی! خدا آپ کو آپ کے بچوں کو سلامت رکھے اب میرا لاڈا بچ جائے گا۔"

"یہ لاڈا کون ہے۔"

''میرا ایک ہی بچہ ہے اسے خون کی بیماری ہے ڈاکٹر کہتے ہیں علاج کے لیے ایک لاکھ روپے چاہیں۔''

''اچھا تم اپنے بچے کے لیے انعام چاہتے ہو تو یہ بتاؤ تمہیں قاتل کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ جان محمد اس وقت کہاں ہے؟''

''کہاں ہے؟''

سلامت نے اس ہوٹل کا نام بتا دیا۔ جو اسے غلام محمد نے بتایا تھا۔ اس نے سلامت کو منع کیا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائے کہ اسے جان محمد کا پتا کیسے چلا۔

''وہ وہیں ہے آپ اگر پولیس والوں کو کہیں تو وہ اسے گرفتار کر سکتے ہیں۔''

''نواز اسے یہیں روکنا جانے مت دینا۔'' فاطمہ نے اندر کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ فاطمہ نے اپنے والد کے دوست ایس ایس پی کریم خان سے رابطہ کیا۔

''انکل ایک ضروری بات ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ فتح علی کا قاتل جان محمد اس وقت انصار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

ایس ایس پی عملی آدمی تھا۔ اس نے فاطمہ سے پوچھا نہیں کہ اس کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے اس نے فوری طور پر متعلقہ تھانے فون کر کے ہوٹل پر ریڈ کر کے ڈاکو جان محمد عرف جانو کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی اور دھمکی دی کہ اگر وہ فرار ہوا تو پورے تھانے کو لائن حاضر کر دیا جائے گا۔

غلام محمد ساکت بیٹھا صفیہ اور عبداللہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب پولیس والے دندناتے ہوئے کمرے میں آئے اور رائفلیں تان لیں۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ اس کے ساتھ ''انصاف'' ابھی ہو جائے گا۔ مگر خیریت رہی انہوں نے مقابلہ میں اسے ہلاک نہیں کیا اور گرفتار کر کے ساتھ لے جانے لگے۔ جان محمد نے مزاحمت نہیں کی تھی حسب روایت اس پر لاتیں اور مکے برسے تھے جو اس نے خاموشی سے سہے۔ ایس ایچ او جو پارٹی کی قیادت کر رہا تھا اس نے فحش گالی کے ساتھ پوچھا۔

''اوئے تو ہی جانو ڈاکو ہے ماں دے۔۔۔۔''

''میرا نام جان محمد ہے۔'' اس نے بتایا۔

''وہی۔۔۔ وہی۔۔۔ لے چل اسے۔''

اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ تھانے آتے ہی اس نے جان محمد کو حوالات میں بند کر دیا اور فون پر ایس ایس پی کو اپنی کارگزاری کی اطلاع دی۔

''سر جی! ہم نے مجرم گرفتار کر لیا ہے۔ جی وہ ملزم اپنا نام جان محمد بتاتا ہے۔ اس کے پاس سے کوئی شناختی شے نہیں نکلی ہے سر جی۔۔۔!'' فون رکھ کر اس نے بوکھلائے انداز میں سارے عملے کو جمع کر لیا۔

''اوئے! ایس ایس پی ابھی خود تشریف لا رہے ہیں سب ٹھیک کرو تھانے میں کوئی فاضل بندہ تو نہیں۔''

ایس ایس پی کے آنے تک ہر بونگ جاری تھی۔ کریم خان کے ساتھ فاطمہ بھی آئی تھی۔ وہ سلامت کو بھی لے کر آئی تھی۔ جو باہر بیٹھا تھا۔ ایس ایس پی نے ایس ایچ او سے جان محمد کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا۔

''سر جی! آپ نے کیوں زحمت کی مجھے کہا ہوتا میں اسے لے کر حاضر ہو جاتا۔'' ایس ایس پی نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''فضول باتوں کی بجائے ہمیں اس کے پاس لے چلو۔''

جان محمد سلاخوں کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا جب ایس ایچ او نے اسے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

''اوئے! ایس ایس پی صاحب آئے ہیں کھڑا ہو جا۔'' جان محمد کھڑا ہو گیا۔ کریم خان نے غور سے اسے دیکھا۔

''تم جان محمد عرف جانو ڈاکو ہو؟''

''یہی ہے سر جی! ابھی بتائے گا۔'' تھانیدار بولا۔

''یہ خدمت میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔'' ایس ایس پی نے اسے ڈانٹ دیا۔

''ناؤ گیٹ لاسٹ۔'' ایس ایچ او جھاڑ کا برا مانے بغیر رخصت ہوا۔ جان محمد مسکرایا۔

''جی سر! میں ہی جان محمد عرف جانوڈاکو ہوں پانچ سال قبل فتح علی نامی زمیندار کو لوٹنے اور قتل کرنے کے علاوہ بھی میں نے بے شمار وارداتیں کی ہیں۔''

کریم خان کے عقب سے فاطمہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اسے پانچ سال قبل کوٹھی پر آنیوالا فتح کا دوست یاد آیا۔ جو ڈکیتی میں لوٹی جانے والی رقم دے کر چلا گیا تھا۔ لیکن وہ کلین شیو تھا اور اب اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی بڑھے ہوئے تھے، اسکے باوجود اس کا دل گواہی دینے لگا کہ یہ وہی شخص ہے اس نے کریم خان کو ایک طرف لے جا کر ساری بات بتائی اور بولی۔

''مجھے شک ہے یہ وہی آدمی ہے۔''

''یہ معلوم ہو جائے گا۔'' کریم خان نے سر ہلایا۔

''میں خود اس سے کیوں نہ پوچھ لوں۔''

فاطمہ نے اجازت چاہی اور کریم خان کی رضامندی سے جان محمد کی طرف آئی۔

''سنو! تم میرے شوہر کے قاتل ہو۔ تم نے سچ بولا اس لیے جھوٹ مت بولنا کیا یہ غلط ہے تم پانچ سال پہلے میرے گھر آئے تھے اور مجھے ڈکیتی میں لوٹی جانے والی رقم دی تھی۔''

''میں اس روز کے جھوٹ پر آپ سے شرمندہ ہوں۔''

''اور اپنے کیے پر۔۔۔۔؟'' فاطمہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

''اس پر بھی شرمندہ ہوں اور معافی کا طلب گار ہوں۔''

''کیا تم اس طرح سے پھانسی سے بچ جانے کی امید کر رہے ہو؟'' کریم خان نے سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں جناب! آپ بھی جانتے ہیں عدالت یہ سب نہیں دیکھتی ہے۔ وہاں جرم کے شواہد اور گواہیاں دیکھی جاتی ہیں۔''

''میرا تم سے وعدہ ہے میں تمہیں سخت ترین سزا دلواؤں گا۔''

''آپ بے شک کیس مضبوط کریں۔ اپنی طرف سے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہر جگہ اپنے ہر جرم کا اقرار کروں گا۔''

''میں کسی ملزم کے وعدے پر اعتماد نہیں کروں گی۔''

ایس ایس پی فاطمہ کو لے کر واپس چلا گیا اور جان محمد اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ جانے سے پہلے کریم خان ایس ایچ او سے ملا۔

''اس کا ریمانڈ لو۔ وہ تعاون پر آمادہ ہے اس لیے بلاوجہ کی سختی نہ کرنا۔ مطلب یہ کہ نفسیاتی مریض مت بن جائے۔ اس تھانے کے بارے میں مجھے مسلسل رپورٹیں مل رہی ہیں۔ کیس جلد از جلد بنا کر چالان عدالت میں پیش کرو۔''

''جیسا حکم سرکار کا۔''

ایس ایچ او نے نیازمندی سے کہا تھا۔ فاطمہ سلامت کو اپنے ساتھ کوٹھی واپس لے گئی۔ سلامت بے حد خوش تھا۔ جانوڈاکو کی گرفتاری کے بعد اس کے بیٹے کے علاج کے لیے پیسے مل جاتے اسے اس کے سوا اور کیا چاہیے تھا۔ فاطمہ اس بارے میں اسے اندر لے گئی۔ اس کا باپ زمینوں کی طرف گیا تھا مگر اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ وہ بہ آسانی سلامت کو ایک لاکھ روپے دے سکتی تھی۔ اس نے سلامت سے کہا۔

''ایک لاکھ روپے تمہیں کل ملک جائیں گے لیکن ابھی مجھے یہ بتاؤ جانوڈاکو کا سراغ تمہیں کیسے ملا؟''

غلام محمد نے اسے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ اس نے سادگی سے کہا۔

''بی بی جی! میں نے کسی سے سنا تھا کہ جانوڈاکو ادھر آتا ہے۔ میں نے سوچا شاید قسمت اچھی ہو اور وہاں مجھے جانو نظر آ گیا۔''

''تم ایک دور دراز علاقے کے رہنے والے ہو تمہیں ملتان میں جانو کی موجودگی کا کیسے پتا چلا؟''

''بس اپنے بچے کے لیے ادھر آتا جاتا رہتا ہوں اس لیے سن لیا۔''

فاطمہ نے محسوس کیا کہ وہ پوری بات نہیں بتا رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی شے چھپی ہوئی تھی جان محمد وہی شخص تھا جس نے ڈکیتی کی رقم واپس کی تھی کیا اس کا ضمیر جاگ گیا تھا پھر یہ شخص آیا اور اسے گرفتار کرا دیا۔ تقریباً دو مہینے قبل کسی نے فون کر کے اس سے کنفرم کیا تھا کہ

فتح علی کے قاتل کی گرفتاری پر رکھا ہوا انعام باقی ہے یا نہیں۔ عجیب بات تھی اسے فتح علی کے قاتل کی جتنی خوشی ہونی چاہیے تھی اتنی ہو نہیں رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قاتل کو دیکھ کر بے قابو ہو جائے گی۔ لیکن ایسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اسے جان محمد کو دیکھ کر غصہ تک نہیں آیا تھا اس کے بجائے دل میں ایک سردی کیفیت آ گئی تھی اور اب اسے تجسس ہو رہا تھا۔ اس کے پاس سچ تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا یہ سلامت۔۔۔۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔

''سنو تم جاؤ اپنے بچے کو لے کر آؤ کل میں تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلوا کر ایک لاکھ روپے اس میں منتقل کر دوں گی۔ یہی نہیں تمہارے بچے کا علاج بھی میں ہی کراؤں گی۔ بس تم کل ہی جا کر اپنے بیوی بچے کو لے آؤ۔ اسی کوٹھی میں رکنا۔''

سلامت دنگ رہ گیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قدرت اس پر اس قدر مہربان ہو جائے گی۔ وہ فاطمہ کو دعائیں دینے لگا۔ اگلے روز فاطمہ نے اس کا بینک اکاؤنٹ کھلوایا۔ اس کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ جا کر سلامت کی بیوی بچے کو لے آئے اگلے روز تک وہ آ چکے تھے۔ فاطمہ نے ایک سرونٹ کوارٹر ان کے حوالے کر دیا۔ بچے کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ جہاں اس کا علاج شروع ہوا۔ سلامت اور اس کی بیوی فاطمہ کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔

جان محمد تفتیش میں تھا۔ اس نے خاصا طویل بیان دیا تھا اسے جن جن وارداتوں کی تفصیل یاد تھی وہ اس نے بیان کر دی تھی فتح علی کے قتل کا اعتراف کیا۔ البتہ اس نے ڈکیتی کی رقم کے بارے میں یہی بتایا کہ وہ اسے خرچ کر چکا ہے۔ ایس ایچ او کرامت شاہ اس سے رقم کے بارے اگلوانے کے لیے تشدد سے کام لے رہا تھا مگر جان محمد ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔

''جناب! میں نے اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ مجھے عدالت میں پیش کر دیں تاکہ میں اپنے کیے کی سزا پا سکوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے جرائم میں بہت پہلے چھوڑ چکا ہوں۔ ہاں اگر آپ تشدد کرنے کا شوق پورا کرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔ آخر میں نے بھی نجانے کتنے لوگوں کو ننگ کیا ہے۔ یہ اس کی سزا ہے۔''

''بچو! لگتا ہے تجھے سزا بھگتنے کا بڑا شوق ہے لیکن ہم بھی کچا کام نہیں کریں گے

تیری کھال کھینچ کر سچ نکلوا کر پکا چالان پیش کریں گے وہاں تو بچ نہیں سکے گے۔''

جان محمد چپ رہا۔ وہ ان کے مقابلے میں کیا کر سکتا تھا۔ چودہ روز ریمانڈ کے دوران وہ ہر رات زخموں سے آشنا ہوتا تھا۔ پندرہویں روز اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اگرچہ ایس ایچ او مزید ریمانڈ چاہتا تھا مگر اس تفصیلی اقبالی بیان اور اپنے روبرو اسکی تصدیق کرنے پر مجسٹریٹ نے مزید ریمانڈ کا مطالبہ مسترد کر کے عدالت میں بھیج کر جان محمد کو جیل بھیج دیا۔ جیل سے جان محمد نے پہلی بار صفیہ کو خط لکھا اور اپنے بارے میں بتایا اور اسے تسلی دی کہ وہ حوصلے سے کام لے اور آنیوالے حالات کو اللہ کی رضا جان کر رہے۔ ایس ایس پی کریم خان کیس کو فورس کر رہا تھا۔ اس لیے جلد کیس سیشن کورٹ چلا گیا۔ جان محمد نے وکیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے پراسیکیوٹر کو [illegible] دینے کے جواب میں کہا کہ وہ اپنے کیے کی سزا بھگتنا چاہتا ہے۔

''امی! بابا کب آئیں گے؟'' عبداللہ روز پوچھتا تھا۔ اس روز بھی اس نے یہی سوال کیا تھا۔

''بیٹا! وہ کبھی نہیں آئیں گے۔'' اس نے دل کو پکا کر کے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''امی! کیوں نہیں آئیں گے؟'' عبداللہ اس کے ساتھ لپٹ گیا تھا۔

''کیونکہ انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ قرض ادا کرنا ہے۔''

''یہ قرض کیا ہوتا ہے امی۔۔۔؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''بیٹا! جب آپ کسی سے کوئی چیز لیتے ہو تو آپ کو اسے واپس بھی کرنا پڑتا ہے اسے قرض کہتے ہیں۔ تمہارے بابا نے لوگوں کا قرض ادا کرنا ہے۔''

''تو بابا! قرض ادا کر کے آ جائیں۔''

''قرض بہت سارا ہے بابا اسے ادا کر کے نہیں آ سکتے۔'' عبداللہ سہم گیا تھا۔

''تب ہم کیسے رہیں گے میں کس کے ساتھ مسجد جاؤں گا؟''

''اس صبح فجر کے وقت تمہارے بابا نہیں آئے تھے تب تو تم اکیلے جا رہے تھے اب بھی تم اکیلے جاؤ گے۔''

''امی مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''میرا بیٹا بہادر باپ کا بیٹا ہے کسی سے نہیں ڈرے گا سوائے اللہ کے۔''

جان محمد نے اسے جانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ اس کی گمشدگی سے لاعلمی ظاہر کر کے اور پھر زمین سلامت کو کاشت کے لیے دے۔ بٹائی پر اس سے معاملہ کر لے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔ اس نے کوشش کی تھی کہ صفیہ کو آنیوالے مسائل کا ممکنہ حل پہلے سے سمجھا کر جائے۔ جس وقت وہ جا رہا تھا صفیہ کا بس نہیں چل رہا تھا اس میں سما جائے اسے دنیا کی نظروں سے چھپا لے۔ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ عبداللہ مدرسے جا چکا تھا ورنہ ماں کے اس طرز عمل پر حیران رہ جاتا ویسے بابا کا طرز عمل اس کو دو تین دن سے حیران کر رہا تھا بات بات پر پیار کرتا تھا۔ خود سے چمٹا کر رکھتا تھا۔

''بابا! کیا میں اچھا لگ رہا ہوں؟''

''بابا کی جان تو ہے ہی اچھا۔''

آج صبح وہ اس کے مدرسے کے جانے کے بعد روانہ ہوا تھا۔ صفیہ اس سے لپٹی روئے جا رہی تھی جان محمد نے بے بسی سے کہا۔

''اللہ کے لیے صفیہ اس طرح تو میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ تم سے اور عبداللہ سے دوری میرے لیے اور بھی عذاب بن جائے گی۔''

صفیہ خود پر قابو پانے لگی۔ وہ جانتی تھی جان محمد سے دوری اس کا مقدر بن گئی ہے اسے حوصلہ کرنا ہی تھا کچھ دیر بعد جان محمد جانے لگا اس نے کہا۔

''جان محمد! مجھے آپ پر فخر ہے میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں عبداللہ کی پرورش اس طرح کروں گی جس طرح آپ کرتے۔ اسے ایک اچھا انسان بناؤں گی۔''

''صفیہ۔۔۔ میرے۔۔۔ میرے بعد اکیلے مت۔۔۔''

''اس بارے میں کوئی بات نہ کریں۔'' صفیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اس حوالے سے میں کوئی بات آپ کی نہیں مانوں گی۔''

''صفیہ! اکیلی عورت کے لیے زندگی دشوار ہوتی ہے۔'' اس نے تڑپ کر کہا تھا۔

''میرے لیے اکیلے رہنا اتنا دشوار نہیں ہوگا لیکن آپ کے علاوہ کسی کا تصور

میرے لیے محال ہے۔''

حسرت و یاس کی نظروں سے صفیہ نے جان محمد کو رخصت کیا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ جا چکا تھا لیکن اس وقت امید تھی کہ وہ واپس آئے گا اور اس بار کوئی امید نہیں رہی تھی جانیوالا ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔

جان محمد دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر قیدیوں والا لباس تھا اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی ایک سپاہی نے اس کی سیل کا دروازہ کھولا۔

''چلو تمہاری پیشی ہے آج۔''

جان محمد کو علم تھا وہ سپاہی کے ساتھ باہر آیا۔ جیل کے احاطے میں قیدیوں کو سماعت کے لیے جانیوالی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ عدالت میں آج اسے اپنا اقبالی بیان دہرانا تھا۔ جس کے بعد اس پر جرح کی جاتی۔ اس نے اپنی باری آنے پر بیان دیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ فتح علی کو اس نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ کیونکہ پولیس نے صرف ایک مقدمے کا چالان پیش کیا تھا جرح اور جوابی جرح میں وقت پورا ہو گیا۔ تین مہینے میں یہ اس کی تیسری پیشی تھی جیل میں اس کا زیادہ وقت قرآن پاک کی تلاوت میں گزرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے جیل کے حکام بھی اس کا خیال رکھنے لگے تھے اس کی درخواست پر وضو کرنے کی سہولت میسر کی گئی تھی نماز باجماعت پڑھی جاتی تھی۔ اسکے ساتھیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ ڈاکو اور قاتل رہ چکا تھا۔

''اڑے تو۔۔۔ تو مولانا لگتا ہے۔'' ایک قیدی نے کہا تھا جو بلوچستان سے آیا تھا۔

''اللہ معاف کرے میں صحیح معنوں میں انسان بھی نہیں ہوں۔ مولانا تو بڑی شخصیت ہوتی ہے۔'' قیدی ہنسا تھا۔

''اڑے! تو پھر مولانا کیسا ہوتا ہے؟''

ان لوگوں کے ساتھ وقت اچھا گزرتا تھا لیکن رات کو تنہائی میں صفیہ اور عبداللہ بہت یاد آتے تھے اسے معلوم تھا عبداللہ اس کے لئے تڑپتا ہوگا۔ اسکے حوالے سے وسوسے آتے تو وہ جلدی سے اللہ کو یاد کرنے لگ جاتا اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سزا کا وقت قریب

آرہا تھا۔

سلامت اور اس کی بیوی بے انتہا خوش تھے۔ لاڈا آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا اس کی حالت علاج سے دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اسکے علاج کا تمام خرچہ فاطمہ برداشت کر رہی تھی۔ سلامت اور اسکے بیوی بچے ایک طرح سے اس کے پاس مہمان تھے۔ چھوٹا سرونٹ کوارٹران کے لیے کسی عالی شان محل سے کم نہیں تھا۔ سلامت اور اس کی بیوی غلام محمد کو بے پناہ دعائیں دینے لگی۔ اسکی وجہ سے وہ اس مقام تک آئے تھے۔ انہیں ایک لاکھ روپے ملے تھے اور ان کے بچے کا علاج بھی جاری تھا۔ سلامت نے سوچا تھا جب ان کا بچہ صحت یاب ہو جائیگا تو وہ گاؤں جا کر وہاں زمین خریدے گا ان کے گاؤں میں زیر زمین میٹھا پانی تھا اگر کوئی کنواں کھدوالیتا تو اس کی زمین کو پانی بھی مل جاتا تھا۔ ایک لاکھ روپے میں آرام سے چھ سات مربع زمین مل سکتی تھی۔

''بھائی غلام محمد گاؤں جا کر دوبارہ نہیں آیا۔'' سلامت کی بیوی نے اس روز اس سے کہا۔

''نیک بخت وہ فارغ تھوڑا ہے۔ ہماری خاطر شہر تک آیا تھا۔''

''پھر بھی تو کسی دن جا کر اسے مل آ۔'' بیوی نے اصرار کیا۔

''اس کا شکریہ ادا کر۔''

بیوی کی بات سلامت کے دل کو لگی۔ انہیں گاؤں سے نکلے تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ وہ غلام محمد سے مل آتا اور خیر خیریت بھی معلوم ہو جاتی۔ وہ فاطمہ سے اجازت لے کر دوسرے دن روانہ ہو گیا۔ راستے میں پہلے غلام محمد کا گھر ہی آتا تھا وہ سیدھا وہیں پہنچا۔

''غلام بھائی! او کدھر ہو؟'' آواز سن کر اندر سے صفیہ آئی اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

''سلامت بھائی! تم کب آئے؟''

''بھرجائی میں ابھی آیا ہوں پہلے سوچا بھائی غلام محمد سے مل لوں اس کا ہم پر بڑا احسان ہے۔''

''پر سلامت بھائی! وہ تو تمہارے ساتھ گئے تھے تب سے واپس نہیں آئے۔''

''غلام بھائی آیا ہی نہیں؟'' وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

''مگر وہ تو گاؤں چلا گیا تھا۔''

''یہاں نہیں آیا وہ۔۔۔ نہیں آیا۔'' وہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''تم بتاؤ بچہ کیسا ہے تمہارا؟''

''اچھا ہے بھرجائی پر غلام محمد کیوں نہیں آیا؟''

''میں کیا بتا سکتی ہوں بھائی۔'' صفیہ بے بسی سے بولی۔

''ہم سب پریشان ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو میں شہر میں جن بی بی جی کے پاس ہوں وہ ضرور بھائی غلام محمد کو تلاش کرا دیں گی۔''

سلامت اگلے روز ہی واپس چلا گیا تھا اور اس نے جاتے ہی فاطمہ کو غلام محمد کے بارے میں بتایا۔ فاطمہ نے عدم توجہی سے سنا اور بولی۔

''اچھا دیکھوں گی ابھی تو جانو ڈاکو کے مقدمے کا فیصلہ قریب ہے۔''

''بی بی یہ جانو ڈاکو کیسا ہے؟''

''جیسے ڈاکو ہوتے ہیں۔'' فاطمہ نے جواب دیا۔

''بی بی! آپ کوشش کریں تو میرا یار مل جائے گا اس کے بیوی بچے پریشان ہیں۔''

''دیکھوں گی۔'' فاطمہ نے اس بار بیزاری سے جواب دیا تھا۔

وہ ہر پیشی پر باقاعدگی سے عدالت جاتی تھی اس نے محسوس کیا کہ جان محمد اپنے دفاع سے دست بردار ہو چکا تھا۔ مقدمے کا رخ سراسر اس کے خلاف جا رہا تھا اس نے صرف فتح علی کے قتل کا اقرار کیا تھا بلکہ یہ تک کہا تھا کہ اس نے قتل اپنے دفاع میں نہیں کیا بلکہ غصے میں آ کر کیا ہے لوٹی جانے والی رقم کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ خرچ ہو چکی ہے۔ یہ جھوٹ تھا۔ رقم اس نے خود فاطمہ کو لا کر دی تھی فتح علی کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے اس نے عدالت سے قصاص کا مطالبہ کیا تھا اپنے بیان میں اس نے وضاحت نہیں کی تھی کیونکہ اس نے اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔

جرح اور گواہیاں مکمل ہونے کے بعد اب اگلی پیشی تک فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا

اور لگ رہا تھا کہ جج جان محمد کو سزائے موت کا حکم سنائیگا۔ اس روز عدالت آتے ہوئے سلامت اور اس کی بیوی بچے کو بھی لائی تھی۔ وہ ہسپتال جہاں لاڈا کا علاج ہو رہا تھا سیشن کورٹ سے کچھ ہی فاصلے پر تھا فاطمہ نے سلامت سے کہا تھا اگر وہ جلدی فارغ ہو جائیں تو کورٹ تک آجائیں گاڑی اور ڈرائیور باہر ہوں گے۔ سلامت اور اسکی بیوی بچہ وہاں موجود تھے فاطمہ پارکنگ تک آئی۔ اسی لمحے پولیس اہلکار زنجیروں میں جکڑے جان محمد کو لے کر باہر نکلی۔ سلامت جو فاطمہ کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے جان محمد کی طرف دیکھا اور ساکت رہ گیا پھر وہ چونک کر اس کی طرف لپکا۔

''بھائی غلام محمد! یہ کیا ہے؟'' جان محمد کو لے جانے والے سپاہی بھڑکے۔ ایک نے کہا۔

''اوئے پیچھے ہٹ۔۔۔''

یہ جان محمد ہے۔''

''یہ غلام محمد ہے میرا گرائیں۔''

سپاہی نے گالی دی۔ ''گرائی دے یار۔۔۔ پیچھے ورنہ گولی مار دوں گا۔'' اس نے رائفل تان لی۔

سلامت ڈر کر پیچھے ہٹا۔ جان محمد ایسے کھڑا تھا جیسے وہاں ہونیوالی گفتگو سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سلامت کو پیچھے دھکیل کر وہ جان محمد کو لے کر جیل والی گاڑی کی طرف بڑھے۔ سلامت ان کے پیچھے چلتا مسلسل یہ کہہ رہا تھا۔ کہ یہ غلام محمد ہے سپاہی اسے ڈانٹ کر دور کر رہے تھے۔ حتی کہ جان محمد کو قیدیوں والی وین میں سوار کرا دیا گیا۔ فاطمہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے سلامت کی بیوی سے پوچھا۔

''یہ غلام محمد کون ہے؟''

''ہمارے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ سلامے کے ساتھ ادھر آیا تھا۔''

''غلام محمد اور جان محمد۔'' فاطمہ نے خود سے کہا۔

اسے لگا جیسے اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ رہا تھا وہ سلامت کی طرف لپکی۔

''سلامت یہ شخص کون ہے؟''

''یہ تو غلام محمد ہے نجانے پولیس نے اسے کیوں پکڑ لیا ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔''

فاطمہ کہتی ہوئی کار کی طرف بڑھ گئی۔ کوٹھی پر جا کر اس نے سلامت کو الگ بلایا۔

''سچ سچ بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ کیا تم مجھے دھوکا دے رہے ہو؟''

''خدا نہ کرے بی بی کیسی باتیں کر رہی ہیں اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''کیسا دھوکا بی بی جی؟''

یہ شخص جسے پولیس لے جا رہی تھی اور تم اسے غلام محمد کہہ رہے تھے جانتے ہو کون ہے یہ ڈاکو جانو ہے۔ جس نے میرے شوہر کو قتل کیا تھا'' اگر سلامت کے سر پر پہاڑ ٹوٹتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔

''یہ جانو ڈاکو۔۔۔۔ جی!''

''بکواس مت کرو مجھے بتاؤ تمہیں جانو ڈاکو کے بارے میں کس نے بتایا تم اسے گرفتار کرانے کا دعویٰ لے کر آئے تھے اور تم اسے پہچانتے بھی نہیں ہو۔''

اب سلامت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ فاطمہ کو سب کچھ سچ سچ بتا دے۔ اس نے الف سے لے کر یے تک سب بتا دیا تھا حتی کہ جان محمد کے گاؤں میں آنے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ فاطمہ ایک سے ایک کڑی ملاتی رہی اور ساری حقیقت اس کے سامنے آ گئی۔

''جان محمد! تم نے ایسا کیوں کیا؟'' فاطمہ نے نرمی سے پوچھا۔

وہ دونوں اس وقت جیلر کے دفتر میں بیٹھے تھے اس ملاقات کے لیے فاطمہ کو ایس ایس پی کریم خان کا اثر رسوخ استعمال کرنا پڑا تھا۔ اس سے اگلے روز جان محمد کی پیشی تھی اور اس میں فیصلہ سنایا جانا تھا۔

''اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے لیے جی۔۔۔!''

''اس کا تمہیں اتنے عرصے بعد خیال آیا اور تم نے لوٹی ہوئی رقم بھی واپس کر دی تھی۔''

''بی بی جی! بس جرائم کے راستے سے تائب ہو گیا تھا۔''

"اب تک تم کیا کرتے رہے ہو؟"

"بس ادھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے سلامت نے سب بتا دیا ہے۔"

"تب آپ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہیں؟"

"صرف یہ پوچھنے کہ تمہیں کس نے مجبور کیا۔ اپنی بیوی بچے گھر اور کھیتوں کو چھوڑ کر خود کو اس طرح پولیس کے حوالے کر دو؟"

"میں ۔۔۔ میں سلامت کی مدد کرنا چاہتا تھا اسکا بچہ مر رہا تھا۔"

"جان محمد! جھوٹ مت بولو آج کے دور میں کوئی انسان کسی کے لیے کوئی ایسی قربانی نہیں دیتا اگر تم بدستور مجرم ہوتے گھر بار اور بیوی بچوں سے محروم ہوتے تو سلامت کی مدد کر سکتے تھے۔ مگر یہ مدد تم اپنے خاندان کی قیمت پر نہیں کر سکتے۔" جان محمد نے تعجب اسے دیکھا۔

"آپ بہت عقل مند ہیں بی بی جی! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ کے شوہر کے قاتل نے خود کو پولیس کے حوالے کیوں کیا؟"

"فرق پڑتا ہے جان محمد! تم نے اتنے آرام سے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تم نے وکیل کرنے سے انکار کیا عدالت میں اپنے جرائم کا اعتراف کیا وہاں بھی وکیل کی صفائی سے انکار کیا۔ آخر تم پھانسی پانا چاہتے ہوں؟ مجھے لگتا ہے۔ تمہارے اندر ایسی ہی کوئی خواہش ہے۔ آخر کیوں؟"

"میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔"

"ٹھیک ہے اگر تم نہیں بتا رہے تو مجبوراً مجھے قصاص کے قانون کو معاف کرنے والا اصول استعمال کرنا پڑے گا۔ جان محمد میں تمہارا جرم معاف کر دوں گی اور عدالت اپنا فیصلہ واپس لے لے گی۔"

"آپ ایسا نہیں کریں گی بی بی جی ۔۔۔!" جان محمد نے بے ساختہ کہا۔

"تب مجھے وجہ بتاؤ۔"

"بی بی جی آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔"

"جان محمد! میرے لیے انصاف ضروری ہے میں ڈر رہی ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں ۔ مجھ پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ میں اپنے کیے کی سزا بھگتوں گا۔"

فاطمہ بے پناہ اصرار کرتی رہی لیکن جان محمد نے جواب میں چپ سادھ لی تھی آخر وہ جب مایوس ہو کر جانے لگی تو جان محمد نے سر اٹھا کر اس کی دیکھا۔

"بی بی جی ایک بات پوچھوں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"پوچھو۔" فاطمہ رک گئی۔

"اس دنیا میں آپ کو سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟"

"اپنے بچے۔" اس نے جواب دیا۔

"تب آپ کو اپنے بچوں کی قسم! میرے مقدمے اور فیصلے میں مداخلت نہ کیجیے گا۔ مجھے میرے کیے کی سزا پانے دیجیے۔"

اس لمحے فاطمہ نے جان لیا کہ وہ ایک مردہ شخص کے سامنے کھڑی ہے جو زندگی اور اسکی ساری خواہشات سے سارے ناطے توڑ چکا ہے۔ اگر چہ وہ سانس لیتا انسان تھا لیکن درحقیقت مر چکا تھا۔

صفیہ دوپہر کے لیے کھانا بنانے کے لیے اٹھی تھی۔ عبداللہ مدرسے سے آنے والا تھا۔ گاؤں کے لوگ غلام محمد کے اس طرح غائب ہونے سے پریشان تھے۔ خاص طور پر مسجد اور مدرسے کے امام اور استاد ۔۔۔ کیوں کہ ان کی تنخواہیں غلام محمد ہی دیا کرتا تھا۔ وہ کئی بار اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے آ چکے تھے۔ صفیہ انہیں تسلی دیا کرتی تھی۔ اس نے مزدور بلوا لیے تھے اور اپنی نگرانی میں بھٹے اتروا رہی تھی۔ پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کا خرچ ہی کیا تھا۔ خاصا بچ جاتا تھا ابھی پچھلی فصل جانوروں کے لیے محفوظ کر رہی تھی۔ سب جانے پہچانے لوگ تھے رات کو باڑے کی حفاظت اور جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے الٰہی بخش نامی شخص کو ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ مولوی عبدالصمد کے زمانے سے ان کے لیے کام کر رہا تھا۔ بڑھاپے کے باعث محنت مشقت کا کام نہیں کر سکتا تھا اس لیے صفیہ نے اسے نگرانی سونپ

دی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو صفیہ نے چونک کر دیکھا۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی اور وہ گاؤں یا علاقے کی نہیں تھی۔ وہ دروازے سے گزر کر اندر آئی اس کا لباس بیگموں جیسا تھا۔ صفیہ اٹھی تھی۔

"جی بی بی! کیسے آئیں؟" اس نے بیٹھنے کے لیے موڑھا پیش کیا مگر وہ کھڑی رہی۔

"غلام محمد کا گھر یہی ہے۔"

"جی یہی ہے میں اسکی بیوی ہوں۔" ایک اجنبی عورت کے منہ سے اپنے شوہر کا نام اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"پر آپ کون ہیں۔۔۔؟"

"میں فتح علی کی بیوہ ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔

"میرا نام فاطمہ ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" صفیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ڈر بھی گئی تھی۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں تاکہ چل کر اپنے شوہر کو سمجھاؤ۔ وہ کیوں مرنا چاہتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔"

صفیہ نے گہری سانس لی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فاطمہ نے ہمدردی سے اسے لپٹا لیا تھا۔ دھیرے دھیرے صفیہ چپ ہو گئی پھر اس نے فاطمہ کو بتانا شروع کر دیا کہ جان محمد کیوں مرنا چاہتا تھا فاطمہ گم صم سی رہ گئی۔

"میرے خدایا۔۔۔!" کیا آج کے دور میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں تم نے اسے اجازت کیوں دی۔۔۔؟"

"میں اس کے گھر والی ہوں۔ ایک بیوی کا فرض ہے شوہر کی بات مانے اور پھر یہ تو جی آخرت کا سوال تھا۔ میں کیسے برداشت کرتی کہ میرا شوہر دنیا کے کرموں کی سزا آخرت میں پائے۔ اللہ کے سامنے دوسروں کا بوجھ لے کر جانا اچھی بات تو نہیں ہے جی۔۔۔!"

فاطمہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ "میں اسے معاف کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ معافی نہیں چاہتا۔"

"وہ چاہے گا بھی نہیں۔"

"تمہارا دل نہیں کانپا۔"

"بہت کانپا تھا جی۔۔۔! اب بھی کانپتا ہے لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے آگے دل کی کیا حیثیت ہے۔"

"تم میاں بیوی انسان نہیں لگتے۔"

"ہم انسان ہی ہیں۔ بس اللہ کا حکم پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" صفیہ نے کہا۔

"رکیں میں آپ لیے لسی لاتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو لینے آئی ہوں۔"

"بس جی ایک منٹ میں۔"

صفیہ نے سنا نہیں۔ اس نے اندر جا کر شیشے کا گلاس نکالا فاطمہ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"میں نے کہا نا ہمیں جانا ہے کل جان محمد کو جیل میں پھانسی ہے۔"

"پھانسی۔۔۔"

صفیہ کے ہاتھ سے گلاس گر گیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر بھی کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ وہ خود بھی گرنے لگی تھی بمشکل فاطمہ نے اسے سنبھالا اور لا کر چارپائی پر لٹایا۔ پاس گھڑے سے پانی نکال کر اس کے منہ پر چھڑکا پھر منہ میں ٹپکایا۔ اس کی کوششوں سے صفیہ کو ہوش آنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ سچ ہے۔"

"ہاں سچ ہے اور اسی وجہ سے میں تمہیں لینے آئی ہوں اس سے ملو اور اسے سمجھاؤ اس نے مجھے میرے بچوں کی قسم دی ہے ورنہ اب تک میں اسے خود معاف کر چکی ہوتی۔"

"میں چلوں گی۔" صفیہ رونے لگی۔

''پر میں اسے سمجھا نہیں سکتی۔ اس نے مجھے اس سے بڑا واسطہ دیا ہے اللہ کا واسطہ۔۔۔لیکن میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

اسی لمحے عبداللہ مدرسے سے آ گیا اپنے گھر میں اجنبی عورت کو دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔

''امی یہ کون ہیں؟'' اس نے ماں سے سوال کیا۔

''یہ بیگم صاحبہ ہیں انہیں سلام کرو۔'' عبداللہ نے سلام کیا تو فاطمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کتنا پیارا بچہ ہے۔ جان محمد۔۔۔''

''عبداللہ اندر جا کر بستہ رکھ کر آؤ۔''

صفیہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹی اور جب وہ اندر چلا گیا تو دھیمی آواز میں بولی۔

''اسکے سامنے اس کے باپ کا ذکر مت کریئے گا۔''

اس نے منع کیا تھا عبداللہ کو پتا نہ چلے کہ وہ ایک مجرم کی اولاد ہے۔''

''وہ مجرم نہیں ہے بہت عظیم آدمی ہے جو خود اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔''

''بی بی جی! یہ بات میں جانتی ہوں یا آپ۔۔۔۔دنیا تو اسے مجرم ہی کہے گی اور ہمیں اس کے بیوی بچے۔''

''میں سمجھ گئی چلو۔۔۔عبداللہ کو میں اپنے گھر چھوڑ دوں گی۔''

بی بی جی! میں اسے منع نہیں کروں گی۔ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' فاطمہ نے سرد آہ بھری تھی۔

جان محمد نے صفیہ کو دیکھا۔ ''شکر ہے تم آخری بار مجھ سے ملنے آ گئیں۔'' صفیہ رو رہی تھی۔

''میں۔۔۔میں کیسے صبر کروں۔''

''تم صبر مت کرو۔ اللہ خود صبر دے گا۔ وہ کسی انسان پر اسکی برداشت سے زیادہ

بوجھ نہیں ڈالتا۔ عبداللہ کیسا ہے؟'' جان محمد نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔''

''میرا بیٹا بہادر ہے۔ صفیہ اسے بہت سنبھال کر رکھنا۔ اسے اچھا انسان بنانا۔'' وہ پھر رونے لگی تھی۔

''آپ مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال کر جا رہے ہیں۔''

صفیہ روتی رہی، بکھرتی رہی، جان محمد پیار سے اسے سمیٹتا رہا، اسے دلاسا دیتا رہا۔ فاطمہ نے ان دونوں کی ملاقات کا انتظام الگ جگہ کرایا تھا۔ جہاں کوئی ان کی تنہائی میں مخل نہ ہو اس نے یہ بات اشاروں کنایوں سے صنیہ کو سمجھا بھی دی تھی۔ صفیہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ لمحے گزریں اور پھر وہ شوہر پر آخری نظر ڈال کر وہاں سے چلی گئی۔ جان محمد زیر لب دعا کرنے لگا۔

''میرے مالک مجھے حوصلہ دے اور بے صبری سے بچا۔''

ایک سپاہی نے کوٹھری میں پہنچا دیا اس کے بعد دس گھنٹے تھے اس نے غسل کے لیے پانی منگوایا غسل کر کے نئے کپڑے پہنے اور قرآن پاک کھول کر بیٹھ گیا۔ درمیان میں وہ صرف نماز کے لیے اٹھا تھا یا کھانے کے لیے صبح پانچ بجے جب اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تو اس نے قرآن پاک بند کر کے رکھ دیا۔ وقت قریب تھا۔ چلنے سے پہلے اس نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا جس نے اسے دنیا میں کفارہ ادا کرنے کی توفیق دی تھی نماز ادا کر کے وہ اپنے قدموں سے چل کر پھانسی گھاٹ تک پہنچا۔ جہاں تمام متعلقہ لوگ جمع تھے جیلر نے اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی۔

''بس اتنا کیجئے گا۔ کہ مجھ گناہ گار کے لیے مغفرت کی دعا کیجیے گا۔''

''ضرور میرے بیٹے۔۔۔؟''

جیلر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے اب تک بے شمار مجرموں کو پھانسی پاتے دیکھا تھا لیکن اتنا پر سکون کسی کو نہیں پایا تھا۔ جان محمد نے اسے متاثر کیا تھا۔ بڑے ظالم و جابر و قاتل اس وقت بچوں کی طرح رونے گڑگڑانے لگتے تھے۔ جان محمد پر سکون اور مضبوط قدموں سے تختہ دار کی طرف بڑھا۔ جلاد نے اسے سیاہ ٹوپی پہنائی پھر پھندا اس کے

گلے میں ڈالا۔ جان محمد زیرلب کہنے لگا تھا۔

''اے میرے رب۔۔۔ مجھے معاف فرما۔۔۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا اس دنیا میں دے دے۔ میرے اللہ مجھے آخرت میں رسوا نہ کرنا۔ بے شک میں گناہ گار ہوں لیکن تو معاف کرنے والا غفور رحیم ہے۔''

جیلر نے اپنی گھڑی دیکھی۔ اور ہاتھ سے اشارہ کیا جلاد نے لیور کھینچ دیا۔

''اب تم کیا کرو گی؟'' فاطمہ نے صفیہ سے پوچھا۔ جان محمد کو مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ فاطمہ اسکے ساتھ ہی آئی تھی اس نے سارے انتظامات کرائے تھے اور سلامت بھی آیا تھا۔ اس نے گاؤں کے معاملات سنبھال لیے سب کو یہی سمجھایا گیا کہ غلام محمد کا ایک حادثے میں انتقال ہوا ہے۔ فاطمہ کے سوال پر صفیہ نے گہری سانس لی تھی۔

''کیا کروں گی وہ میرے لیے جو ذمہ داریاں چھوڑ گئے ہیں وہ پوری کروں گی۔''

''تم میرے ساتھ ملتان کیوں نہیں چلتیں؟ وہاں عبداللہ اسکول میں تعلیم بھی حاصل کر سکے گا۔'' فاطمہ نے کہا۔

''اس جگہ تو کوسوں دور تک اسکول نہیں ہے۔''

''میں یہ زمین۔۔۔ یہ گھر چھوڑ کر کیسے جاؤں اور پھر میں وہاں کیا کروں گی؟''

''تم میرے ساتھ میری بہن بن کر رہنا۔ عبداللہ میرے بچوں کی طرح ہے۔''

صفیہ نے سوچا اور اسے فاطمہ کی بات معقول لگی تھی۔ اس نے مان لی۔ فاطمہ خوش ہو گئی تھی۔

''اپنی زمین کسی کو کرائے پر دے دو اور اس طرح تمہیں آمدنی بھی ہوتی رہے گی۔''

صفیہ نے زمین سلامت کو سالانہ پٹے پر دے دی۔ اس کا بیٹا علاج کے بعد بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ جب صفیہ اور عبداللہ گاؤں سے جا رہے تھے۔ تو گاؤں کے سارے ہی لوگ انہیں رخصت کرنے آئے تھے۔ صفیہ نے اپنا مکان مقفل کر دیا تھا اور اس کے علاوہ ساری زمین سلامت کو دے دی تھی۔

☆ ☆ ☆

''امی یہاں کون ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''بیٹا کوئی نہ کوئی تو رہتا ہے۔ کسی کے استعمال میں آ گیا تو اچھا ہی ہے۔''

اسی لمحے ایک عمر رسیدہ شخص مسجد کی طرف سے آتا نظر آیا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر چونکا۔

''بیٹی کون ہے تو؟''

''میں صفیہ ہوں بابا! مولوی عبدالصمد کی بیٹی۔ غلام محمد کی بیوی، آپ کون ہیں؟''

''میں مسجد کا پیش امام ہوں حافظ الدین تم بھول گئیں مجھے غلام محمد نے امام بنایا تھا۔ معاف کرنا میں تمہاری اجازت کے بغیر اس مکان میں آ کر رہنے لگا ہوں۔ دراصل کچھ اوباش لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا ان سے خالی کرانے کے بعد گاؤں والوں نے احتیاط کے طور پر مجھے یہاں رکھ چھوڑا۔''

''اچھا کیا بابا! میں اس جگہ برسوں بعد آئی ہوں آپ نے اسے آباد رکھا۔''

''اب میں واپس مسجد چلا جاؤں گا۔''

''نہیں بابا! میں رہنے نہیں بس دیکھنے آئی ہوں۔'' صفیہ جلدی سے بولی۔

''عبداللہ ادھر آؤ یہ مسجد کے پیش امام ہیں۔'' عبداللہ نے ان سے ہاتھ ملایا۔

''امی اب چلیں۔''

''بیٹے آئے ہیں تو کچھ دیر تو ٹھہریں اپنے بچپن کا گھر تو دیکھ لوں۔''

''آپ گھر دیکھیں میں ارد گرد گھوم کر آتا ہوں۔''

عبداللہ کھیتوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور صفیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے سوچا شاید میں نے اسے اس زمین سے دور لے جا کر غلطی کی عبداللہ نے تعلیم حاصل کر لی مگر اپنی زمین کی محبت سے بے نیاز ہو گیا۔ اسے گاؤں کے حوالے سے اپنے بچپن کی کوئی بات یاد نہیں تھی۔ اب اسے گاؤں اور اس زمین سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ عبداللہ نے واپس آنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔

''کہاں چلے گئے تھے؟''

''امی قبرستان گیا تھا وہاں فاتحہ پڑھی پھر نماز پڑھنے چلا گیا۔''

اچانک صفیہ نے محسوس کیا کہ وہ بلاوجہ عبداللہ کے رویئے پر دکھی تھی۔ حالانکہ اسے کرنے والے کام یاد تھے۔ مولوی عبدالصمد کا نواسہ مرے ہوئے لوگوں اور مسجد کو نہیں بھولا تھا۔ یہ کافی تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

☆ ☆ ☆

عذاب دوراں

دروازہ کھلا تو طویل میز کے دونوں طرف بیٹھے لوگوں نے بیک وقت سر گھما کر آنے والے کو دیکھا۔ دروازے سے آگے چند سیڑھیاں تھیں۔ اوپر سے آنے والی تیز روشنی میں اس شخص کا سایہ کچھ زیادہ ہی طویل لگ رہا تھا اس نے چغانما لباس پہن رکھا تھا جس نے اس کے نحیف جسم اور چھوٹے قد کو چھپا لیا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا میز کے سرے تک آیا۔

سب اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھا تو سب بیٹھ گئے۔ میز کے اردگرد بھی تاریکی تھی۔ اسکے عین اوپر

کوروالی لائٹ تھی، جس کی روشنی صرف میز کے درمیان تک محدود تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ہیولے ضرور دیکھ سکتے تھے مگر صورتیں نہیں۔ خاصا پراسرار قسم کا ماحول تھا یعنی جاسوسی ناولوں سے ملتا جلتا ماحول تھا ان ناولوں میں مجرموں کی میٹنگ کرنے کا منظر دکھایا جاتا ہے یہ تقریباً ویسا ہی منظر تھا۔ مگر ایک فرق تھا یہ لوگ مجرم نہیں تھے بلکہ اس معاشرے کے وہ معروف لوگ تھے لوگ جن کے بارے میں قسم کھاتے تھے کہ معاشرے اور عوام کے لیے ان میں سے ہر فرد کی خدمات قومی سطح پر جانی پہچانی تھیں۔ ان میں سے تین عورتیں اور پانچ مرد تھے چھٹا فرد مرد ہی تھا۔ باقی آٹھ افراد کسی حد تک ایک دوسرے سے واقف تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عوام کے سامنے ایک دوسرے سے سرسری واقفیت رکھتے تھے۔ صاف ظاہر تھا ملاقات کا یہ پراسرار طریقہ نویں فرد کو پردہ راز میں رکھنے کے لیے تھا۔

''ساتھیو! ایک بار پھر خوش آمدید۔''

نویں فرد کی سپاٹ سی آواز تاریکی میں گونجی مگر اس کی آواز سے کوئی خوشی یا گرم جوشی کا تاثر نہیں جھلک رہا تھا۔

''آج ہم ایک بار پھر اس جگہ ہیں۔''

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے جناب!'' ایک مردانہ اور خوشامدانہ آواز نے کہا۔

''آپ کی سرپرستی ہمیں حاصل ہے۔ ورنہ ہم کچھ نہیں تھے۔''

''یہ سچ ہے تم سب معمولی حیثیت کے لوگ تھے میں نے تمہیں چنا تمہاری تربیت کی تمہیں وسائل مہیا کیے تمہیں اس مقام تک پہنچایا۔''

''یہ حقیقت ہم پر سورج کی روشنی کی طرح عیاں ہے۔'' اس بار نسوانی آواز نے کہا تھا۔

''آج تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے بلایا گیا ہے۔'' وہ شخص کہتے کہتے رکا۔

''ہم ہمہ تن گوش ہیں۔'' پہلے بولنے والے مرد کی آواز آئی۔

''تم آٹھ افراد اپنی مقبولیت کی انتہا کو پہنچ چکے ہو۔ انفرادی طور پر تم نے جو کام کرنے تھے وہ تم کر چکے ہو۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے لہٰذا میں چاہتا ہوں تم آگے آؤ اب متحد ہو جاؤ متحد تو تم ہو مگر دنیا کے سامنے اس کا اعلان کرو۔ ایک گروپ بناؤ اپنی

طاقت آزماؤ۔ اپنا ٹی وی چینل قائم کرو اپنے اخبارات نکالو۔ سیاسی جماعتوں میں اثر رسوخ بڑھاؤ۔ دانشوروں سے تعلقات بڑھاؤ۔ ان لوگوں سے یک جہتی ظاہر کرو جنہیں عوام چاہتے ہیں۔''

''لیکن جناب! اس اتحاد کو ہمیں کس طرح استعمال کرنا ہوگا؟''

''منور علی! میں ہمیشہ سے تمہاری ذہانت کا قائل رہا ہوں۔''

اس نے ستائشی لہجے میں کہا! ''سچ پوچھو تو میں تمہاری طرف سے اس سوال کا انتظار کر رہا تھا۔ ہاں اسکا ایک مقصد ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ملک کے سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کی تیاری کریں۔ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ اقتدار کے اس کھیل میں کن ہتھکنڈوں سے فتح حاصل کی جاتی ہے۔''

''جناب! گزشتہ بیس پچیس برس سے ہم ان کی اچھی طرح ریہرسل کر چکے ہیں۔'' ایک مرد بولا۔

''تم لوگ اتحاد قائم کرو اور بتدریج اسے سیاسی اتحاد میں تبدیل کر دو۔ دوسری جماعتوں سے سیاست دان اور کارکن توڑو۔ اس کے لیے ہر حربہ استعمال کرو۔ شہروں میں شہری سیاست کے داؤ پیچ استعمال کرو اور گاؤں میں وہاں کے مخصوص سیاسی حربے، وڈیرے، جاگیردار، سردار، خان، پیر اور گدی نشین، یہ ہمارے ووٹ پاور ہیں۔ انہیں جیت لیا تو ملک کا اقتدار اپنے قبضے میں سمجھو۔''

''جناب! آپ کی رہنمائی نے ہمیں جو سکھایا ہے ہم اسے بہترین طریقے سے استعمال کریں گے۔'' ایک مرد نے ادب سے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ ہمیں اپنے اتحاد کو کس نکتے پر رکھنا چاہیے؟''

''تم نے اچھا سوال کیا۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''درحقیقت میں اتنے عرصے سے اسی نکتے پر سوچ رہا تھا ورنہ عین ممکن ہے دو تین سال پہلے ہی تم لوگوں کا اتحاد وجود میں آ چکا ہوتا۔ تم لوگوں کا اتحاد ہوگا۔ عورت کی عزت اور اس کے حقوق پر۔''

''یہ موضوع تو خاصے عرصے سے چل رہا ہے۔'' ایک عورت ہچکچا کر بولی۔

''خود میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ کیا یہ نکتہ مناسب ہوگا؟''

''بالکل مناسب ہوگا۔ اس وقت بین الاقوامی طاقتیں بھی اسی نکتے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس موقع پر جو بھی یہ نعرہ لے کر اٹھے گا وہ ان کی توجہ کا مرکز بن جائے گا اور ان کی توجہ حاصل کرنے کا مطلب جانتی ہو؟''

''جی جناب!'' عورت چہکی۔

''سچی بات یہ ہے کہ اس بات پر میرا دل بہت کڑھتا ہے کہ ہماری عورتوں سے باہر کی این جی اوز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ہمیں ایسے کیس کو نا صرف سامنے لانا ہے بلکہ انہیں قابو میں رکھنا ہوگا۔'' ایک مرد بولا۔

نواں آدمی کچھ دیر خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''ہمیں کیس تلاش نہیں کرنے ہوں گے بلکہ پیدا کرنے ہوں گے۔ اس طرح حالات پوری طرح ہمارے قابو میں رہیں گے۔'' وہ سب ہی چونکے۔

''کیا مطلب جناب۔۔۔؟'' سب کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''وہ لوگ احمق ہوتے ہیں جو حالات کا انتظار کرتے ہیں۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

''عقل مند حالات خود پیدا کر لیتے ہیں۔ ہمیں اپنے کیسز خود پیدا کرنے ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے اپنے ذرائع استعمال کرو۔ یاد رکھو مواقع محدود ہیں اور ان پر جھپٹنے والے زیادہ ہیں سب اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس لیے اپنا کام کرو خود فصل لگاؤ اور خود اس کا پھل کھاؤ۔''

''ہم سمجھ گئے۔ کیا آپ کے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ ہے؟ یا ہم اس گائیڈ لائن پر خود کام کریں گے۔''

''فی الوقت کوئی منصوبہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ میرا کام ہے میرے لیے اس سے زیادہ اہم کام ہیں۔ مجھے بین الاقوامی طور پر تم لوگوں کے لیے حمایت اور پیسے کا بندوبست کرنا ہے۔''

''درست فرمایا جناب والا نے'' ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔

''اگر بین الاقوامی مدد میسر آ گئی تو کام آسان ہو جائے گا۔''

''اسے آسان مت سمجھو۔'' اس بار اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔

''جو لوگ پیسہ دیتے ہیں۔ وہ اس کے استعمال پر بھی نظر رکھتے ہیں جو انہیں دھوکا دیتے ہیں ان کا انجام بہت دردناک ہوتا ہے۔ اس ملک میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں اپنی کاز پر نظر رکھو۔ پیسہ اہم چیز نہیں ہے۔ زندگی اہم چیز ہے۔ جب زندگی نہ رہے گی تو پیسہ کس کام کا۔ تم لوگ ابتدائی کام جلد کر لو۔۔۔ لیکن بہتر ہے پہلے مواقع پیدا کرو اور پھر اس پر متفق ہو جاؤ اس طرح کسی کو ہم پر شک نہیں ہوگا۔''

''کوئی ہم پر بھی شک کر سکتا ہے؟'' ایک عورت نے حیرت سے سوال کیا۔

''لوگوں کو احمق مت سمجھو وہ محض مجبور ہیں۔ سمجھتے ہیں لیکن ان کو مجبوریوں میں الجھا کر رکھو اور اسکے باوجود ان سے پوری طرح ہوشیار رہو جیسے سانپ سردی میں ناکارہ ہو جاتا ہے لیکن نہ تو وہ مرتا ہے اور نہ اس کا زہر ختم ہوتا ہے۔''

''آپ کی باتیں دانشمندانہ ہیں۔'' ایک مرد نے خوشامدی انداز اختیار کیا۔

''بس اب تم لوگ جا کر کام شروع کرو۔ اس کی پروگریس مجھے ایک مہینے میں چاہیے مگر احتیاط کرنا۔ کچا کام مت کرنا مجھے کچے کام سے نفرت ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب! ہم کچا کام کریں گے ہی نہیں۔''

''بس اب جاؤ۔''

وہ کھڑا ہو گیا اور جس طرح آیا تھا اسی طرح اپنے بھاری چغے کو گھسیٹتا ہوا واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

صفیہ ناز ایک معمولی سی سکول ٹیچر تھی۔ لوگوں سے ہمدردی سے پیش آتی تھی۔ کچھ جرائم پیشہ افراد نے اس کے اسکول کی ایک چودہ سالہ طالبہ کو اغوا کر کے اس کی بے حرمتی کی۔ صفیہ نے اس معاملے پر احتجاج کیا اور لڑکی کو تھانے لے جا کر ملزمان کے خلاف رپورٹ لکھوانی چاہی مگر لڑکی تھانیدار کو دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ اس نے چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا کہ اس کی آبروریزی کرنیوالوں میں یہ تھانیدار بھی شامل تھا۔ اس وقت تھانے میں چند صحافی موجود تھے۔ صفیہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ معاملہ ان کے سامنے پیش

کر دیا۔ اگلے روز اخبار میں صفیہ اور اس لڑکی کی تصویر مع سارے واقعے کی تفصیلات کے شائع ہو گئی۔

تھانیدار اور اس کے ساتھیوں نے صفیہ اور لڑکی کے گھر والوں کو دھمکانا چاہا لیکن اخبارات کی وجہ سے معاملہ اوپر تک چلا گیا تھا۔ وہ سب گرفتار ہوئے اور ہر طرف صفیہ کی واہ واہ ہو گئی۔ صفیہ نے اعلان کیا کہ وہ سرکاری نوکری چھوڑ کر عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرے گی اور انہیں مردوں کی دسترس سے بچائے گی۔ اس نے ایک این جی او قائم کی۔ اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے اور عورتوں کے حقوق پر سیمینار کرانے لگی ایک سال کے اندر اس نے اتنی ترقی کی کہ وہ راولپنڈی کے ایک گندے سے محلے سے اٹھ کر اسلام آباد کی ایک پوش کوٹھی میں جا پہنچی۔ اس کوٹھی میں اس نے اپنی این جی او کا دفتر بنایا اور اس نے اعلان کیا کہ اسے بیرون ملک سے کوئی امداد نہیں ملتی ہے۔ یہ چند غیر مقامی حضرات ہیں جو اس کی این جی او کے سارے اخراجات پورے کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

بیگم نزہت ریاض الدین معروف سماجی شخصیت اور غریبوں کی ہمدرد مشہور تھی۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے اس نے محض بیس برس کی عمر میں ریاض الدین سے شادی کی جو اس وقت بھی بائون سال کا تھا لیکن بے پناہ پھیلے کاروبار کا مالک تھا۔ اس کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ نزہت کا تعلق بے حد غریب خاندان سے تھا اور وہ ریاض الدین کے دفتر میں ایک معمولی سی جاب کرتی تھی۔ ایک بار اسے دفتر سے جاتے ہوئے ریاض الدین نے گھر ڈراپ کر دیا تھا۔ موسم خراب تھا اور پبلک ٹرانسپورٹ بند تھی۔ اس آدھے گھنٹے کے سفر میں نزہت اس کے دل میں اتر گئی اور جب ریاض الدین نے پیش قدمی کی تو اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ یہی پیش قدمی ریاض الدین کو مہنگی پڑی اور ایک دن یہ سن کر سب حیران رہ گئے کہ ریاض الدین نے نزہت سے شادی کر لی ہے۔

اس شادی کے بعد نزہت نے سب سے پہلے تو پہلی بیگم کی چھٹی کروائی۔ ریاض الدین نے اسے طلاق دے دی اور ایک سال بعد جب نزہت نے اس کے بیٹے کو جنم دیا تو وہ مکمل طور پر اس کا غلام بن گیا۔ اب بیگم نزہت اس کے کاروبار کی مالک تھی۔ بنیادی طور پر

وہ ذہین عورت تھی۔ اس نے اعلیٰ طبقے کی دوسری عورتوں کے بجائے مختلف روش اپنا لی اور غریبوں کی چند ہمدرد خواتین کے ساتھ ایک سوشل سرکل کی بنیاد رکھی جس کا مقصد غریب عورتوں کی مدد کرنا تھا۔

سوشل سرکل بے سہارا اور بے روزگار عورتوں کے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دیتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وقتاً فوقتاً تقریبات منعقد کی جاتی تھیں جن میں پریس کے سامنے یہ بیگمات غریب عورتوں میں سلائی مشین اور وظائف تقسیم کرتی تھیں۔ اگرچہ بعض صحافی شک کرتے تھے کہ یہ سب محض اعزازی طور پر دیا جاتا ہے۔ مگر اکثر صحافی ان تقریبات کے بعد ہونے والی ڈنر پارٹی میں شرکت کر کے جو مرغن کھانا اپنے معدوں میں اتارتے تھے بعد میں اس کے خمار میں رپورٹنگ کرتے جس میں سوائے تعریفوں کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ جاننے کی زحمت نہیں کرتے تھے کہ جن عورتوں کو یہ سب دیا جاتا ہے ان میں کتنی واقعی اس کی مستحق ہوتی ہیں۔

رفتہ رفتہ سوشل سرکل کی ایک ساکھ بنتی چلی گئی اور بیگم نزہت کو ایک سکہ بند سماجی رہنما تسلیم کر لیا گیا۔

☆ ☆ ☆

منیر احمد معروف وکیل اور انسانی حقوق کا علم بردار تھا۔ بہاولپور کے بے حد غریب گاؤں سے اس نے میٹرک میں پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ فاقوں سے اس کا ذہن کند ہونے کے بجائے تیز ہو گیا تھا۔ تعلیم نے اسے شعور دیا اور شعور نے اسے معاشرے میں پھیلی ناانصافیوں کی طرف متوجہ کیا لیکن ان ناانصافیوں کا اطلاق اس نے صرف اپنی ذات پر کیا۔ اس سے پہلے کہ کڑھ کڑھ کر اسے ٹی بی ہو جاتی ایک نامعلوم شخص نے اس کی اعلیٰ تعلیم کا ذمہ لے لیا۔ یہی نہیں اسے ہر مہینے اس شخص کی جانب سے اتنا مل جاتا تھا کہ وہ خاصے آسودہ انداز میں زندگی بسر کرتا تھا۔

اس نے ایل ایل بی کیا پھر قانون میں ماسٹر کیا۔ چند سال تک پریکٹس کرنے کے بعد اس نے انسانی حقوق کے بارے میں ایک ادارہ بنایا۔ اس ادارے کے تحت ان افراد کو مدد پہنچائی جانے لگی جو عدالتوں میں وکیل کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ جن پر ظلم ہوتا تھا

ان کو انصاف فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ منیر احمد ہر سال ایک رپورٹ بنا کر انسانی حقوق کے اداروں کو روانہ کرتا تھا جس میں معاشرتی ناانصافیوں کی داستانیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ رپورٹیں انسانی حقوق کے بین الاقوامی جرنلز میں شائع کرتے تھے مگر ان کے قاری نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے منیر احمد کی ان رپورٹس کا ملک میں اتنا چرچا نہیں تھا جتنا کہ بیرون ملک تھا۔ اس کی ساکھ تھی اور کسی معاملے میں اس کی رائے کو بعض حلقوں میں حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ملک میں اس کی خدا ترسی کی دھوم تھی۔ مجرم تک اس کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کے لیے پولیس انتظامیہ سے بے دریغ لڑ جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

صابر انصاری ایک تاجر تھا لیکن اس کی شہرت سماجی خدمات کی وجہ سے تھی۔ اس نے لاوارث بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا اور بے شمار غریب گھرانے اس کی طرف سے دیئے گئے وظیفے پر گزارہ کرتے تھے۔ صابر انصاری یہ سب بے حد خوش دلی سے کرتا تھا لیکن اس کی خاموشی کے باوجود چند متجسس صحافی اس کا کھوج لگا کر اسے مناسب الفاظ میں اخبار میں چھاپ دیتے تھے۔ یتیم خانے کے بعد اس نے ایک ٹرسٹ اسپتال بنایا جس کے دروازے غریب لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اس نے ایک لنگر خانہ بھی جاری کیا تھا جہاں کوئی بھی فرد ایک وقت کا کھانا کبھی بھی کھا سکتا تھا اور اس سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اس لنگر خانے سے روزانہ ہی ہزاروں افراد کھانا کھاتے تھے۔

صابر انصاری کی ان سماجی خدمات کی وجہ سے اس کی معاشرے میں عزت تھی۔ خاص طور سے اس وجہ سے بھی کہ اس نے اپنی ان خدمات کو سیاست کے پلیٹ فارم پر کبھی کیش نہیں کرایا تھا۔ نہ ہی اس نے حکومت یا اس طرح کے امداد دینے والے اداروں سے مدد لی تھی۔ وہ خود ان خدمات کے لیے رقم فراہم کرتا تھا۔ باقی عام آدمی کے عطیات سے یہ کام چل رہا تھا۔ اس کے استعمال میں معمولی سی کار تھی اور وہ لباس میں بھی زیادہ اہتمام نہیں کرتا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بیٹے تھے جو دوسرے دولت مندوں کی اولاد کے برعکس ملک میں ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

کوئی پچیس برس پہلے جب صابر انصاری معمولی درجے کا تاجر تھا تب اس نے

سماجی خدمات شروع کیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے کاروبار نے بھی دن دگنی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ معمولی تاجر سے درآمد برآمد کرنے والا ایک بزنس مین بن گیا۔ درجنوں ممالک سے اس کا مال آتا تھا یا جاتا تھا۔ بیرون ملک اس کے نام کی ایک ساکھ تھا۔ جب دوسرے ملکوں کے تاجر صابر انصاری سے سودا کرتے تھے تو انہیں یقین ہوتا کہ خریدے جانے والے مال میں کوئی نقص نہیں ہوگا اور آج تک ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچی تھی لوگ اس کی بے پناہ ترقی کو اللہ کا انعام قرار دیتے تھے کیونکہ وہ اپنے مال سے لوگوں کی خدمت کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ابراہیم آذر ایک معروف صحافی تھا۔ اس کے تجزیے اور رپورٹس عوام و خواص میں یکساں مقبول تھیں۔ کئی بڑی اشاعت رکھنے والے اخبارات اس کے قلم سے نکلے حروف کے منتظر رہا کرتے تھے۔ سرکاری اور نجی تقریبات میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ ملک میں نجی چینلز آنے سے اس نے ایک ٹی وی چینل بھی جوائن کر لیا تھا۔ جس پر اس کی طرف سے پیش کیا جانے والا حالات حاضرہ کا پروگرام عوام میں مقبولیت کے لحاظ سے چند گنے چنے پروگراموں میں شامل تھا۔ ابراہیم آذر نے یہ ترقی محض بیس سال میں کی تھی۔ اس سے پہلے کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔

بی اے کر کے وہ جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا۔ لکھنے کا چسکا اسے میٹرک کے زمانے میں ہی لگ گیا تھا۔ اس نے بچوں کے رسالوں میں لکھا۔ افسانے لکھے، شاعری بھی کی لیکن اسے چھپنے کا موقع کم ملا تھا۔ اس نے بعض رپورٹس بھی لکھیں مگر وہ بھی شائع نہیں ہوئیں وہ بے حد مایوس تھا۔ ایسے میں ایک نامعلوم شخص اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا۔ اس نے ابراہیم کو پیشکش کی کہ وہ آگے تعلیم حاصل کرے تو وہ اس کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ٹاپ کرے۔ ابراہیم نے یہ شرط قبول کر لی۔ اسے یونیورسٹی میں جرنلزم میں داخلہ مل گیا اور اس نے پہلے سمیسٹر میں ریکارڈ نمبر حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا تھا ان دنوں لائبریریاں اس کا گھر اور کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔

دو سال بعد اس نے اس شان سے صحافت میں ماسٹر کیا کہ یونیورسٹی کی تاریخ

میں کبھی کسی طالب علم نے اس شعبے میں اتنے نمبر نہیں لیے تھے۔ تعلیم کے دوران میں ہی وہ بڑے اخبارات اور میگزین میں چھپنے لگا تھا۔ بے پناہ مطالعے نے اس کی سوچوں اور تحریروں کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ حالات سے نیا تجزیہ اخذ کرتا تھا اور اسے اتنے انوکھے پیرائے میں پیش کرتا کہ پڑھنے والا اس سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا ماسٹر کرنے کے بعد اس نے ایک انگریزی اخبار میں کچھ دن جاب بھی کی لیکن پھر اپنا راستہ الگ کر لیا۔ وہ کسی کا ملازم نہیں تھا اس کی تحریریں اور تجزیے مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے کے حریف اور مختلف طبقے کی نمائندگی کرنے والے تھے مگر ابراہیم آذر کو سب میں پذیرائی حاصل تھی اس کی تحریر کا ایک ایک حرف سنجیدگی سے پڑھا جاتا تھا ایسا بھی ہوا کہ وزیراعظم یا صدر صبح سب سے پہلے اس کا کالم پڑھتے تھے۔

آغاز میں اس کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ بکتا ہے مگر رفتہ رفتہ اس کے سادہ سے طرز حیات نے سب کے منہ بند کر دیئے۔ وہ ایک عام سے فلیٹ میں رہتا تھا پہلے اس کے پاس موٹر سائیکل تھی پھر اس نے چھوٹی کار لے لی اور اب تک اسی میں گزارہ کر رہا تھا۔ اس کے فلیٹ میں برائے نام فرنیچر تھا۔ اس نے فرش پر قالین بچھا رکھا تھا اسی پر سوتا، کھاتا، مطالعہ کرتا اور لکھتا تھا۔ ملاقاتی آتے وہ اس پر بیٹھا کرتے البتہ لوگ آجاتے تو پریشانی ہوتی تھی۔ اسے کتابیں ہٹا کر ایک طرف کرنا پڑتی تھیں۔ اس کا حلقہ احباب بھی محدود تھا۔ شادی اس نے اپنی زندگی سے خارج کر دی تھی۔ جب کوئی اس بارے میں پوچھتا تو اس کا یہ جواب ہوتا تھا کہ اس نے قلم سے شادی کر لی ہے۔ البتہ مہینے میں ایک دن وہ پورے چوبیس گھنٹے کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اشفاق احسن سیاست دان تھا۔ لیکن اس نے کبھی الیکشن نہیں لڑا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ پروفیسر تھا ایک مقامی کالج میں وہ طلباء کو عمرانیات پڑھاتا تھا۔ اسکے کئی شاگرد سیاست اور ریاست میں اعلیٰ مقام پر تھے۔ اشفاق احسن سیاست برائے خدمت کے نظریے پر یقین رکھتا تھا اور بڑی شدت سے اس کا پرچار کرتا تھا۔ جب بھی کوئی الیکشن آتا وہ اپنے پسندیدہ امیدوار کی حمایت میں میدان میں کود پڑتا تھا اور اس کا حمایت یافتہ بھی

نہیں ہارا تھا۔

چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے اردگرد کے قابل طالب علم بھی اس کالج کا رخ کرتے تھے ان میں زیادہ تر اونچے گھرانوں کے لڑکے ہوا کرتے تھے۔ ان طلبا کی مدد سے پروفیسر اشفاق احسن کا اثر رسوخ بڑھتا تھا وہ بڑے گھرانوں کے طلبا پر خاص توجہ دیتا تھا اکثر انہیں اپنے گھر بلا لیا کرتا تھا اور اسی بیٹھک میں ان کی ذہنی تربیت کیا کرتا تھا۔ یہ اس کی علمیت اور اس سے زیادہ بے غرضی سے متاثر تھے۔ پروفیسر نے کبھی ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کسی اور نے ایسی کوشش کی تو پروفیسر نے اسے اتنی سختی سے منع کیا کہ آئندہ اسے جرات نہ ہو سکی۔

اس نے اپنا کردار ایسا رکھا تھا کہ کوئی اس پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حمایت بھی صاف ستھرے لوگوں کی کرتا تھا اگر دوران انتخابی مہم اسے امیدوار کے بارے میں ذرا سا شک ہو جاتا تو وہ اپنی حمایت واپس لینے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ لوگ اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے وہ جس کی طرف اشارہ کرتا بے جھجک اسے ووٹ دے دیا کرتے تھے۔

مقامی الیکشن میں برادریوں والے پروفیسر کے گھر کے چکر لگاتے تھے تو ملکی سطح پر ہونے والے الیکشن کے لیے سیاسی پارٹیاں اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھیں اور پروفیسر ان سے صاف ستھرے امیدوار کی شرط لگا دیتا۔ کم سے کم تین صوبائی اسمبلی اور ایک قومی اسمبلی کی نشست پر اس کا اثر و رسوخ مسلم تھا۔ جب ناظمین کا دور آیا تو ناؤن ناظم پروفیسر کے آگے پیچھے گھومتا تھا۔ اس انتخاب میں اسے کامیابی پروفیسر کی وجہ سے ملی تھی ورنہ کوئی اسے جانتا تک نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر جس کام کے لیے کہتا تھا وہ لازماً ہوتا تھا۔ اس کے دور میں شہر کو گیس ملی۔ سیوریج کا نظام بہتر ہوا اور کچے راستے پکے ہو گئے۔ کئی نئے اسکول اور لڑکیوں کے لیے نیا کالج بھی قائم ہوا تھا۔ مجموعی طور پر عوام اس سے مطمئن تھے اس کی کارکردگی سابقہ سیاست دانوں سے بدرجہا بہتر تھی۔

گزشتہ بائیس سال میں پروفیسر نے اس علاقے میں کچھ اس قسم کا اثر رسوخ حاصل کر لیا تھا کہ اس کا ایک اشارہ انتظامیہ اور مقامی حاکمین کے لیے حکم کا درجہ

رکھتا تھا۔ کالج میں اس کی مقبولیت تمام اساتذہ کی مجموعی مقبولیت سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے خار کھاتے تھے مگر اس کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک بار چند اساتذہ کے کہنے پر پروفیسر کے خلاف چارج شیٹ لگائی کہ وہ طلباء میں سیاسی نظریات کا بیج بو رہا ہے اس بات پر طلباء نے اتنا ہنگامہ کیا کہ کالج کے پرنسپل کو اپنی چارج شیٹ واپس لینی پڑی تھی۔ مگر جب بات اعلیٰ احکام تک پہنچی تو پرنسپل کا تبادلہ کر دیا گیا۔ نیا آنے والا پرنسپل روز اول سے پروفیسر کا مرید تھا۔ پروفیسر احسن چاہتا تو خود بھی پرنسپل بن سکتا تھا اس کے پاس سنیارٹی تھی اور قابلیت تھی وہ محض عہدے اور تنخواہ میں ترقی کے لیے اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

منور علی جینئس تھا لیکن کاروباری جینئس۔ اس نے ایم بی اے کے بعد ایک فرم میں جونیئر ایگزیکٹو کی پوسٹ سے آغاز کیا۔ وہ خالی ہاتھ اور ڈھیر سارے عزائم کیساتھ آیا تھا۔ تین سال بعد اس نے اپنی پہلی فرم کی بنیاد رکھی۔ اس نے سرمایہ کاری حاصل کرنے کے لیے نئے طریقے رائج کیے۔ کاروباری دنیا میں نئے تجربات کیے اس نے اپنے ملازمین پر اعتماد کیا ان کو اچھی تنخواہیں ہی نہیں فیصلے کا اختیار بھی دیا۔ اختیارات کی اس عدم مرکزیت نے کاروبار کی رفتار بے پناہ تیز کر دی۔ اسے کاروبار میں زیادہ سر نہیں کھپانا پڑتا تھا۔ اس کے بجائے وہ نئے آئیڈیاز پر کام کرتا تھا۔ اس نے ان صنعتوں کی طرف توجہ دی جو ملک میں نہیں تھیں۔ اس نے کئی درجن نئی صنعتیں قائم کیں۔ غیر ملکی فرموں سے اس نے ٹیکنالوجی ٹرانسفر کے معاہدے کیے۔ اس کی ان خدمات کو قومی سطح پر سراہا گیا۔ نئی آنے والی حکومت نے اسے اپنا صنعتی مشیر مقرر کیا تھا۔ منور علی کی شہرت محض ایک ذہین کاروباری کی نہیں تھی۔ بلکہ وہ صنعتی اصلاح کار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس نے اپنے پاس کام کرنے والے افراد کی بہبود کا خیال رکھا تھا۔ وہ ان کو انفرادی طور پر مطمئن کرتا تھا اور انہیں اپنا اصل سرمایہ قرار دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل و جان سے اس کے لیے کام کرتے تھے۔ اس کے کاروبار کو اپنا سمجھ کر چلاتے تھے اور اس کا بھرپور معاوضہ پاتے تھے۔ اڈاس پالیسی کی وجہ سے منور علی نے بعض اوقات نقصانات بھی اٹھائے تھے لیکن اس سے حاصل ہونے والے فوائد اس سے

کہیں زیادہ تھے۔

منور علی نے ایک اسٹڈی گروپ بنایا جو ملک میں جاری صنعتی اور کاروباری پالیسیوں اور ان پر عمل درآمد پر تنقیدی نظر رکھتا تھا اس نے کمپنیز ایگزیکٹو کی تربیت کے لئے ایک مینجمنٹ اسکول بنایا تھا۔ اس نے ایک نیوز چینل بھی کھولا تھا۔ جو تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کی کوریج کرتا تھا۔ منور علی کا یہ آئیڈیا بھی کامیاب رہا تھا۔ اس نئے ٹی وی نے چند مہینے میں ریکارڈ بزنس حاصل کر لیا تھا۔ شروع میں خسارے کا سودا نظر آنے والا یہ چینل سنہری کامیابی میں بدل گیا تھا۔ منور علی نے نجی بینکوں کی اجازت ملتے ہی ایک بینک قائم کیا تھا جو تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ اس کا شمار چند تیزی سے پھیلنے والے بینکوں میں ہوتا تھا۔ یہ بینک غریب افراد اور طلبا کو بلاسود اور نرم شرائط پر قرض دیتا تھا اور بیشتر صورتوں میں اسے قرض حسنہ میں بدل دیتا تھا۔

گیارہ ستمبر کے بعد باہر سے آنے والے بے تحاشہ پیسے کو منور علی نے سلیقے سے اپنی کمپنیوں میں استعمال کیا تھا۔ بچت اسکیموں سے نکالا جانے والا بیشتر سرمایہ اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے زمین اور جائیداد میں لگایا جا رہا تھا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ زمینوں اور جائیدادوں کی ان بڑھتی قیمتوں کے پیچھے منور علی کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ملک میں بے تحاشہ پیسہ آ رہا ہے اور زرمبادلہ کی فراوانی کی وجہ سے حکومت کو بھی ملکی بچتوں کی اتنی ضرورت نہیں رہی تھی لہذا اس نے بچت اسکیموں پر منافع کی شرح گرا دی تھی۔ لوگوں کے پاس رقم تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس رقم کو کہاں لگائیں۔

منور علی نے اپنے کاروباری ایجنٹس ہر شعبے میں چھوڑ دیے تھے۔ اس کے ایجنٹس پراپرٹی کے شعبے میں بھی تھے۔ اس نے انہیں متحرک کیا اور شہر میں ہر علاقے میں پراپرٹی خریدنا شروع کر دی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ بارگیننگ نہیں کر رہا تھا۔ منور علی نے اس مقصد کے لیے اپنی رقم استعمال نہیں کی تھی۔ بینکوں سے رقم لی اور عوام کا پیسہ بھی اس کے پاس بے حساب تھا سرمایہ کار اس خریداری سے چونک گئے اور انہوں نے بھی پراپرٹی خریدنا شروع کر دی۔ وقفے وقفے سے خریدی ہوئی پراپرٹی فروخت بھی کرتا رہا لیکن اس کا زیادہ

زور خریداری پر تھا۔

اگلے دو سال تک منور علی پراپرٹی خریدتا رہا۔ اس نے اپنا اور زیادہ تر دوسروں کا سرمایہ اس کام کے لیے استعمال کیا۔ اس نے اپنے بنک میں جمع لوگوں کی رقم بھی بغیر کسی نفع کی ادائیگی کے پراپرٹی میں استعمال کی تھی جس کی قیمتیں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں تھیں منور علی نے خریداری کے بجائے فروخت شروع کر دی اور بے اندازہ منافع کمایا اور اس کے کے چند قریبی رازداروں کے سوا کسی کو اس دھندے کا علم نہ تھا اس نے دو سال میں جتنی رقم لگائی تھی اس سے کئی گناہ زیادہ کما لیا تھا منور علی نے کمائی ہوئی رقم سے سستے ڈالرز اور پاؤنڈز خرید کر یہ سرمایہ بیرون ملک منتقل کر دیا تھا۔ جب لوگوں کی رقم ادا کرنے کا وقت آیا تو اسٹاک مارکیٹ کریش ہوگئی۔ راتوں رات پراپرٹی کی قیمت گری تھی۔ نقصان میں وہ لوگ رہے جنہوں نے آخر میں پراپرٹی خریدی تھی۔

☆ ☆ ☆

بشیراں بی بی سترہ سال کی صحت مند اور قبول صورت لڑکی تھی۔ بہاول نگر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے بڈھے ماں باپ اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی تھی۔ بھائی اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ غربت کے باوجود یہ کنبہ پرسکون اور عزت سے گزر بسر کر رہا تھا۔ رفیق محمد کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ اس کا بیٹا عاشق محمد بھی کم عمری سے کام کرنے لگ گیا تھا۔ بشیراں مویشی چرانے جاتی تھی۔ چنائی کے موسم میں کھیتوں میں کپاس چننے کا کام کرتی تھی۔ اس طرح یہ گھر سارے سال دو وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ بشیراں کا بھائی عاشق جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ یہ عمر ایسی ہوتی ہے۔ کہ جب ہر چہرہ حسین لگتا ہے۔

عاشق کو بھاگ بھری اچھی لگتی تھی۔ وہ عمر میں اس سے بڑی تھی اور اسے اہمیت بھی نہیں دیتی تھی۔ ایک دو بار عاشق نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ بھاگ بھری نے اسے دھمکی دی کہ آئندہ اس نے تنگ کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے بڑوں سے اس کی شکایت کر دے گی۔ مگر اس عمر میں آدمی انجام سے کم ہی ڈرتا ہے۔ عاشق نے اپنی روش نہ چھوڑی۔ ایک روز بھاگ بھری نہر سے کپڑے دھو کر آ رہی تھی کہ عاشق راستے میں مل گیا۔

اس روز بھاگ بھری کا موڈ خراب تھا۔ عاشق نے اس سے بات کی تو اس نے کپڑے پھینک دیئے اور چلانے لگی۔ منٹ سے کم وقت میں وہاں کئی افراد آ گئے تھے۔ ان میں بھاگ بھری کا بڑا بھائی بختیار بھی تھا۔ اسے دیکھ کر عاشق فرار ہو گیا اتنا ڈرا کہ گھر جانے کے بجائے اپنی خالہ کے پاس بھاگ گیا جو نزدیکی گاؤں میں رہتی تھی۔

بختیار کچھ بدمعاش قسم کا شخص تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی ایسے لوگوں میں تھا ایک زمانے میں بھارت سے سمگل کر کے لاتا تھا۔ لیکن سرحد پر کشیدگی کے بعد اسے اپنا یہ کام ترک کرنا پڑا تھا۔ بھاگ بھری کی چیخیں سن کر وہ بھاگ کر وہاں پہنچا اور عاشق کو فرار ہوتے دیکھ کر اسے یہ جاننے کی دشواری پیش نہیں آئی کہ کیا بات ہوئی تھی۔ بھاگ بھری کو گھر کی طرف جانے کا حکم دے کر وہ بپھرا ہوا عاشق کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس کے ساتھ اس کے چند دوست بھی ہو لیے تھے۔ چند منٹ بعد طوفان رفیق کے گھر میں داخل ہوا اور وہاں پر بشیراں اور اس کی ماں تھی وہ ان پر پل پڑے اور مار مار کر عاشق کا پتا پوچھنے لگے۔ جب بشیراں اور اس کی ماں نے لاعلمی ظاہر کی تو بختیار نے بشیراں کا بازو پکڑ لیا۔

''ہم اسے لے جا رہے ہیں۔ جب تیرا بیٹا آئے گا تو اسے چھوڑ دیں گے۔''

''میری بیٹی کو چھوڑ دو۔''

بشیراں کی ماں تڑپ کر آگے آئی۔ ایک مشٹنڈے نے اسے دھکا دیا۔ وہ جا کر گری تو اس کا سر چارپائی کے کونے سے لگا۔ وہ سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی اور پانچوں افراد تڑپتی مچلتی بشیراں کو کھینچ کر لے گئے۔ گاؤں والے دم بہ خود سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مگر کسی نے اتنی ہمت نہیں کی تھی کہ وہ بختیار اور اس کے ساتھیوں کا راستہ روک لیتا۔ گاؤں کے باہر ایک ڈیرے تک لائے ڈیرے کو فصلوں کی کٹائی کے دنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بشیراں پر ان کے شیطانی عزائم راستے میں واضح ہو گئے تھے۔ جب وہ فحش ترین الفاظ کے ساتھ اسے بتا رہے تھے کہ ڈیرے پر لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ بشیراں راستے بھر ان کے سامنے گڑگڑاتی رہی۔ اللہ رسول ﷺ کے واسطے دیتی رہی کہ وہ اسے بھائی کے کئے کی سزا نہ دیں۔ اس کی فریادیں بدمست قہقہوں کے درمیان گم ہوتی رہیں۔ دو بار اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اسے پکڑ لیا۔

ڈیرے پر گزرے دو گھنٹوں نے بشیراں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی چیخ وپکار، واسطے اور مزاحمت ان درندوں کے آگے ریت کا بند ثابت ہوئے۔ جب اس کے ماں باپ کے آنے پر پانچوں بھاگے تو اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ سوائے سوختہ جان کے جسے وہ ختم کرنے کا سوچ رہی تھی۔ روتے دھوتے ماں باپ اسے گھر لے آئے وہ غریب تھے کس سے فریاد کرتے۔ مجرم گاؤں کے بڑے بااثر لوگ تھے وہ ان کے خلاف تھانے جانے کا بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ مگر بشیراں سوچ رہی تھی اس نے ماں باپ سے کہا۔

''اماں ابا! میرے ساتھ چلو میں انکے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھواؤں گی۔''

''ہاں جو بچی کھچی عزت رہ گئی ہے اسے بھی برباد کر دے۔'' باپ بولا۔

''ابا اب کون سی عزت رہ گئی ہے؟'' بشیراں کے لہجے میں زہر تھا۔

''اگر تم نہیں جا رہے تو مت جاؤ۔ میں آپے چلی جاتی ہوں۔''

بشیراں کے عزم نے ماں باپ کو بھی اسکا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا وہ تھانے جا پہنچے۔ مگر مجرم پہلے ہی اپنا کام کر چکے تھے۔ تھانے والوں سے معاملہ طے ہو گیا تھا کہ انہوں نے ساری کہانی سننے کے بعد بھی ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا۔

''اوئے! تیرے پاس کوئی ثبوت ہے رپورٹ کروانے کے لیے گواہ اور ثبوت چاہیے۔''

''گواہ اور ثبوت آپ تلاش کریں۔ میں جو کہہ رہی ہوں مجھ پر ظلم ہوا ہے۔''

''جاؤ بی بی جاؤ! ایسے رپورٹ درج نہیں ہوتی۔''

''اگر تم لوگ نہیں کرو گے میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔ لیکن اس ظلم کے خلاف خاموش نہیں رہوں گی۔'' بشیراں بی بی نے دھمکی دی۔

جس کے جواب میں اسے دھکے دے کر تھانے سے باہر نکال دیا تھا۔ اگلے روز بشیراں روانہ ہوئی اور اس نے بہاول نگر کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایس پی سے ملنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اس کی شنوائی نہیں ہوئی تیسرے دن وہ پریس کانفرنس کے سامنے ایک گتے پر لکھی ہوئی فریاد لیے کھڑی تھی اور اس شام تک ملک کا ہر اخبار اس کی خبر لگانے کی تیاری

کر رہا تھا۔ اسے پریس کلب میں ٹھہرایا گیا تھا اگلے روز بشیراں کی تصویروں کیساتھ اس پر ظلم کی روداد شائع ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''میرا نام نزہت ریاض الدین ہے۔'' اس خوبصورت عورت نے بشیراں سے اپنا تعارف کروایا۔

''میں نے ایک این جی او بنائی ہے جو عورتوں کی مدد کرتی ہے۔ جن پر ظلم ہوا ہو۔''

''یہ کیا ہوتی ہے جی؟'' بشیراں نے سادگی سے پوچھا۔ گزشتہ چند دن میں ہونے والی پزیرائی کے سبب اسکے دل و دماغ پر چھائی وحشت اور پریشانی کم ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی یہ دنیا انصاف سے خالی نہیں ہے۔ کتنے بڑے لوگ اس کی حمایت کر رہے تھے اس کی تصویریں اخبار میں شائع ہوئیں تھیں۔ ان چند روز میں لوگوں نے اسے ہزاروں روپے دیئے تھے ایک بڑے سرکاری افسر اس سے ملنے بھی اسے لے جانے کے لیے آئے تھے۔ مگر صحافیوں کی وجہ سے انہیں واپس جانا پڑا تھا۔ انہوں نے بشیراں بی بی کو سرکار کی تحویل میں دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''چیف سیکرٹری صاحب! آپ صرف اس لڑکی کو انصاف دلوا دیں۔ آپ کی یہی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔'' ایک اخبار کے مدیر نے تلخی سے کہا تھا۔

صحافیوں نے بشیراں بی بی کے لیے ایک وکیل کیا تھا۔ جس نے علاقے کے تھانے اور صوبائی حکومت کے خلاف مقدمے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ جو بشیراں بی بی کو انصاف دلانے میں سستی کر رہے تھے اس دوران بیگم نزہت نے بشیراں سے ملاقات کر کے اسے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

''ہم انصاف کے حصول میں تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ لیکن تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کیا یہ مجھے جانے کی اجازت دیں گے۔ انہوں نے تو اتنے بڑے سرکاری افسر کو بھی منع کر دیا تھا۔''

''میں سرکاری افسر نہیں ہوں اور یہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ تم پہلی لڑکی نہیں ہو جس کی مدد کر رہی ہوں اس سے پہلے بھی کئی اور مظلوموں کو انصاف دلا چکی ہوں۔ تم ان کی فکر نہ کرو اگر مجھ پر اعتماد ہے تو میرے ساتھ چلو۔''

بشیراں بی بی نے سوچ کر حامی بھر لی اور اس کے ساتھ بیگم نزحت اس کی انچارج بن گئی۔ اس نے سب سے پہلے اس کے وکیل کو فارغ کیا جو صوبائی حکومت کے خلاف رپورٹ داخل کرنے جا رہا تھا۔ بیگم نزحت نے ایک اور وکیل کیا۔ اس نے پولیس کو فریق بناتے ہوئے پانچ ملزموں کے خلاف مقدمہ درج کر دیا اور مقدمہ براہ راست ہائی کورٹ میں گیا تھا۔ بشیراں بی بی کو بیگم نزحت نے اپنی کوٹھی کے ایک حصے میں رکھا تھا اور اس سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیگم نزحت نے اس سے اکیلے ملنے پر پابندی لگا دی تھی حتیٰ کہ جو صحافی اس کی حمایت میں مہم چلا رہے تھے۔ وہ بھی نزحت کی اجازت کے بغیر اس سے نہیں مل سکتے تھے۔ بیگم نزحت نے خود وار لکھومت میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں خاص طور سے غیر ملکی میڈیا کو بلایا گیا تھا اور نزحت بیگم نے بشیراں کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ اس نے ملک میں عورتوں پر مظالم اور زبوں حالی کا رونا روتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بشیراں بی بی کے ساتھ زیادتی کرنے والے افراد کو فوری طور پر گرفتار کر کے انہیں سخت سزا دے۔ ورنہ بیگم نزحت کی این جی او اور دوسری انسانی تنظیموں سے مل کر باقاعدہ تحریک چلائے گی۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے ملک کی تعزیراتی قوانین کو مغربی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کی بات کی تھی اس پر ایک مقامی صحافی نے سوال کیا۔

''اگر پاکستان میں مغربی لاز نافذ کر دیئے گئے تو بشیراں بی بی کے ساتھ زیادتی کرنے والے بہ آسانی پیرول پر رہا ہو جائیں گے یا پھر زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی سزا پائیں گے۔ یہ تو شرعی قوانین ہیں جو عورت پر زیادتی کے ملزم کو سخت سزا دیتے ہیں کیا مغربی قوانین کے نفاذ سے عورتوں کے خلاف جرائم میں تیزی نہیں آ جائے گی؟''

اس سوال سے بیگم نزحت گڑبڑا گئیں تھیں اور پھر اس نے یہ سوال گول کر دیا اور ایک غیر ملکی صحافی کی طرف متوجہ ہو گئی جو کہ اس سے سوال کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اس

نے فوراً کہا۔

''کیا عورتوں پر مظالم اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ اس ملک میں اب تک قدامت پرستی ہے؟''

''اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔'' بیگم نزحت محتاط انداز میں بولی۔

''لیکن آہستہ آہستہ ہم تبدیلی لا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب اس قسم کے واقعات کم ہوں۔''

ایک اور مقامی صحافی نے سوال کیا۔

''کیا وجہ ہے کہ آپ عدالت کے ذریعے بشیراں بی بی کو انصاف دلانے کے بجائے پریس کانفرنس کر کے اس کیس کی تشہیر کر رہی ہیں؟''

''تشہیر سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا دوسری ہزاروں عورتوں کی طرح یہ بے چاری ظلم سہہ کر خاموشی سے بیٹھ جاتی آپ کا مطلب کیا ہے؟'' بیگم نزحت اس صحافی پر برس پڑی تھی۔

''مطلب یہ بیگم صاحبہ! کہ آپ کچھ بھی کر لیں انصاف بشیراں بی بی کو عدالت سے ہی ملے گا پھر آپ عدالت کی بجائے اس بے چاری کو ادھر ادھر کیوں لیے پھر رہی ہیں؟''

''تاکہ اس ملک میں اور ساری دنیا میں لوگوں کو پتا چلے کہ مرد بے چاری عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور ظلم کی انتہا یہ ہے کہ اسے انصاف حاصل کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔''

''انصاف ہمارے ملک میں مردوں کو بھی میسر نہیں۔ تو پھر عورت ہی کو انصاف دلانے کی اتنی تگ و دو کیوں؟'' مقامی صحافیوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ایک صحافی نے پوچھا۔

''بشیراں بی بی کے ساتھ جو افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے یہ ہمارے ملک کا معاملہ ہے۔ پھر آپ نے غیر ملکی صحافیوں کو کیوں بلایا ہے؟''

''تاکہ دنیا والوں کو بھی پتا چلے۔''

پریس کانفرنس اس کی توقع کے برعکس بدمزگی پر ختم ہوگئی۔اس کانفرنس کے بعد سماجی موضوعات پر لکھنے والی فاطمہ احسان نے بشیراں بی بی سے ایک خصوصی انٹرویو کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

نوشین احمد سکول میں پڑھاتی تھی۔میٹرک کے بعد اسے سکول میں ملازمت کرنا پڑی تھی۔اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں اور ماں کی آنکھیں سلائی کر کے کمزور پڑ گئی تھیں۔گھر کو مالی حالات سے بچانے کے لیے نوشین کو سکول میں ملازمت کرنا پڑی تھی۔پرائیویٹ سکول تھا۔جہاں فیسوں کے نام پر بچوں کے والدین کی کھال کھینچی جاتی تھی لیکن ٹیچرز کو بقدر اشک بلبل معاوضہ دیا جاتا تھا۔نوشین کو بھی صرف بارہ سو روپے ملتے تھے۔نوشین ایک خوبصورت لڑکی تھی اور اسے بھی وہی مسائل درپیش تھے جو عام طور سے متوسط طبقے کی لڑکیوں کو جاب کے دوران پیش آتے ہیں۔اسکول میں دو مرد ٹیچرز اس پر مہربان تھے تو محلے کے دو تین لڑکے بھی آتے جاتے اس پر آوازیں کسنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔شروع شروع میں وہ اس صورت حال سے خاصی پریشان رہی لیکن رفتہ رفتہ وہ ان باتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔اس نے توجہ دینا چھوڑ دیا یا اس کے نزدیک بھونکنے والے کتے تھے۔

محلے کے چند اوباش جوان خاص طور پر نوشین کو تنگ کرتے تھے۔سکول سے آتے ہوئے اس پر آوازیں کستے تھے وہ بیچاری روز راستہ بدل کر گھر آتی مگر وہ کہیں نہ کہیں ٹکرا جاتے تھے۔احسان الٰہی،سلمان اور نوشاد نامی یہ نوجوان بے تحاشا سانڈ تھے۔خود ان کے گھر والے ان سے تنگ تھے۔چھوٹے موٹے جرائم اور چھین جھپٹ کر گزارا کرتے تھے ایک روز وہ گلی کے کونے میں موجود تھے۔نوشین وہاں سے گزری تو انہوں نے اس پر آوازیں کسیں اور اپنے بے ہودہ جملوں پر خود قہقہے لگائے۔ایک طرف ایک جوان العمر شخص کھڑا یہ غور انہیں دیکھ رہا تھا وہ ان کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔

"دوستو! اب تک عملی طور پر بھی کچھ کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟" نوشاد نے غرا کر کہا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔اس کا چھ فٹ سے نکلتا قد دوسروں کو مرعوب کر دیتا تھا مگر یہ شخص ذرا بھی ہراساں نہیں ہوا۔

مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ لڑکی سے زبانی بات چیت چل رہی ہے یا۔۔۔۔"

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اگر چل بھی رہی ہے تو تمہیں کیا؟"

"ہاں مجھے کیا۔۔۔لیکن بات یہ ہے کہ مجھے بے عملی سے نفرت ہے۔آدمی میں کاٹنے کی ہمت ہونی چاہیے۔بھونکنے والے کتے کسی کو پریشان نہیں کر سکتے۔یاد رکھو۔۔۔گوشت کاٹنے والے کتے کے منہ میں آتا ہے۔"

"تو۔۔۔ہمیں کتا کہہ رہا ہے؟" اس بار سلمان غرایا۔

"غصے میں مت آؤ ایسا کرو میرے ساتھ چلو،میں دکھاتا ہوں عملی طور پر کام کیسے کرتے ہیں۔"

اسکی شخصیت میں نا جانے کیا بات تھی یا یہ اس کا اعتماد تھا کہ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑے ذرا دور اس کی کار کھڑی تھی جو خاصی شاندار تھی۔وہ تینوں عقبی نشست پر بیٹھ گئے۔نصف گھنٹے بعد اس نے کار سفاری پارک کی ساتھ والی سڑک پر موڑ دی۔ذرا دور ایک لڑکی جا رہی تھی۔شاید کالج آ رہی تھی۔اس نے کار لڑکی کے پاس روکی اور اتر کا پھرتی سے لڑکی کا راستہ روک لیا۔اس نے پستول نکال کر لڑکی پر تان لیا۔

"چلو کار میں ورنہ یہیں گولی مار دوں گا۔"

لڑکی اتنی سہمی ہوئی تھی کہ اس نے بلا چون وچراں اس کی ہدایت پر عمل کیا اور فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔وہ تینوں بھی اس کے ساتھ دم بہ خود تھے۔اس نے پھرتی سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کار آگے بڑھا دی۔

"ادھر میرا ایک بنگلہ ہے اسے وہاں لے چلیں گے۔"

"خدا کے لیے مجھے جانے دو۔" لڑکی سسکی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"واقعی کچھ نہیں بگاڑا ہے۔" اس نے اچانک کار روک دی۔

"جاؤ تم۔۔۔"

لڑکی دہنگ رہ گئی پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور یکدم اتر کر بھاگی۔جیسے

اس کے تعاقب میں آدم خور شیر ہوں۔اس کے اترتے ہی اس شخص نے کار آگے بڑھادی تھی وہ تینوں پھر مارے حیرت کے پاگل ہونے لگے۔

''یہ کیا کیا۔۔۔تم نے ہاتھ آئے شکار کو جانے دیا۔''

''شکار کی کمی نہیں ہے۔'' وہ ہنسا

''بس شکاری میں ہمت ہونی چاہیے۔کہو تو کل سچ مچ اٹھالیں؟''

''تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' احسان الٰہی نے سوال کیا۔

''یہ میری تفریح ہے۔'' وہ بولا۔

''مجھے اپنی جرات آزمانے میں مزہ آتا ہے۔سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے آدمی ایک بار لمبا ہاتھ مارلے۔تم تینوں نہ جانے کب سے اس لڑکی پر رال ٹپکا رہے ہو لیکن اتنی جرات نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ ہی پکڑ سکو۔''

''جرات کی بات نہ کر استاد!'' سلمان بولا۔

وہ اس سے مرعوب ہو گئے تھے۔اس لیے سلمان نے استاد کہا۔

''بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی اس سے آگے بڑھنے کو سوچا ہی نہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔میں جانتا ہوں باتوں اور خیالوں میں تم نے اس کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا ہوگا۔مگر سچ مچ کرنے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہے۔''

''ہم میں حوصلہ ہے استاد!'' احسان بھی بھڑک گیا۔

''اچھا یہ بات ہے تو اٹھالو اسے۔۔۔۔میں تمہارے ہر کام آؤں گا لیکن اسے اٹھانے کا کام تم نے ہی کرنا ہے۔''

''استاد! ہم اسے اٹھا سکتے ہیں اصل مسئلہ یہی تھا کہ رکھیں گے کہاں؟''

''جگہ میں دوں گا۔ایک نئی بلڈنگ میں فلیٹ ہے نیچے کا فلیٹ ہے۔پوری عمارت خالی پڑی ہے اس کا چوکیدار بھی غائب رہتا ہے۔''

''جگہ تو تم دے رہے ہو پر اسے وہاں تک لائیں گے کیسے؟''

''تم میں سے کسی کو کار چلانی آتی ہے؟''

''مجھے آتی ہے۔'' نوشاد بولا وہ موٹر مکینک کا کام کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے میں کار لا کر دوں گا۔باقی کام تمہارا ہے لڑکی بے ہوش کر کے لے جانا ورنہ مسئلہ ہوگا۔''

تینوں کے اندر ایک جوش سا بھر گیا تھا۔وہ شخص اگلے روز ملنے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔اس کے جانے کے بعد ان کے اندر اندیشے سر اٹھانے لگے نوشین کے تصور نے انہیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

☆☆☆☆☆

نوشین اسکول سے ایک بجے گھر آنے کی بجائے شام چھ بجے ایک رکشے سے گھر کے سامنے اتری تو دس نگاہیں اس پڑی تھیں۔اس وقت سارے محلے کو معلوم ہو چکا تھا کہ نوشین اسکول سے روانہ ہونے کے باوجود گھر نہیں پہنچی۔اس کا تباہ حلیہ چادر میں بھی صاف نظر آرہا تھا۔ذرا دیر میں اس کا گھر بربادی کے نوحوں سے گونج اٹھا تھا۔محلے کی عورتیں ہمدردی کے بہانے ٹوہ لینے آرہی تھیں۔نوشین کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بہنو! ہمیں معاف کرو۔ابھی ہم کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

رات دس بجے صابر انصاری علاقے کے ناظم کے ساتھ نوشین کے گھر پہنچا اور اسکے اصرار پر نوشین مجرموں کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے لیے تیار ہو گئی۔صابر انصاری ان کے علاقے میں ہی رہتا تھا۔اگلے روز اخبارات میں حوا کی بیٹی پر بیتنے والی قیامت زور و شور سے شائع ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر ریحانہ جتوئی پنوں عاقل میں مرکز صحت پر تعینات تھی وہ از خود اس علاقے میں آئی تھی کیونکہ یہاں پر صحت کی صورت حال خراب تھی۔ایک سال میں ڈاکٹر ریحانہ نے محنت سے اس مرکز صحت کو ہسپتال میں تبدیل کر دیا تھا۔یہاں پر ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کی مشینیں بھی آگئی تھیں۔ایک مرد ڈاکٹر اس کے ساتھ تھا۔زچگی کے علاوہ ریحانہ چھوٹے موٹے آپریشن خود کر لیا کرتی تھی۔علاقے کے لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ریحانہ جتوئی کا تعلق ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال گھرانے سے تھا۔اس کا باپ عبداللطیف جتوئی سندھ

یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا۔ فیکٹری قریب ہونے کی وجہ سے اردگرد کے علاقوں کو صحت اور دوسری سہولیات مل رہی تھیں۔ ڈاکٹر ریحانہ کو بھی ان کی وجہ سے کئی سہولتیں دستیاب تھیں۔ جب کوئی ایمرجنسی آتی تو وہ مریض کو فیکٹری کے اسپتال بھیج دیتی تھی۔ ایک روز ایک مریضہ آئی تھی وہ درد سے تڑپ رہی تھی ریحانہ نے اندازہ لگایا کہ اس کے پتے میں تکلیف ہے۔ اس نے فیکٹری ہسپتال فون کر کے ان سے ایمبولینس بھیجنے کی درخواست کی تھی۔

ایمبولینس کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان بھی آیا تھا۔ اس نے ریحانہ سے اپنا تعارف سلیم عباس کہہ کر کرایا۔ مریضہ کے لیے اس کی سرگرمی نے ریحانہ کو متاثر کیا تھا۔ تین دن بعد وہ مریضہ کو چھوڑنے آیا تو اس نے پھر ڈاکٹر ریحانہ سے ملاقات کی تھی۔ ان دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ دو ملاقاتیں ان کے لیے کسی بدقسمتی کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی ہیں۔ ڈاکٹر ریحانہ کو اسپتال کے نزدیک ہی ایک بنگلہ ملا تھا اس بنگلے میں وہ اپنی ملازمہ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس رات موسم خراب تھا۔ دو دن سے بارش جاری تھی اور اوپر سے حسب معمول بجلی بھی چلی گئی۔ ریحانہ موم بتی جلا کر رات دیر تک پڑھتی رہتی تھی پھر اسے نیند آنے لگی رات کسی وقت اسے لگا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ کسی نے اس منہ پر ہاتھ رکھا تھا اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ آخر میں اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور پھر انتہائی بے بسی کی حالت میں اس کے ساتھ زیادتی کی گئی۔ وہ بے بسی سے تڑپ رہی تھی۔ اس پر ظلم کرنے والے چپ تھے جیسے انہیں خطرہ تھا اگر وہ بولے تو پہچان لیے جائیں گے۔ پھر نا جانے کیسے ڈاکٹر ریحانہ کی آنکھ سے پٹی ذرا ہٹ گئی تھی اور اس نے ایک شخص کو دیکھ لیا تھا۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر ریحانہ کو لگا جیسے وہ سلیم تھا۔ مگر وہ بھولا سا نوجوان اس کردار کا مالک ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دہشت اور بربریت کا یہ کھیل صبح تک جاری رہا اور پھر وہ لوگ چلے گئے۔ ریحانہ نیم مردہ ہو رہی تھی جب اس کی ملازمہ نے اسے کھولا۔

غم سے نڈھال ریحانہ نے سب سے پہلے اپنے والد کو فون کیا اور وہ فوری طور پر اسکے پاس چلے آئے۔ پروفیسر عبداللطیف غصے سے بھرے ہوئے تھے انہوں نے ریحانہ سے اس زیادتی کے خلاف تھانے میں رپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر تھانے والے اس

فیکٹری کا سن کر ہچکچانے لگے۔ اس پروفیسر صاحب نے فیکٹری کے ایم ڈی سے بات کی اور وہ فوری طور پر تھانے آیا۔ اسے فون پر ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے پروفیسر کو سمجھایا کہ وہ ایف آئی آر درج کرانے میں جلدی نہ کریں۔ پہلے ہمیں اس معاملے پر تفتیش کرنے دیں۔

''تا کہ آپ لوگ اپنے آدمی کے خلاف ثبوت مٹا دو۔''

''ایسا نہیں ہے پروفیسر صاحب! ریحانہ میری بھی بیٹی ہے اور میں اپنی بیٹی کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا مگر مجھے اس معاملے سے سازش کی بو آ رہی ہے پلیز آپ مجھ پر اعتماد کریں۔''

پروفیسر صاحب بادل ناخواستہ راضی ہوئے تھے۔ سب سے پہلے اسپتال لے جا کر اس کا طبی معائنہ ہوا گرچہ اس میں خاصی تاخیر ہوئی تھی لیکن رپورٹ سے واضح تھا کہ ریحانہ کے ساتھ کئی افراد نے زیادتی کی ہے۔ ایک دن پروفیسر صاحب نے سلیم کو ملزم نامزد کرتے ہوئے ایف آئی آر درج کرا دی تھی اور اگلے روز اس قصے کو اخبارات آب وتاب شائع کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مختلف حلقوں اور گروپس کی جانب سے یہ سوال بار بار اٹھایا جا رہا تھا کہ آخر اس روشن خیال اور جدید حکومت کے دور میں عورتوں کے خلاف جرائم میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے۔ عورت چاہے شہر میں ہو یا دیہات میں ۔۔۔ وہ ظلم کا نشانہ بن رہی تھی اور سب سے اہم بات تھی کہ اسے انصاف نہیں مل رہا تھا۔ اخبارات اور ٹی وی ایک آواز ہو کر اس مسئلے پر بول رہے تھے اور اس ہنگامے میں کسی کی توجہ اس طرف نہیں جا رہی تھی کہ انصاف کے حصول کی کوشش ہی نہیں کی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ شخص بے حد خوش تھا وہ کہہ رہا تھا۔

''اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ان واقعات کو کئی سمتوں میں استعمال کرنا ہوگا۔ ایک تو ہم حکومت پر دباؤ بڑھا سکتے ہیں۔ دوسرے ہم ملکی قوانین کو غیر موثر ثابت کر سکتے ہیں۔ اپنے غیر ملکی سرپرستوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہم ان واقعات کو ملک میں انتہا پسندی اور بنیاد پرستی سے جوڑ سکتے ہیں لیکن ایک خاص خیال رکھنا بھول کر

بھی ان واقعات کو فیوڈل ازم سے نہ جوڑنا ورنہ اس ملک کا سب سے طاقت ور حصہ ہمارا مخالف بن جائے گا۔"

"میں سمجھتی ہوں جناب!" بیگم نزہت نے کہا تھا۔

"ہم نے اب تک جو بھی واقعات منتخب کیے ہیں ان میں سے کسی میں بھی فیوڈل طبقہ فریق نہیں ہے۔ یہ سارے عمومی طبقے سے واقعات ہیں اور ہم انہیں اس طرح سامنے لا رہے ہیں کہ عورت کی مظلومیت واضح ہو۔"

"گڈ۔۔۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں اب ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ عدالتوں میں جانے کے بجائے میڈیا میں ان کیسز کو اچھالتے رہیں۔ تم دیکھو گی اس طرح ہمیں بہت جلد بین الاقوامی مدد ملنے لگے گی۔"

"جناب! ہم نے مشترکہ گروپ بنانے کا ابتدائی کام مکمل کر لیا ہے اسی ہفتے دارالحکومت میں ان تین عورتوں کے ساتھ ہم اس کا اعلان کریں گے۔"

"حکومت کے خلاف تند و تیز لہجہ اپناؤ لیکن کوشش کرو کہ تصادم کی نوبت نہ آئے۔"

"میری ایک تجویز ہے جناب!" صفیہ ناز نے کہا۔

"اگر ہم ملک کی اہم شخصیات کے غیر ملکی دوروں کے دوران میں ان عورتوں کو بھی وہاں بھیج دیں تو اس حکومت پر دباؤ بھی پڑے گا اور ہمارے خلاف کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے گی۔"

"یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔" اس شخص نے تائید کی۔

"لیکن اس کے لیے غیر ملکی تعاون لازمی ہونا چاہیے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں بیرون ملک ہمارے اتنے تعلقات ہیں کہ ہم کسی قسم کے پروگرام بھی ارینج کر سکتے ہیں۔" منور علی نے اعتماد سے کہا۔

"سب بے حد ذہین ہیں جناب!" صابر انصاری نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

پروفیسر اشفاق احسن ایک طرف کسی قدر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ شخص اسکی طرف متوجہ ہوا۔

"پروفیسر! تم خاموش کیوں ہو۔؟"

"جناب! میرے خیال میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ حربے ناموزوں ہیں سیاست کو سیاست کی طرح چلانا چاہیے۔"

وہ ہنسا

"پروفیسر۔۔۔۔! کتابی سیاست کی بات مت کرو آج کل سیاست جنگ ہے جس میں سب جائز ہے۔"

"جناب! سیاست ہمیشہ سے جنگ رہی ہے اور اس میں سب جائز ہوتا ہے لیکن ان عورتوں کے کیسز کو ہم ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور یہ بات لوگوں کو پسند نہیں ہے۔"

"تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" بیگم نزہت نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ ان عورتوں کو انصاف دلایا جائے تو یہ سارے معاملے کا اینڈ ہوگا۔ اس معاملے کو زیادہ دیر تک چلانے کا مطلب ہے کہ ہم دلچسپی لینے والوں کو بور کر دیں۔"

بیگم نزہت حقارت سے ہنسی۔

"پروفیسر! لگتا ہے پڑھا پڑھا کے ذہن آپ کا کتاب میں بند ہو گیا ہے۔ ہمیں اس مسئلے کو حل نہیں کرنا۔ حل شدہ مسئلے لوگ بھول جاتے ہیں۔ غیر حل شدہ مسائل لوگوں کو تادیر یاد رہتے ہیں۔"

"بیگم صاحبہ! میں نے صرف آپ کو رائے دی ہے۔ اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو اسے مسترد کر دیں۔" پروفیسر نرمی سے بولا۔

"پروفیسر ایک لحاظ سے ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وہ شخص سوچ کر بولا۔

"ہمیں مسئلے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اسے حل کرنے کی بھی کوشش کرنا چاہیے۔ یعنی عدالتی کاروائی بھی چلتی رہے۔ اب اس میں جتنی سستی آئے اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔"

"میں سمجھ گئی جناب!" بیگم نزہت مستعدی سے بولی۔

''میں تم لوگوں سے خوش ہوں لیکن سارے کام ہوشیاری سے کرنے ہیں۔''

☆ ☆ ☆

راحیل نوشین کا خالہ زاد بھائی تھا۔اس سانحے کے بعد اس نے نوشین سے مل کر اسے تسلی دی تھی۔لیکن جلد نوشین گھر سے دور چلی گئی تھی۔خالہ نے بتایا کہ کچھ لوگ اسے دھمکیاں دے رہے ہیں اس لیے اس نے بیگم نزہت کے پاس پناہ لے لی ہے تینوں مجرم احسان، سلمان اور نوشاد مفرور تھے۔پولیس انکی تلاش میں تھی۔تب نوشین کو دھمکیاں کون دے رہا تھا۔ان تینوں مجرموں کے وسائل ایسے نہیں تھے کہ وہ پولیس سے بچتے ہوئے نوشین کو دھمکاتے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔انکے خلاف ایف آئی آر درج ہو چکی تھی اور ان کے خلاف نوشین کا بیان عدالت میں ریکارڈ پر آ چکا تھا۔

راحیل نوشین کے لیے اپنے دل میں پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا لیکن اس کی ماں نوشین کی خالہ ہونے کے باوجود اسے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھی۔وہ کسی ایسے گھر سے بہو لانا چاہتی تھی جہاں سے ڈھیر سارا جہیز مل سکے۔جب کہ اسکی بہن کے گھر کھاتے کے لالے پڑے تھے۔وہ اسے جہیز کہاں سے دیتی۔راحیل ایم بی اے کر چکا تھا اور ایک فرم میں جاب کر رہا تھا وہ ماں کے خیالات سے اختلاف رکھتا تھا۔لیکن کھل کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔پھر جب نوشین کے اغوا کا حادثہ ہوا اور اس نے اپنے مجرموں کی گرفتاری کا مطالبہ پریس کانفرنس میں کیا تو خالہ نے اسے بے حیا قرار دے کر اپنی بہن سے تعلقات توڑنے کا اعلان کر دیا۔راحیل دبی زبان میں بولا۔

''امی! اس میں بے چاری نوشین اور خالہ کا کیا قصور ہے۔ان کیساتھ ظلم ہوا ہے۔''

''چپ۔۔۔۔خالہ کے سگے! مجھے اس لڑکی کے لچھن پہلے ہی اچھے نظر نہیں آتے تھے۔اس نے کوئی عاشق پالا ہوگا جس نے اسے دھوکا دیا۔'' ماں نے دانت پیس کر کہا۔

''امی پلیز! نوشین ایسی نہیں ہے۔میں اور آپ بچپن سے اسے دیکھتے آ رہے ہیں۔اگر آپ کسی مالدار گھرانے سے بہو لانا چاہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک بے گناہ لڑکی پر اس قسم کی الزام تراشی کریں۔''

''بیٹا جی۔۔۔۔!'' ماں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''تم جو خواب دیکھ رہے ہو اسے بھول جاؤ پہلے بھی نوشین اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی تھی اب تو یہ ناممکن ہے۔ہم جانتے بوجھتے گندگی کی یہ پوٹ اپنے گھر میں نہیں لا سکتے۔''

ماں کی باتوں نے اسے دل برداشتہ کر دیا تھا مگر نوشین کی معصومیت پر اس کا اعتماد قائم تھا۔اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا اور نوشین آمادہ ہوئی تو اس سے شادی بھی کر لے گا۔بے شک اس کی ماں نہ مانے۔راحیل نے دفتر سے اٹھنے کے بعد بیگم نزہت کی کوٹھی کا رخ کیا۔اس وقت اتفاق سے وہاں پریس کانفرنس جاری تھی جس میں نوشین کوئی درجن دیں بار اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہی تھی۔رپورٹرز اس سے سوال کر رہے تھے راحیل کو بھی رپورٹر سمجھا گیا اور کسی نے اسے روکا نہیں تھا وہ پچھلی صف میں کھڑے ہو کر پریس کانفرنس سننے لگا۔رپورٹرز نوشین سے سوال کر رہے تھے ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر نے پوچھا۔

''مس نوشین! کیا آپ سمجھتی ہیں کہ موجودہ معاشرہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو چکا ہے اور اس کے اندر تبدیلی کی ضرورت ہے؟''

''بالکل ہے۔'' نوشین نے سوچے بغیر کہا۔

''جب تک ہم فرسودہ روایات سے پیچھا نہیں چھڑواتے عورتوں پر اسی طرح ظلم ہوتا رہے گا۔''

راحیل نے محسوس کیا کہ نوشین رٹے رٹائے جواب دے رہی تھی۔وہ اس سے اچھی طرح واقف تھا۔نوشین اتنی ذہنی استعداد نہیں رکھتی تھی۔کہ وہ اس قسم کے معاملات پر رائے دے سکتی۔یہ الفاظ اسے یقیناً کسی نے سکھائے تھے۔لیکن کس نے؟

یہ بات واضح تھی راحیل محسوس کر رہا تھا کہ بیگم نزہت اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی تھی۔وہ پڑھا لکھا باشعور نوجوان تھا۔اپنی نصابی کتب سے ہٹ کر بھی اس کا مطالعہ وسیع تھا۔وہ حالات حاضرہ پر بھی نظر رکھتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وطن عزیز اس وقت کن تبدیلیوں سے گزر رہا ہے ملکی اور بین الاقوامی افق پر اس ملک کو ابھرنے سے روکنے کی کتنی کوشش کی جا رہی تھی۔ملک کا امیج برباد کرنے کے لیے چن چن کر عمومی واقعات کو

خصوصی بنا کر عوام اور دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ نوشین اور اس طرح کی دوسری خواتین کے ساتھ ظلم ہوا ہے مگر انہیں انصاف دلانے کے بجائے اس طرح مظلومیت کا سمبل بنا کر ان کی جگہ جگہ نمائش کی جا رہی تھی اور اس کی آڑ میں ملک اور مذہب کے خلاف باتیں کی جا رہی تھیں۔ حالانکہ یہ چند غلط روافراد کی خباثت تھی۔ دنیا کے ہر ملک میں ایسا ہوتا ہے ہمارے ملک میں اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مغربی ممالک اس کی ایک بہترین مثال ہیں جہاں خواتین کے خلاف دنیا میں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں مگر اس قسم کے کیسز کو کبھی میڈیا اور دنیا کے سامنے اس طرح سے نہیں اچھالا جاتا تھا مغربی دنیا میں بھی عورتوں کے حالات بہتر نہیں وہاں بھی انہیں ہراساں کیا جاتا ہے۔ تشدد اور جنسی تشدد عام ہے لیکن وہاں پر انہیں معمول کے طریقے سے انصاف دیا جاتا ہے اور یہاں اسے میڈیا ٹرائل بنایا جا رہا تھا جو نہ صرف معاشرے کے لیے درست تھا اور نہ ہی عورتوں کے حق میں تھا۔ آئے دن کتنے ہی ایسے واقعات پیش آتے تھے یعنی میڈیا ٹرائل سے ان لوگوں پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا جو عورتوں کے خلاف جرم کر رہے تھے۔

راحیل خاموشی سے پریس کانفرنس سنتا رہا۔ اچانک نوشین کی نظر اس پر پڑی راحیل نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرا گئی تھی کچھ دیر بعد پریس کانفرنس ختم ہو گئی اور نوشین بیگم نزحت کیساتھ جانے لگی۔ راحیل اس کے نزدیک جا پہنچا۔

''نوشین میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کک۔۔۔۔کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ گھبرا گئی۔

''ایسے نہیں اکیلے میں۔۔۔اور تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو میں تمہارا کزن ہوں؟''

''شاید تم ایک بار پہلے بھی نوشی سے ملنے آئے تھے؟'' بیگم نزحت نے اسے غور سے دیکھا۔

''اور آپ نے مجھے نوشین سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی؟'' راحیل نے تلخی سے کہا۔

''کیا یہ قیدی ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ یہ سب میں اس کے تحفظ کے لیے کر رہی ہوں۔''

''آپ نوشین سے تصدیق کر سکتی ہیں کہ میں اس کا کزن ہوں۔''

''اس وقت نوشی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یہ سو رہی تھی۔''

''بہرحال اب آپ کو یقین آ گیا ہے کہ میں اس کزن ہوں تو کیا میں اس سے اکیلے میں مل سکتا ہوں؟''

''کیا کزن دشمن نہیں ہو سکتے؟'' بیگم نزحت عجیب سے لہجے میں بولی۔

''ہمارے ملکوں میں عورتوں کے خلاف سب سے زیادہ جرم ان کے نزدیک کے رشتے دار کرتے ہیں۔''

''ہمارے ہاں ایسے نہیں ہوتا۔'' راحیل تلخی سے بولا۔

''کیا آپ مجھے نوشین سے بات کرنے کا موقع دیں گی؟''

بیگم نزحت وہاں سے چلی گئی۔ کمرے میں راحیل اور نوشین اکیلے رہ گئے تھے۔

''نوشین یہ سب کیا ہے؟ تم گھر سے کیوں چلی آئیں؟''

''میں وہاں کیسے رہتی وہ مجھے دھمکیاں دے رہے تھے۔''

''کون دھمکیاں دے رہا تھا وہ تینوں کتے تو پولیس سے چھپتے پھر رہے ہیں۔''

''بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ میری جان کو خطرہ ہے وہ لوگ بہت طاقتور ہیں اور پولیس بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔''

''یہ غلط ہے پولیس سچ مچ سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ تم ڈی ایس پی شاہد انکل کو جانتی ہو۔ ان کا بیٹا میرا دوست ہے میری وجہ سے وہ اس کیس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے۔ انکل نے بتایا ہے کہ پولیس ہر ممکنہ جگہ پر چھاپے مار چکی ہے۔ لگتا ہے وہ اس شہر سے بھاگے ہوئے ہیں۔ یا کسی جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے۔''

''بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ وہ میری تلاش میں ہیں اگر میں واپس چلی گئی تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔''

''مجھے لگتا ہے یہ بیگم صاحبہ تمہیں اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہیں۔'' نوشین نے

اسے ناگواری سے دیکھا۔

''اور مجھے لگتا ہے کہ تم ان سے چڑتے ہو حالانکہ اس موقع پر وہی ایک ہستی ہیں جنہوں نے مجھے سہارا دیا۔ جب کہ میرے اپنوں نے مجھے دھتکار دیا تھا۔'' راحیل شرمندہ ہوگیا کیونکہ سب رشتہ داروں کا رویہ اس کے ساتھ خراب تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا تم مجھے ان میں سے سمجھتی ہوں؟''

''نہیں ورنہ تم میرے پاس کیوں آتے۔۔۔ یہ بتاؤ کہ امی اور بہنیں کیسی ہیں؟ مجھے ان کی بہت یاد آتی ہے۔''

''خالہ، افشین اور نورین ٹھیک ہیں۔ مگر خالہ تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔'' نوشین تلخی سے مسکرائی۔

''امی سے کہنا اب میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کے لیے وہ پریشان ہوں سوائے جان کے۔۔۔ اور وہ اس جگہ محفوظ ہے۔''

''ایسا مت کہو۔۔۔ ہمارے لیے تم آج بھی ویسی ہو معصوم اور پاکباز۔''

''تمہارے اور امی کے لیے۔۔۔ دنیا مجھے کیا سمجھتی ہے اپنی امی کے بارے میں سوچا ان کے کیا خیالات ہیں میرے بارے میں؟'' راحیل اس کی بات پر شرمندہ ہوگیا۔

''دوسروں کا میں کیا کہوں۔۔۔ لیکن نوشین! تمہارا تعلق تو مجھ سے ہے۔''

نوشین پر راحیل کی پسندیدگی چھپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی زبان سے نہیں کہا تھا مگر اس کی نگاہوں نے بارہا نوشین سے بہت کچھ کہا تھا۔

''راحیل! اس تعلق کو بھول جائیں۔ کیونکہ تمہارے اور میرے تسلیم کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ دنیا اور خاص طور پر ہمارے اپنے اس تعلق کو نہیں مانیں گے۔''

''نوشین! مجھے صرف تمہاری پرواہ ہے میں کسی اور کی پرواہ نہیں کرتا۔'' راحیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''نہیں۔۔۔ اب اس کا فائدہ نہیں ہے اور میرے سامنے ایک طویل راستہ ہے مجھے اپنے لیے انصاف حاصل کرنا ہے۔''

''نوشین! اس پر بھی میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔'' راحیل نے التجا کی۔

''پلیز ابھی مجھے مجبور نہ کریں۔ میں کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکتی۔۔۔ پلیز''

نوشین یکدم اٹھی اور سسکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ راحیل اسے آوازیں دیتا رہ گیا پھر تھکے ہارے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک سوٹ پوش اندر آیا۔

''مسٹر! اب تم جاسکتے ہو اور ہاں آئندہ بغیر اجازت کے نوشین بی بی سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔''

''کیوں؟'' راحیل کو غصہ آگیا۔

''وہ میری کزن ہے میری خالہ کی بیٹی ہے۔''

''خالہ کی بیٹی ہے تو خالہ کے گھر جا کر ملو۔ یہ تمہاری خالہ کا گھر نہیں ہے۔'' اس شخص نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

راحیل اپنا غصہ ضبط کرتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔ وہ سرخی مائل بالوں اور کسی قدر کھردرے نقوش والا نوجوان تھا۔ درمیان کی مانگ اس پر جچی تھی لیکن اس وقت غصے نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سوٹ پوش کی دھمکی کے باوجود اس نے کئی بار نوشین سے ملنے کی کوشش کی اور ہر بار اسے ناکامی ہوئی تھی۔ نوشین آئے دن میڈیا کی زینت بنتی تھی لیکن اپنے پیاروں سے دور تھی۔ خالہ بھی اس سے کئی بار ملنے گئی لیکن ہر بار ملاقات نہیں ہوسکی۔ صرف دو دفعہ بڑی مشکل سے ملی تھی۔ آخری بار اس نے ماں سے کہا کہ وہ اس سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ جب تک وہ تین شیطان آزاد ہیں وہ غیر محفوظ ہے۔

''کیا تجھے اپنی ماں سے بھی خطرہ ہے؟''

''ماں! وہ آپ کے پیچھے بھی آسکتے ہیں میرا مشورہ ہے افشین اور نورین کو لے کر کہیں اور چلی جاؤ۔''

بوڑھی عورت بے بسی سے مسکرائی تھی۔ ''یہ غریب عورت اس جگہ بیٹھی ہے تو بڑی بات ہے اب اور کہاں جائے۔'' اس پر نوشین نے خاصی بڑی رقم ماں کے حوالے کی تھی۔

''اسے لے لو مکان بیچ دو اور کسی دوسری جگہ مکان لے لو میں ہر مہینے پیسے دوں گی۔'' ماں کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔

''اتنے پیسے۔۔۔کہاں سے آئے تیرے پاس؟''

''اس کی فکر مت کرو ماں! بیگم صاحبہ بہت اچھی عورت ہیں۔ان کے پاس میں محفوظ اور خوش ہوں۔تمہارے پاس ہوتی تو اب تک دنیا مجھے طعنے دے دے کر مار چکی ہوتی۔''

''خدا اس بیگم کو خوش رکھے لیکن میری بچی! میں تجھے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی میں تجھ سے ملنے آتی ہوں تو کوئی مجھے ملنے نہیں دیتا۔''

''امی میں ہر بار یہاں نہیں ہوتی زیادہ تر میں دوسرے شہروں میں ہوتی ہوں۔''

''پھر بھی اتنی رقم۔۔۔''اس نے ہزار کے نوٹوں والی ان گنی گڈیوں کو دیکھا۔

''امی یہ سب میری محنت کی کمائی ہے۔جب میں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس آؤں گی تو آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔''نوشین نے اصرار کر کے ماں کو واپس کر دیا اور دوبارہ آنے سے منع کیا۔

''آپ کوئی موبائل فون لے لیں پھر میں آپ سے رابطہ کروں گی مگر آپ ادھر مت آیئے گا۔''

''اگر میں فون لے بھی لوں تب بھی تجھ سے کیسے رابطہ کروں گی؟''نوشین نے اسے ایک پرچی پر نمبر لکھ کر دیا۔

''اس پر بات کر لیجیے گا اور ہاں کسی کو بتایئے گا مت اگر کسی وجہ سے کال کرنی ہو تو کسی پی سی او سے کال کر لیجیے گا۔''

''میں نہیں بتاؤں گی میری بچی! ایسا کب تک چلے گا؟''

''امی! مجبوری ہے۔جب تک ان تین درندوں کو سزا نہیں ہو جاتی میں باہر نہیں جا سکتی۔آپ نہیں جانتیں میری جان کو کس قدر خطرہ ہے صرف ان لوگوں سے ہی نہیں ہے بلکہ ملک کے وہ طاقت ور لوگ جو عورت کو اس کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ بھی میرے دشمن بن گئے ہیں۔''

''تیرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟''

''کیوں کہ میں نے ان کے خلاف آواز بلند کی ہے۔''

بوڑھی عورت اپنے اندر اتنی سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے بحث کر پاتی تھی اور وہ روپے لیے خاموشی سے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ملک کے آٹھ اہم، مقبول اور نیک نام لوگوں نے ایک اتحاد قائم کیا تھا جس کا مقصد ملک میں ظلم و ناانصافی اور خاص طور سے عورتوں کے خلاف جرائم کا خاتمہ تھا انہوں نے ایک چارٹر نکاتی منشور قائم کیا اول وہ لوگ جو از خود انصاف حاصل کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے انہیں انصاف دلانا عمل میں لایا گیا تھا۔جس کا سربراہ معروف وکیل اور سماجی کارکن منیر احمد ایڈووکیٹ تھا۔دوسرا مقصد عورت کی حرمت کو بحال کرنا تھا اور اسکے کھوئے ہوئے حقوق اسے واپس دلانا تھا۔تیسرا نکتہ ملک کو ایک جدید اور ماڈرن اسٹیٹ بنانا تھا۔یہ ظاہر تھا اس منشور میں کوئی خرابی نہیں تھی اور میڈیا اس سے متاثر بھی نظر آ رہا تھا حال ہی میں کھلنے والا ایک نیوز چینل اس اتحاد کی بہت زیادہ پروجیکشن کر رہا تھا۔

اتحاد نے ملک کے ہر بڑے شہر میں ایسے مراکز قائم کرنے کا اعلان کیا تھا جہاں پر ظلم کا شکار ہونے والی عورتوں کو پناہ دی جائے گی۔ساتھ ہی ایسی ٹیمیں بنائی جاتی تھیں جو دیہاتوں میں جا کر خواتین کی حالت زار کا جائزہ لیں گی اور ناانصافی یا کسی جرم کا شکار ہونے والی عورتوں کو منظر عام پر لائیں گی۔اتحاد نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ خواتین کے خلاف امتیازی قوانین خاص طور سے حدود آرڈیننس کو ختم کر دیا جائے۔اتحاد کی جانب سے ان مطالبات کی عمومی پذیرائی ہو رہی تھی لیکن دینی جماعتیں اس پر مخالف ردعمل کا اظہار کر رہی تھیں۔وہ ایک بار پھر اسی پراسرار شخص کے سامنے تھے جو ان کا سربراہ تھا۔

حسب روایت تاریکی میں اس نے ان سے ملاقات کی اور انہیں ہدایت دی کہ عورتوں سے زیادتی والے معاملے کو زیادہ سے زیادہ اچھالا جائے اور غیر ملکی میڈیا میں اس کی تشہیر کی ہر ممکن کوشش جائے ان آٹھوں افراد نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسکی ہدایت پر دل و جان سے عمل کریں گے۔

☆ ☆ ☆

احسان، سلمان اور فرشتہ نوشین کو اغوا کر کے اسی فلیٹ پر گئے تھے انہیں کسی قسم کی

مزاحمت یا مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا نوشین کو انہوں نے راستے میں بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی۔ بلڈنگ ویران تھی اور کسی نے انہیں لڑکی کو اٹھا کر فلیٹ میں لے جاتے نہیں دیکھا تھا جہاں اگلے تین گھنٹے تک وہ اس پر قیامت توڑتے رہے۔ انہوں نے اسے ہوش میں لانے کی زحمت نہیں کی تھی اور جب وہ وہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر رہے تھے تو نوشین کو ہوش آنے لگا وہ گھبرا گئے تھے۔ احسان نے اچانک سوال اٹھایا تھا۔

''اگر یہ واپس گھر تک جا پہنچی تو ہم سب جیل میں ہوں گے۔'' یہ سن کر سلمان اور نوشاد بھی گھبرا گئے۔

''ارے یار! اب کیا ہوگا؟'' نوشاد بولا۔

''ایسا کرتے ہیں اسے۔۔۔'' سلمان نے گلے پر انگلی پھیر کر اشارہ کیا۔

''نہیں'' نوشاد لرز گیا۔

ہم اسے قتل نہیں کر سکتے۔''

''میرا خیال ہے یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' احسان سوچ کر بولا۔

''اگر ہم جیل جانے سے بچنا چاہتے ہیں تو اسے ختم کرنا ہی پڑے گا۔ کسی نے ہمیں اسے اغوا کرتے یا یہاں آتے نہیں دیکھا ہے۔ یہ ہمارے خلاف واحد گواہ ہے؟''

''پیارے! کس زمانے میں ہو اس جرم کی سزا بھی موت ہے جو ہم نے ابھی کیا ہے۔'' سلمان نے کسمساتی نوشین کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا ایک بیان ہمیں پھانسی کے تختے پر پہنچانے کے لیے کافی ہوگا۔''

اس پر تینوں میں بحث چھڑ گئی۔ احسان الٰہی اور سلمان اس حق میں تھے۔ اس لیے نوشاد کی مخالفت بھی کام نہیں آئی تھی البتہ اس نے صاف جواب دے دیا۔

''میں اس قتل میں شامل نہیں ہو سکتا ہوں اس لیے مجھ سے اس کی توقع مت رکھو۔''

''کیوں بے۔۔۔ مزے کرنے میں تو سب سے آگے تھا۔'' احسان نے طنز کیا۔

اور اب نتیجہ بھگتنے کا وقت آیا تو بھاگ رہا ہے۔ دیکھا نوشاد! جو کیا ہے ہم تینوں

نے کیا ہے اور اب بھی جو کریں گے تینوں ہی کریں گے۔''

''یارو! سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ اپنی عزت کے لیے چپ رہے گی۔''

''اور اس نے زبان کھول دی تو۔۔۔'' سلمان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں'' احسان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''اس کا مرجانا ہم سب کے حق میں ہے نوشاد میں اور سلمان اسکی ٹانگیں اور ہاتھ پکڑتے ہیں تو اس دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹ دے۔'' نوشاد بدک کر پیچھے ہو گیا۔

''بکواس مت کرو میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''میں ہی کیوں تو خود کیوں نہیں کر دیتا؟'' احسان مسکرایا۔

''میں تجھ سے یہی کہلوانا چاہتا تھا یعنی تو اس قتل پر آمادہ ہے؟''

''اب دیر نہ کر۔'' سلمان بولا۔

''کام نمٹا اور یہاں سے نکلنے کی کر۔'' احسان نوشین کی طرف بڑھا تھا کہ دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

''رک جاؤ! اسے ہاتھ مت لگانا۔''

یہ وہی شخص تھا جس نے انہیں نوشین کو اغوا کرنے کی ترغیب دی تھی۔

''تم۔۔۔'' ان تینوں کے منہ نکلا پھر سلمان بولا۔

''تم اندر کیسے آئے؟''

''جو تمہیں اس فلیٹ کی چابی دے سکتا ہے کیا اس کے پاس خود یہاں کی چابی نہیں ہوگی۔'' وہ مسکرایا۔

''بہر حال اب میرا بھی حق ہے اس پر۔۔۔ تم لوگ جاؤ نیچے کار میں بیٹھو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔'' احسان ہچکچایا۔

''لیکن اسے زندہ نہیں چھوڑنا ہے ورنہ یہ ہمارے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے گی۔''

''اس کی فکر نہ کرو میرے لیے یہ کھیل نیا نہیں ہے اب نیچے جاؤ اور ہاں فلیٹ کی چابی ادھر دے دو۔''

وہ اسے چابی دے کر چپ چاپ چلے گئے ان کے جاتے ہی اس شخص نے نوشین کا حلیہ درست کیا تھا اس کے منہ پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لایا۔ وہ اپنی حالت دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہوئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس شخص نے جلدی سے کہا۔

''وہ درندے کچھ دیر کے لیے باہر گئے ہیں میں ان کا پڑوسی ہوں۔ اس سے پہلے وہ آئیں تم چلی جاؤ۔ سیڑھیوں سے مت جانا پچھلی طرف رکشا کھڑا ہے اس میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی جاؤ دیر مت کرو کہیں وہ آ نہ جائیں۔''

نوشین اتنی خوفزدہ تھی کہ اس نے کوئی سوال کیے بغیر اپنی چادر اٹھائی اور اس شخص کیساتھ فلیٹ سے باہر آ گئی۔ اس شخص نے نوشین کو عقبی دروازے رکشے میں بٹھایا اور رکشے والے سے کہا۔

''بی بی جہاں کہیں اسے چھوڑ آؤ۔''

''جی صاحب!''

رکشے والے نے حکم کی تعمیل کی اور نوشین کو لے کر چلا گیا۔ اس نے محسوس نہیں کیا کہ یہ سب پہلے طے شدہ تھا۔ اس وقت اس کی جو حالت تھی وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

اسے رکشے میں بٹھا کر دوبارہ وہ شخص اوپر آیا اس نے کمرے میں ہونے والی اس بربریت کے تمام نشان جوں کے توں رہنے دیئے صرف ان جگہوں سے صفائی کی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جانے کے امکانات تھے۔ پھر وہ نیچے اترا۔ وہ تینوں کار میں تھے احسان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس نے نوشین سے کیا کیا۔ وہ مسکرایا۔

''بھئی! ابھی میرا دل نہیں بھرا ہے اس لیے اسے بے ہوش کر کے آ گیا ہوں رات پھر جاؤں گا اور تم تینوں میرے ساتھ چلو۔ اس وقت تم لوگوں کا گھر جانا مناسب نہیں ہے ممکن ہے کسی نے تمہیں لڑکی اغوا کرتے دیکھ لیا ہو اور پولیس تمہارے گھر پہنچ گئی ہو۔''

''کسی نے نہیں دیکھا اگر نہ گئے تو ہمارے نہ جانے سے ہم پر شک کیا جائے گا۔''

''اس کی فکر مت کرو تمہارے بارے میں میں، میں بھی گواہی دوں گا کہ تم

میرے ساتھ تھے۔ ایسا کرو کسی پی سی او سے اپنے گھر والوں کو کال کر کے بتا دو کہ تم لوگ دوستوں کے ساتھ ٹھٹھہ جا رہے ہو۔''

''تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟'' نوشاد نے اسے شک سے دیکھا۔

''کہو تو ٹھٹھہ ہی لے چلو۔ وہاں بھی جھیل کنارے میرا بنگلا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''ادھر رہنا مزے سے دو چار دن۔۔۔۔ ورنہ ادھر بھی بہت ٹھکانے ہیں۔''

''ابھی ہم یہیں رہنا پسند کریں گے۔'' احسان الٰہی فوری طور پر بولا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے گاڑی ایک پی سی او کے سامنے روک دی۔

''فون کر آؤ۔۔۔۔ لیکن ذرا جلدی ابھی اس کار کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سلمان چونکا۔

''مطلب صاف ہے اپنی کار نہیں ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''چوری کی ہے اس لیے ٹھکانے لگانا ہو گی۔''

''تم نے ہمیں چوری کی کار دی تھی؟'' نوشاد تیز لہجے میں بولا۔

''اگر ہم پکڑے جاتے؟''

''جو جرم تم کر رہے تھے وہ چوری کی کار کے مقابلے میں کہیں سنگین تھا۔'' اس کا لہجہ سرد تھا۔

وہ تینوں اتر کر پی سی او گئے اور باری باری اپنے گھر والوں کو کال کر کے بتایا کہ وہ دوستوں کے ساتھ ٹھٹھہ جا رہے ہیں۔ کل تک واپس آئیں گے۔ کال کر کے وہ باہر آئے تو وہ شخص جس کے نام سے بھی وہ ناواقف تھے انہیں ایک ساحلی بنگلے میں لے گیا۔

''یہاں رہو جب تک میں جانے کے لیے نہ کہوں ورنہ خود ذمہ دار ہو گے پکڑے گئے تو میں پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔''

بنگلہ دو بیڈز اور ایک وسیع لاؤنج پر مشتمل تھا۔ اس کے گرد چار دیواری اور ساحل کی طرف ٹانکوں سے سجا برآمدہ تھا۔ بجلی تھی۔ نیچے ٹینکی میں میٹھا پانی بھرا تھا۔ فریج میں کھانے پینے کا سامان تھا اور کچن میں چائے کافی بنانے کے لوازمات موجود تھے۔ گویا ان کا وقت اچھا گزرتا۔ وہ شخص جانے لگا تو سلمان نے اس سے پوچھا۔

"استاد اب تو اپنا نام بتا دو؟" وہ انہیں گھورنے لگا پھر اس نے کہا۔

"تم مجھے سجاد کہہ سکتے ہیں۔"

سجاد کے جانے کے بعد انہوں نے گھوم پھر کر بنگلے کا جائزہ لیا۔ وہ سجاد کے بارے میں تبصرہ کر رہے تھے۔ سلمان بولا۔

"مجھے یہ شخص صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ اس نے ہمیں کسی مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔"

"بڑی جلدی خیال آ گیا ہے۔" نوشاد نے طنز کیا۔

"اس نے ہمیں استعمال ہی نہیں کیا بلکہ پھنسا دیا ہے اب نام آئے گا ہمارا اور یہ صاف بچ جائے گا۔"

"یارو! خدا سے خیر مانگو۔" احسان الٰہی بولا۔

"ہم نے خیر والا کوئی کام کیا ہے؟" نوشاد بڑبڑایا۔

"یار! یہ تو گیا اسے گناہ اور ثواب کی پڑ گئی ہے۔" سلمان نے قہقہہ مارا۔

نوشاد جذباتی ہو رہا تھا۔

"یار! خود سوچو اس لڑکی کو چھیڑنا الگ بات تھی لیکن جو ہم نے اس کے ساتھ کیا خدا کی قسم ۔۔۔۔ ہم نے شیطان کو بھی مات دے دی ۔۔۔۔ اور اب وہ اس کی جان لے لے گا۔"

"بور مت کر" سلمان نے منہ بنایا۔

"ہاں جو ہو گیا اسے بھول جا ۔۔۔ بس آگے کی فکر کر۔"

فریج میں دودھ ڈبل روٹی انڈے اور چکن پڑی تھی۔ انہوں نے چکن سادہ فرائی کیا۔ انڈے ابالے اور ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر سونے کے لیے لیٹ گئے مگر اس رات انہیں نیند کم ہی آئی تھی۔ ضمیر کی مار سے زیادہ یہ خوف انہیں جگاتا رہا تھا کہ ایک بار پولیس ان کے گھروں تک پہنچ گئی تو وہ ان کے گھر والے کہیں کے نہیں رہیں گے۔ سجاد صبح سویرے آ گیا تھا اور اس کی صورت سے لگ رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ سلمان نے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم پریشان لگ رہے ہو؟"

"ہاں یار! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ لڑکی نکل گئی۔ جب میں واپس پہنچا تو دروازہ کھلا تھا اور وہ غائب تھی۔"

"مروا دیا۔" احسان کراہا۔

"خبیث آدمی! یہ سب تمہاری حرکت ہے۔" سلمان نے دانت پیسے۔

"یارو! میرا اتنا قصور ہے کہ میں نے اسے بے ہوش سمجھا تھا شاید جب میں نے اسے دوائی سنگھائی تو اس نے سانس روک لی تھی۔ میں ساری رات اس کے چکر میں رہا۔ وہ ہمارے علاقے کا سماجی رہنما ہے نا ۔۔۔ صابر انصاری وہ اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اس نے تھانے جا کر لڑکی کی ایف آئی آر لکھوا دی ہے۔ اس نے تم تینوں کے نام لیے ہیں اور پولیس اب تمہیں تلاش کر رہی ہے۔"

ان تینوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا اس کا کام تمام کر دو۔" سلمان بلبلایا۔

"اب بھگتو ۔۔۔ پولیس کے ہتھے چڑھے تو سمجھو سیدھا پھانسی کے تختے پر۔"

وہ تینوں خود کو للکار رہے تھے۔ نوشاد نے سجاد کی طرف دیکھا۔

"اب ہم کیا کریں ۔۔۔ کہاں جائیں؟ پولیس ہمیں ہر جگہ تلاش کرے گی۔"

"اس کی فکر نہ کرو پولیس سے بچانا میرا کام ہے۔ میں تمہیں ملک سے باہر بھی بھیج سکتا ہوں۔ بس تمہارے گھر والوں کی فکر ہے پولیس انہیں تنگ کرے گی۔"

"ان کی فکر نہ کرو ہمیں بچاؤ۔" احسان الٰہی نے خود غرضانہ لہجے میں کہا۔ سجاد نے گہری سانس لی۔

"ابھی تو کچھ دن یہاں رہو شہر میں جانا بھی خطرناک ہے۔ پولیس نے تم تینوں کی تصویریں لے لی ہیں جو شائد کل تک اخبار میں آ جائیں گی۔ بہتر ہو گا بنگلے سے باہر بھی نہ جھانکو۔ جب تک تم لوگوں کی داڑھی مونچھیں نہ بڑھ آئیں۔"

"باہر نہیں جائیں گے تو گزر بسر کیسے ہو گی؟" سلمان نے اعتراض کیا۔

"کھانے کے لیے سامان تم تک آتا رہے گا۔" سجاد نے بتایا۔

تفریح کے لیے ٹی وی ہے ڈش لگی ہے سی ڈی پلیئر ہے فلمیں بھی پڑی ہیں۔ ایک

بار پھر خبردار کر رہا ہوں یہاں سے جانے کی کوشش کی تو نتیجے کے خود ذمے دار ہو گے پھر میں تمہاری ذرا بھی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"ہمیں پاگل کتے نے کاٹا ہے جو اس پناہ گاہ کو چھوڑ کر بھٹکتے پھریں۔"

"میں ابھی چکن کڑاہی اور روٹی لا دیتا ہوں اسے کھانا۔۔۔ اب کل دوپہر میں آؤں گا۔ ناشتے کا سامان بھی لیتا آؤں گا۔ فریج میں بھی بہت کچھ رکھا ہے۔"

اس کے جانے کے بعد سلمان نے اسے بے تحاشہ گالیاں دیں۔

"اس کتے کے بچے نے ہمیں پھنسوایا ہے۔"

"یارو! ہمارے پاس سوائے سجاد کے اوپر بھروسہ کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" احسان بولا۔

"پولیس ہماری تلاش میں ہے ہم یہاں سے نکلے تو پکڑے جائیں گے۔"

"یارو! یہ بھی دیکھو۔۔۔ وہ سچ بھی کہہ رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔" سلمان نے نکتہ اٹھایا۔

"یہ ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟" سلمان کی بات نے نوشاد کو متفکر کر دیا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں نزدیکی کسی ہوٹل تک جا کر اخبار دیکھ آتے ہیں۔" احسان نے تجویز پیش کی۔

"اور اپنی صورت دکھا آتے ہیں تاکہ اخبار میں سچ مچ تصویر آئی ہو تو لوگوں کو پہچاننے میں دشواری پیش نہ آئے۔" سلمان نے طنز کیا۔

"یار! تھوڑا سا حلیہ بدل لینا کون سا مسئلہ ہے۔ اپنا نوشاد سندھی کتنی اچھی بولتا ہے۔ یہ جا کر سندھی میں بات کرے گا۔ سر پر سندھی ٹوپی لے لے اور آنکھوں پر بڑے سیاہ شیشوں والی عینک لگا لے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر سندھی ٹوپی اور سیاہ عینک کہاں سے ملے گی؟"

"یہاں دیکھتے ہیں۔" سلمان بولا۔ انہوں نے الماریوں کی تلاشی لی خوش قسمتی سے ایک جگہ سے یہ دونوں چیزیں مل گئیں۔ نوشاد نے ٹوپی پہن کر عینک لگائی تو اس کا حلیہ خاصہ بدل گیا تھا۔ وہ جانے لگا تو احسان نے کہا۔

"بنگلہ اچھی طرح دیکھ لو ایسا نہ ہوں کہ راستہ بھول جاؤ۔"

"میں بچہ نہیں ہوں۔" نوشاد نے منہ بنا کر کہا۔

☆ ☆ ☆

تنویر نقوی راحیل کا دوست اور جرنلسٹ تھا۔ ان دنوں وہ ایک شام کے اخبار کے لیے کام کر رہا تھا۔ ساتھ میں ایک اخبار کے لیے سنڈے میگزین کے لیے آرٹیکلز لکھ رہا تھا۔ راحیل دفتر سے شام والے اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ وہاں سے اسے پتا چلا کہ تنویر ایک پریس کانفرنس کی کوریج کے لیے شیرٹن گیا ہے۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ شیرٹن کی طرف موڑ دیا۔ تنویر اسے پارکنگ میں مل گیا۔

"ارے راحیل! کہاں میرے یار!" وہ اسے دیکھتے ہی چمٹ گیا۔

"ادھر کیا کرنے آیا ہے؟"

"تجھے تلاش کرتا آیا ہوں۔ میرے ساتھ چل بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"اچھا بابا! لیکن یہ بائیک۔۔۔ واپسی میں نہ ملی تو۔"

"میں دوسری لے دوں گا۔"

راحیل نے اسے کار میں دھکا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ریستوران میں بیٹھے تھے چائے کا کہہ کر راحیل نے اسے ساری کہانی سنائی۔ تنویر حیران رہ گیا۔

"ارے یار! وہ تیری کزن ہے مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" راحیل پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"یار ایسی بات کون خوشی سے بتاتا ہے؟"

"بہت افسوس ہوا سن کر۔۔۔ یہ بتا کہ مجھ سے کیا چاہتا ہے میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" تنویر خلوص سے بولا۔

"یار نوشین کے ساتھ برا ہوا ہے لیکن اس کے بعد مجھے لگ رہا ہے وہ غلط قسم کے لوگوں میں پھنس گئی ہے۔" تنویر نے سر ہلایا۔

"میں بیگم زحمت اور اس کی ان جی او کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہوں یہ باہر سے روپیہ لیتی ہے اور اپنے غیر ملکی آقاؤں کے اشاروں پر ناچتی ہے گزشتہ چند سالوں

سے جہاں بھی کہیں کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے یہ اس کی حمایتی بن کر پہنچ جاتی اور اسے خوب کیش کراتی ہے۔ اسے انصاف دلانے کی بجائے میڈیا کے سامنے تماشہ بنا دیتی ہے۔"

"بالکل یہی وہ نوشین کے ساتھ کر رہی ہے۔ اس نے نوشین پر ایسے قبضہ کر لیا ہے کہ اس کی ماں بھی اسے نہیں مل سکتی ہے۔ نوشین نے پچھلے دنوں خالہ کو چار لاکھ روپے سے زیادہ رقم دی ہے۔ اس کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی؟"

"بیگم نزحت اسے قابو میں رکھنے کے لیے پیسے کا لالچ دے رہی ہے۔" تنویر نے مضبوط انداز میں کہا۔

"وہ ان عورتوں کو ان ہی حربوں سے اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ انہیں ڈراتی ہے کہ باہر گئیں تو ان کی جان کے دشمن انہیں مار دیں گے۔"

"بالکل یہی ڈرا وہ نوشین کو دے رہی ہے اسے اتنا ڈرایا ہے کہ وہ مجھ سے اور خالہ سے ملنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے دوسری طرف اس کی طرف سے مقدمہ لڑنے والا وکیل بلاوجہ مقدمے کو طول دے رہا ہے۔ اس نے تین ملزموں کے ساتھ پولیس اور صوبائی حکومت کو بھی مقدمے کا فریق بنا دیا ہے۔"

"وہ اس طرح معاملے کو طول دے رہی ہے۔" تنویر نے اس کی تائید کی۔

"سنو دوست! نوشین کو اس کے قبضے سے نکالنا ہوگا مجھے معلوم ہے پولیس پوری سرگرمی سے مجرموں کو تلاش کر رہی ہے اگر وہ اس ملک میں ہیں تو جلد یا بدیر ضرور قابو آئیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوشین کو کوئی ایسا شخص ملے جو اس کے دل سے اس سانحے کے زخم کو مٹا دے۔"

"تنویر یار! میں اسے پسند کرتا ہوں اور میرے لیے وہ اب بھی اتنی ہی معصوم اور پاکباز ہے اگر وہ مان جائے تو میں اس کے ساتھ ہنسی خوشی شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

"سچ یار۔۔۔۔!" تنویر کا چہرہ چمک گیا۔

"یار! ان عورتوں کے انصاف کیساتھ اس چیز کی بھی ضرورت ہے اور یہ موقع پرست ان کی رہی سہی زندگی کو اپنے مفاد کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں بدقسمتی سے ہمارا میڈیا

بھی ان کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ نوشین سے مجھے ملنے نہیں دیا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے؟ بس اس کی ایک پریس کانفرنس یا سیمینار میں شرکت سے مجھے پتا چلتا رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

"یہ بہت اثر رسوخ والے لوگ ہیں۔" تنویر نے کہا۔

"پچھلے دنوں ملک کے کئی اہم افراد نے ایک اتحاد تشکیل دیا ہے اور مجھے اس معاملے میں سازش کی بو آ رہی ہے۔ بہ ظاہر ان کا مقصد مظلوم افراد اور خاص طور پر عورتوں کو انصاف دلانا اور حقوق دلانا ہے مگر انہوں نے جتنے بھی کیس میڈیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اس میں سے کوئی بھی فریق بارسوخ نہیں ہے۔ یہ سب لوگ عام ہیں یہ لوگ جاگیرداروں کے کیس پیش نہیں کر رہے ہیں۔"

"تم نے صحیح کہا ہے۔ میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تم صحافی ہو۔"

"یار! سب صحافیوں پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ کبھی خود بھی غور کرنا چاہیے۔ یہ لوگ عوام کی اس لاعلمی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب یہ نام نہاد این جی اوز ایسے کیسز کے پاس بھی نہیں پھٹکتی ہیں اور نہ ہی انہیں میڈیا سامنے لاتی ہے۔"

"وہ اس ملک کے حکمران ہیں ان سے ٹکر کون لے سکتا ہے۔" راحیل بولا۔

"یار! تو کسی طرح کوشش کر میری ایک بار نوشین سے ملاقات ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے قائل کر لوں گا۔"

"مسئلہ ملنے کا ہے اور یہ کام خاصا مشکل ہے بیگم نزحت جرنلسٹ کو تو نوشین کے پاس بھی بھٹکنے نہیں دیتی۔" تنویر نے سوچا۔

"مگر میں کوشش کروں گا۔ ہاں ایک کام تو بھی کر سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" راحیل چونکا۔

"بیگم نزحت ان عورتوں کو ذرا چھپا کر رکھتی ہے۔ تو کوشش کر کہ اس کا ٹھکانہ پتا چل جائے یہاں تو یہ حال ہے کہ پولیس نے اس سے ملنا ہوتا ہے تو پہلے بیگم نزحت سے اجازت لیتی ہے۔"

''میں کوشش کروں گا لیکن اس کا ذرا سا سراغ ملے۔''

''اس کی اگلی کانفرنس کا بتاؤں گا۔'' تنویر بولا۔

''تم بھی پہنچ جانا اور معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ کہاں مقیم ہے۔''

جس وقت تنویر اور راحیل یہ گفتگو کر رہے تھے نوشین یورپ کی ایک فلائٹ کے لیے ائرپورٹ جا رہی تھی۔ بیگم نزحت نے اس کا پاسپورٹ بنوا لیا تھا اور اب اسے چپکے سے لے جا رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ یہ بات پھیلی تو حکومت نوشین کو روک نہ دے۔ عدالت میں اس کے کیس کی سماعت جاری تھی۔ اسی بنیاد پر اسے جانے سے روکا جا سکتا تھا مگر ائرپورٹ پر اسے کسی نے نہیں روکا اور وہ باآسانی طیارے میں سوار ہو گئی۔ بیگم نزحت لمبا پروگرام بنا کر نکلی تھی۔ اس نے نوشین کو تو نہیں بتایا تھا کہ ان کے دورے کا مقصد کیا ہے سوائے اس کے کہ اسے خواتین کے حقوق بعض تنظیموں کی جانب سے اسے اعزاز میں دی جانے والی تقریبات میں شرکت کرنا ہے نوشین حیران ہوئی تھی انہیں میرے بارے میں کیا معلوم؟''

''میری جان۔۔۔! تمہارے بارے میں تو ایک دنیا کو معلوم ہے تم چلو تو دیکھنا تمہاری کیسی پزیرائی ہوتی ہے۔''

نوشین الجھن میں تھی اب اسے سارے چکر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک نئے شہر میں جانا پڑتا تھا۔ نئے لوگوں کا سامنے اسے اپنی رسوائی کی داستان دہرانی پڑتی تھی۔ اسے وحشت ہوتی تھی مگر بیگم نزحت اس کی ہمت بڑھاتی کہ اسے انصاف کے حصول کے لیے اس قسم کے ناگوار مراحل سے گزرنا پڑیگا۔ اسے اب متعدد بار میڈیا کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ لیکن عدالتی کاروائی کے لیے وہ صرف ایک بار گئی تھی اسکے تفصیلی بیان کے بعد اس کے وکیل نے اس کی طرف سے دستخط شدہ ایک درخواست پیش کر دی تھی کہ اسے بار بار عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ باہر اس کی جان کو خطرہ ہے۔ اس درخواست میں یہ بھی تھا کہ اسے بیگم نزحت کی تحویل میں رہنے دیا جائے۔ جج نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ درخواست اس کی جانب سے ہے اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

تین مہینے میں وہ صرف دو بار اپنی ماں سے ملی تھی بہنوں کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی راحیل کا بار بار آنا اسے اچھا لگتا تھا لیکن بیگم نزحت کی سخت ہدایات سے مجبور تھی بیگم نزحت نے اسے پانچ لاکھ روپے دیئے تھے کہ یہ اس کے لیے باہر ملک سے مدد آئی تھی۔ ان میں سے چار لاکھ روپے اس نے ماں کو دے دیئے تھے بیگم نزحت نے کہا تھا کہ ابھی اسے اور بھی روپے ملیں گے۔ وہ زندگی بھر کے لیے فکر معاش سے آزاد ہو جائے گی۔ ساتھ ہی بیگم نزحت اسے سمجھاتی تھی کہ اس پر جو سانحہ گزرا تھا اس کی سراسر ذمے دار اس ملک کی معاشرتی اور مذہبی قدامت پسندی ہے وہ بے دریغ ان دونوں پر تنقید کرتی اور اس کا موازنہ مغربی تہذیب سے کرتی جہاں بقول اس کے عورت آزاد تھی اور کوئی اسے اس کی مرضی کے بغیر انگلی نہیں لگا سکتا تھا۔ نوشین ایک ناسمجھ لڑکی تھی ان معاملات میں اس کا علم محدود تھا پھر وہ جس سانحے سے گزری تھی اس کے ذہن کو بیگم نزحت کی یہ باتیں اچھی لگتی تھیں۔

مگر اب اسے کسی قدر الجھن ہوتی تھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ ان سب باتوں کا اسے انصاف مہیا کرنے سے خاص تعلق نہیں تھا۔ احسان سلمان اور نوشاد کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ اب وہ مفرور ہیں بیگم نزحت نے ان کا بارے میں بتایا کہ پولیس جان بوجھ کر انہیں گرفتار کرنے سے گریز کر رہی ہے اور بااثر افراد ان کی پشت پناہی کر رہے تھے بیگم نزحت نے ہی کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کہیں اور جانے کا مشورہ دے۔ اس نے شاید رقم بھی اسی مقصد کے لیے دی تھی۔ نوشین کی ماں نے راحیل کی مدد سے وہ مکان بیچ کر ایک دوسری جگہ پرنئی آبادی میں چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ جہاں پڑوس پڑوس کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے موبائل فون بھی لیا تھا جس پر روز بیٹی سے بات کرتی تھی۔ اس دوران نوشین نے اسے دوبار لاکھ لاکھ روپے بھجوائے تھے اور یہ پیغام دیا کہ انہیں افشین اور نورین کے لیے رکھے ماں نے فون پر اس سے رابطہ کیا تھا۔

''تو نے افشین اور نورین کا نام کیوں لیا۔ کیا تیرے لیے کچھ نہ کروں۔''

''امی! میری فکر چھوڑیں۔'' نوشین نے تلخی سے کہا تھا۔

''میرے ساتھ جو ہو چکا ہے اس کے بعد میرے ساتھ شادی کون کرے گا۔''

ماں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی مگر نوشین نے اسے ٹال دیا۔

"ماں! میری طرف سے ہر مہینے اتنی رقم ملے گی۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔"

"میری بچی! مجھے رقم کی نہیں تیری ضرورت ہے۔"

"میں کس کام کی۔۔۔ سوائے رسوائی اور بوجھ کے۔۔۔"

نوشین نے زہریلے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا اور پھر رونے لگی۔ ماں بہنوں کی یاد اسے دن رات تڑپاتی تھی پھر بیگم نزہت نے اس کے پاسپورٹ کے لیے کاغذات سائن کرائے اور دو دن بعد اس کا پاسپورٹ بن گیا چوتھے دن وہ طیارے پر سوار ہو چکی تھی۔ بیگم نزہت اور صفیہ ناز اس کے ساتھ تھیں۔ صفیہ ناز بھی خواتین کے حقوق کی علم بردار تھی لیکن نزہت کے سامنے دبی دبی سی رہتی تھی۔

وہ پہلے برطانیہ پہنچی وہاں کئی آرگنائزیشنز نوشین کے استقبال میں پیش پیش تھیں اس کے اعزاز میں تقریبات منعقد کی گئیں جن میں مقررین نے اس کی جرات کو سراہتے ہوئے پاکستان کے سسٹم کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا نوشین سب سے زیادہ حیران بیگم نزہت کی اور صفیہ ناز کی تقریروں سے ہوئی تھی دوسرے مقررین نے بھی تنقید کی تھی لیکن ان کا انداز محتاط تھا مگر یہ دونوں حد سے گزر گئی تھیں۔ ملک میں بھی وہ بات کرتی تھیں اور یہاں پر ان کا لہجہ دوسرا تھا خاص طور پر اسے صفیہ ناز کا یہ جملہ گراں گزرا تھا کہ ہمارا مذہب عورت کو پالتو جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے اس پر ہال میں تالیاں بجتی رہیں تھیں۔

برطانیہ کے بعد وہ فرانس گئے تھے اور وہاں سے سوئزرلینڈ۔ وہاں نوشین کو ایوارڈ بھی دیا گیا تھا وہ حیران تھی کہ اس نے ایسا کیا کیا ہے؟ یہ سب میڈیا کا کمال تھا جس کی وجہ سے اسکی اتنی پزیرائی ہو رہی تھی۔ ایوارڈ کے ساتھ اسے دس ہزار ڈالر نقدی بھی ملی تھی۔ یہاں پر اسے بہادر مشرقی عورت کا سمبل قرار دیا جا رہا تھا۔ سوئزرلینڈ سے وہ واپس برطانیہ آئے جہاں پاکستانی عورتوں کی ایک ایسوسی ایشن نے اس کے اعزاز میں ڈنر دیا تھا۔ مگر اس ڈنر میں عورتوں کا رویہ اس سے مختلف تھا۔ وہ اس سے تکلفاً پیش آئیں ان کا رویہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسے ہمارا احسان سمجھو ورنہ تم اس قابل نہیں ہو کہ ہمارے ساتھ بیٹھو۔

اس تقریب میں ایک سادہ سی عورت بھی شریک تھی۔ ایک موقع پر جب نوشین

اکیلی تھی وہ اس کے پاس آئی۔

"بیٹی! اللہ تمہاری مدد کرے لیکن میں کہوں گی تم غلط لوگوں میں پھنس گئی ہو۔"

"کیا مطلب۔۔۔ وہ حیران ہوئی؟"

"یہ بیگم نزہت اور صفیہ ناز ان ممالک میں پاکستان کی عورت کے بارے میں مبالغہ آمیز کہانیاں سناتی ہیں اور امداد وصول کرتی ہیں۔"

"تو انہوں نے غلط کہا ہے کیا میرے ساتھ ایسا نہیں ہو رہا؟" نوشین تلخی سے بولی۔

"ہوا ہے لیکن یہ ایسا اثر دیتی ہیں کہ پاکستان کی ہر عورت کے ساتھ جنسی زیادتی یا مردوں کے ظلم کا شکار ہوتی ہیں اور ان میں چند ایک کے مجرموں کو عدالت سے سزا ہوتی ہے باقی صاف بری ہو جاتے ہیں ان دو لاکھ عورتوں کو کیوں نہیں کوئی ایوارڈ دیا جاتا امریکہ کی جرائم کی شرح اس سے زیادہ ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں ہر سال اٹھارہ ہزار عورتیں صرف جہیز نہ لانے یا کم جہیز لانے کے جرم میں زندہ جلا دی جاتی ہیں۔ زیادتی کا شکار ہونے والی عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان کے واقعات کو اس طرح بین الاقوامی سطح پر کیوں نہیں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کو کوئی ایوارڈ کیوں نہیں دیا جاتا؟" خاتون جذباتی ہو گئی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ مجھے الجھا رہی ہیں۔" نوشین نے سر تھام لیا۔

"بیٹی! صرف بات اتنی ہے کہ ہم پیسے کے لیے ایسا کر رہے ہیں ورنہ دنیا کے اکثر ممالک ایسے ہیں جہاں عورتوں پر اس سے کہیں زیادہ ظلم ہوتا ہے۔ مغرب والے اسلام آباد اور پاکستان کے دشمن ہیں۔ بیگم نزہت اور صفیہ ناز جیسے لوگ ان کے آلہ کار ہیں۔"

"کیا باتیں ہو رہی ہیں۔" اچانک بیگم نزہت وہاں آ گئی۔ اس نے ناگواری سے خاتون کو دیکھا۔

"چلو نوشین! کس قسم کے لوگوں سے بات کر رہی ہو؟"

"میں اس معصوم لڑکی کو بتا رہی ہوں کہ ایک کے بعد دوسری زیادتی کا شکار ہے اسے انصاف نہیں مل رہا صرف استعمال کیا جا رہا ہے۔"

''اس ملک میں انصاف کہاں ہے؟'' بیگم نزحت ڈھٹائی سے بولی۔

''بیگم نزحت انصاف کہیں نہیں۔ جس ملک میں تم آئی ہو اس میں بھی نہیں ہے اور معاف کرنا تم آئی ہو کسی اور مقصد کے لیے ورنہ انصاف تو پاکستان میں بھی مل سکتا ہے۔''

''چلو نوشین اس قسم کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ ان عورتوں نے ہی مردوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔''

وہ نوشین کا بازو پکڑ کر دوسری طرف لے گئی۔ نوشین نے ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ وہ عورت مسکرا رہی تھی۔

چند دن بعد وہ امریکہ کے لیے پرواز کر گئے تھے۔ اس سے پہلے نوشین نے کبھی فضائی سفر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا اور ان تین مہینوں میں اس نے بے شمار فضائی سفر کر لیے تھے۔ امریکہ سے وہ نیویارک پہنچے۔ نوشین نے پوچھا تھا کہ امریکہ میں کیا کرنا ہے مگر بیگم نزحت نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ بیرون ملک سفر کے دوران میں وہ زیادہ تر ہوٹل کے کمرے تک محدود رہا کرتی تھی۔ بیگم نزحت کی جانب سے اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف کسی تقریب میں جاتے وقت وہ نکلا کرتی تھی۔ اس روز بھی بیگم نزحت نے اسے چلنے کو کہا تو وہ سمجھ گئی اسے کسی تقریب میں شرکت کرنا ہے مگر بیگم نزحت نے کہا۔

''آج ہم ایک مظاہرہ کریں گے اقوام متحدہ کے سامنے آج پاکستان کی ایک اہم شخصیت آ رہی ہے۔''

ہوٹل کی لابی میں پندرہ بیس خواتین ان کی منتظر تھیں۔ ان میں سے کچھ پاکستانی تھیں اور باقی امریکن۔ انہوں نے پلے کارڈ تیار کر رکھے تھے۔ نوشین کی انگریزی خاصی بہتر ہوئی تھی۔ اس لیے پلے کارڈ پر درج نعرے سمجھنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ سب نفرت انگیز نعرے تھے جو اصل میں اس کے ملک کے خلاف تھے اس نے پریشان ہو کر بیگم نزحت سے کہا۔

''باجی! یہ سب کیا ہے؟''

''بس جان! ہمیں آج مظاہرہ کرنا ہے تاکہ دنیا کو پتا چلے کہ پاکستان میں

عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

نوشین کچھ دیر سوچتی رہی۔۔۔ پھر اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''باجی! میں اس مظاہرے میں حصہ نہیں لوں گی۔''

☆ ☆ ☆

ان تینوں پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ بری طرح پھنس چکے تھے۔ باہر پولیس انہیں سرگرمی سے تلاش کر رہی تھی۔ اگر وہ سجاد کی پناہ سے نکل جاتے تو زیادہ دن پولیس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے وہ دو ہفتے ہاکس بے والے ساحلی بنگلے میں رہے تھے پھر سجاد نے انہیں سپر ہائی اسکیم کے زیر تعمیر مکان میں منتقل کر دیا۔ وہی ان کی دیکھ بھال کرتا تھا اور انہیں کھانے پینے کا سامان پہنچاتا تھا۔ ان چند ہفتوں میں ان کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ اس روز بھی وہ بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ نوشاد کا کہنا تھا ''کہ انہیں ایک سازش کے تحت اس معاملے میں ملوث کیا گیا ہے۔ اس سے ان کا کوئی مفاد تھا۔''

''ان کا کیا مفاد ہو سکتا ہے؟'' احسان الٰہی نے اعتراض کیا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے نوشین کو بھی اس نے جان بوجھ کر فرار کروایا۔ تاکہ ہم اس کے چنگل میں پھنس جائیں۔ ورنہ خود سوچو کیا ہم نے اسے اس قابل چھوڑا تھا کہ فرار ہو سکے۔''

''سوال وہی ہے اس سے اسے کیا فائدہ؟''

''مجھے لگتا ہے کہ سجاد کے پیچھے کوئی اور ہے جو اس سارے معاملے میں ملوث ہے۔'' نوشاد نے کہا۔

''اگر ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کر کیوں نہیں سکتے۔ خود ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہیں ورنہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

''اچھا اگر تو کر سکتا ہے تو کر لے۔''

''ٹھیک ہے آج سجاد آئے تو اسے کچھ دیر کے لیے اندر روکنا اتنی دیر میں میں اس

کی کار کی ڈکی کھول کر اندر گھس جاؤں گا اور کم سے کم اس کا ٹھکانہ دیکھ ہی لوں گا۔"

"سوچ لے پکڑے گئے تو وہ بگڑ جائے گا اور اس کی پناہ بھی نہیں رہے گی۔" سلمان نے خبردار کیا۔

"اگر ایسی بات ہوئی تو میں سارا الزام خود پر لے کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔" نوشاد نے انہیں رضامند کرلیا۔

شام کو جب سجاد آیا تو نوشاد بہانے سے نکلا اس نے ایک مضبوط تار کا پہلے سے ہی بندوبست کرلیا تھا۔ تالے بغیر چابی کے کھولنے کی اس خاصی مشق تھی۔ سجاد کی شاندار کار کی ڈکی کھولنے میں اسے کوئی دشواری نہیں آئی تھی۔ وہ ڈکی میں گھس کر لیٹ گیا اور ڈکی بند کرلی۔ اندر سے وہ اسے بہ آسانی کھول سکتا تھا۔ پندرہ منٹ بعد سجاد باہر آیا اور کار اسٹارٹ کر کے روانہ ہوگیا۔ نوشاد دم سادھے پڑا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اسے چھینک نہ آجائے کیونکہ جس طرح سجاد کی آوازیں اس تک آرہی تھیں اسی طرح اس کی آواز بھی سجاد تک جاسکتی تھی۔ کوئی پون گھنٹہ بعد کار رک گئی اور سجاد اس سے اتر کر چلا آیا چند منٹ سن گن لینے کے بعد جب نوشاد کو ارد گرد کوئی آہٹ نہیں سنائی دی تو اس نے آہستہ سے ڈکی اندر سے کھولی اور پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھی کے پورچ میں کھڑا تھا اور یہ کوٹھی اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی وہ سامنے سے جانے کے بجائے گھوم کر عقبی حصے میں پہنچا وہ اندر جانے کا راستہ تلاش کررہا تھا اچانک اسے سجاد کی آواز سنائی دی۔

"جناب! وہ بے صبرے ہورہے ہیں۔ اب زیادہ دن انتظار نہیں کریں گے۔ مجھے ڈر ہے وہ از خود فرار نہ ہوجائیں۔"

"انہیں روکو۔۔۔ اگر وہ فرار ہوگئے تو مسئلہ ہوجائے گا۔"

دوسری آواز آئی جو نوشاد کو جانی پہچانی لگی تھی۔ آوازیں ایک کھڑکی سے آرہی تھیں جو کھلی تھی لیکن اسکے سامنے پردے پڑے تھے اس نے کوشش کی کہ اندر جھانک کر دوسرے بولنے والے شخص کو دیکھ سکے۔

"سر! میں سوچ رہا ہوں انہیں ایکس نمبر پر منتقل کردوں وہاں پہرا بھی ہے وہ فرار نہیں ہوسکیں گے۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" دوسرے آدمی نے ناگواری سے کہا۔

"وہ ہمارا مستقل ٹھکانہ ہے انہوں نے اس کی نشان دہی کی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔ نوشین باہر سے آنے والی ہے سنا ہے اس نے بیگم نزہت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کردیا ہے اس کے آتے ہی ان تینوں کو پولیس کے حوالے کردینا اس کے بعد یہ جانیں اور عدالت جانے۔"

نوشاد لرز گیا تھا۔ سجاد اور اس شخص کے ان کے بارے میں یہ عزائم تھے اور وہ اب تک اسے اپنا ہمدرد سمجھتے رہے تھے۔ سجاد نے کہا

"سر! اب تک کے اس سارے کھیل کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم نے خود ہی نوشین کو ان کے ہاتھوں بے آبرو کرایا اور اب انہیں پولیس کے حوالے کردیں گے۔"

"تم نہیں سمجھو گے۔ یہ بہت اونچے درجے کی سیاست ہے بین الاقوامی سطح کی سمجھ لو۔ اس میں سب کے اپنے مفاد ہیں۔ نوشین اور لڑکے محض مہرے ہیں۔ استعمال کرو اور پٹوادو۔ بس ان کا یہ مصرف ہے۔"

"تب میں انہیں ہاکس بے والے بنگلے میں لے جاتا ہوں وہاں یہ خوش تھے جب ان کی گرفتاری کا وقت آئے گا تو دوبارہ اسی کنڈر میں لے آؤں گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" دوسرے شخص نے کہا۔

اسی لمحے کھڑکی کا پردہ ہٹا اور نوشاد نے اس شخص کو دیکھ لیا اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ سامنے ملک کا مشہور سماجی رکن اور غریبوں کا ہمدرد صابر انصاری کھڑا تھا۔ اسی وجہ سے نوشاد کو اسکی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ کئی بار اسے دیکھ چکا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قدر نیک نام اور مشہور آدمی کا اصل چہرہ اس قدر بدصورت ہوگا۔ اس کا دل چاہا کہ اندر گھس جائے اور اسے قتل کردے اب یہ بات واضح تھی کہ ان سے نوشین کی بے حرمتی ایک منصوبے کے تحت کرائی تھی وہ اپنے جوش پر قابو پاتا رہا اور تہیہ کرتا رہا وہ انہیں بخشے گا نہیں اب اسے کوٹھی سے نکلنے کی فکر تھی اسے معلوم تھا کہ کسی نے اسے یہاں دیکھ لیا یا وہ پکڑا گیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ ممکن ہے وہ مار دیا جائے یا اسے پولیس کے حوالے کردیا جائے۔

کوٹھی چھوٹی سہی لیکن صابر انصاری نے بہترین حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اونچی چاردیواری پر خاردار تار لگی تھی اور فولادی گیٹ پر گارڈ تھا لہذا اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سجاد کی کار کی ڈکی میں چھپ جائے اسی طرح وہ کوٹھی سے باہر جا سکتا تھا وہ پورچ تک آیا اور دوبارہ تار کی مدد سے ڈکی کھول کر اس میں گھس گیا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد کار ایک بار پھر رکی۔ موقع غنیمت جان کر نوشاد نے ذرا سی ڈکی کھول کر جھانکا۔ وہ ایک معروف ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ جس کے تکے کباب مشہور تھے۔ سجاد شائد خود کھانا کھانے گیا تھا یا پیک کروانے گیا تھا نوشاد جلدی سے باہر نکل آیا۔ اسکے بعد اسے واپس اس کھنڈر نما مکان تک پہنچنے کے لیے خاصی دیر پیدل چلنا پڑا تھا بس اسٹاپ سے وہ جگہ بہت دور تھی۔ سلمان اور احسان پریشانی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"کہاں رہ گیا تھا تو؟" احسان الٰہی غصے سے بولا۔

"یہاں ہمارا خون خشک ہو رہا تھا۔" نوشاد بے دم سا کرسی پر گر گیا۔

"ابھی ۔۔۔ جو میں تجھے بتانے جا رہا ہوں اسے سن کر تیرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے۔ سجاد ہمارا دشمن ہے۔"

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" سلمان بولا۔

"صرف شبہ تھا جو میں سن کر آیا ہوں اس نے میرے حواس گم کر دیے ہیں۔"

نوشاد نے گہری سانس لی اور انہیں تفصیل سے بتانے لگا۔ اسکی طرح ان دونوں کا منہ بھی کھلا رہ گیا تھا۔ احسان الٰہی نے بھرائی آواز میں کہا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انصاری ایسا نکلے گا۔"

"حرام زادہ ۔۔۔" سلمان غرایا۔

"یہ سوچ اب کیا کرنا ہے۔" نوشاد بولا۔

"وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"اس سے پہلے ہم انہیں جہنم رسید کر دیں گے۔" نوشاد نے سلمان کی طرف دیکھا۔

"ہمارے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں کہ ان کے گلے تک پہنچ سکیں۔ انہیں نوشین

مت سمجھنا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"تجھے اس سے زیادہ ہی ہمدردی محسوس ہو رہی ہے؟" سلمان نے جوابی طنز کیا۔

ان کا جھگڑا احسان نے ختم کرایا۔

"یار خدا کے لیے سنجیدہ ہو جاؤ۔ بتاؤ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے ابھی ہمیں سجاد پر ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کی اصلیت جان گئے ہیں۔" نوشاد بولا۔

"جب تک ہمیں موقع نہیں مل جاتا۔"

"کیسا موقع؟" سلمان نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

خاصی بحث کے بعد ان میں طے ہوا کہ ابھی وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کریں گے اور موقع پا کر سب سے پہلے سجاد کو قابو کر کے اسے مزہ چکھائیں گے اور ممکن ہوا تو صابر انصاری سے بھی نمٹیں گے۔ اگلی صبح سجاد انہیں دوبارہ ہاکس بے والے بنگلے پر لے جانے کے لیے آیا تھا۔

"میں نے سوچا اس جگہ تم لوگ آرام سے نہیں ہو اور یہ جگہ شہر سے بھی دور ہے اس لیے تمہیں دوبارہ وہاں منتقل کر رہا ہوں۔ تم پولیس کی نظروں سے بھی محفوظ رہو گے۔"

"تم نے وعدہ کیا تھا استاد! کہ ہمیں غیر ملک بھجوا دو گے؟" احسان نے اسے یاد دلایا۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ عدالت نے تمہیں اشتہاری قرار دے دیا ہے۔ کسی قانونی راستے سے تم باہر نہیں جا سکتے اس لیے کوئی غیر قانونی راستہ اختیار کرنا پڑے گا اس میں وقت لگے گا۔"

"استاد! ایک بات تو بتاؤ یہ سب ہمارے لیے کیوں کر رہے ہو؟" سلمان نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم تمہارے سگے تو نہیں ہیں۔"

"میں اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ساری مصیبت میری

وجہ سے آئی ہے نہ میں غلطی کرتا اور نہ ہی نوشین فرار ہوتی۔ اس لیے تمہیں بچانا میرا فرض ہے۔'' اس کے لہجے میں مکاری تھی۔

''تم واقعی اچھے آدمی ہو۔'' احسان بھی ذومعنی انداز میں بولا تو سجاد چونک گیا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں یہاں سے چلو استاد! اس ویرانے میں دم گھٹتا ہے وہاں ساحل پر کچھ اچھی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔'' نوشاد نے جلدی سے کہا اور ان دونوں کو گھورا۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

☆ ☆ ☆

ائرپورٹ پر اترتے ہی بیگم نزحت نے بے پروائی سے کہا۔

''نوشین اب تم آزاد ہو۔ اپنا مسئلہ خود دیکھو۔''

''جی۔۔۔'' نوشین ششدر رہ گئی۔

''آپ کا مطلب ہے۔۔۔؟''

''ہاں میرا یہی مطلب ہے میں نے کوئی ساری عمر کا ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے اب خود بھگتو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھگت لوں گی اور عدالت سے انصاف بھی حاصل کرلوں گی۔''

نوشین کو غصہ آ گیا۔

''دیکھ لوں گی بی بی! یہ پاکستان ہے یہاں پر انصاف حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' بیگم نزحت نے طنز کیا۔

''اگر دنیا کی عدالت سے انصاف نہ ملا تو اُس دنیا کی عدالت سے ضرور ملے گا۔''

''اس دنیا سے ہی ملے گا بی بی! یہاں سے امید مت رکھو۔'' عین اس وقت ایک سوٹ پوش شخص ان کے پاس آیا۔

''بیگم نزحت! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کیوں۔۔۔؟'' وہ اکھڑ لہجے میں بولی۔

''اور کون ہو تم۔۔۔؟''

''آپ نے بیرون ملک پاکستان کے بارے میں ایسی باتیں کی ہیں جو آئین کی رو سے غداری کے زمرے میں آتی ہیں۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''بیگم نزحت! ہم سے تعاون کریں ورنہ معاملہ عدالت تک لے جانا پڑے گا۔'' سوٹ پوش نے لہجہ بدل لیا۔

نوشین نے محسوس کیا کہ عدالت کا سنتے ہی بیگم نزحت کی تندی ہوا ہو گئی تھی۔

''اچھا چلتی ہوں لیکن تم میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔''

''مس نوشین! آپ بھی چلیں گی آپ کو بھی اپنی صفائی پیش کرنا ہے۔''

ائرپورٹ پر ہی کسٹم ایریا میں دو گھنٹے تک سوالوں کے جواب دینے پڑے تھے۔ نوشین نے سب صفائی سے بتا دیا تھا اور اسے حیرت ہو رہی تھی کہ بیگم نزحت جس مرتبے کی عورت تھی بے تکان جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ اس نے ہر الزام کی نفی اور کچھ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر میں سوٹ پوش نے مسکرا کر کہا۔

''آپ دونوں کی ساری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے ہم نے بیرون ملک سے بھی آپ کی باتوں کا ریکارڈ منگوا لیا ہے۔ ان میں تضاد پایا گیا تو آپ عدالت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہیے گا۔''

بیگم نزحت چونکی پھر اس نے حقارت سے کہا۔

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''مس نوشین! کیا آپ ان کے ساتھ جائیں گی؟''

''جی نہیں۔۔۔ جب میں نے ان کے کہنے پر عمل کرنے انکار کیا تو انہوں نے مجھ سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔''

''او کے۔ تب حکومت آپ کو رہائش اور سیکیورٹی فراہم کرے گی۔''

''مجھے رہائش اور سیکیورٹی نہیں اپنی عزت کے لٹیروں کے خلاف انصاف چاہیے۔'' نوشین کی آواز بھرا گئی۔

"بی بی! انصاف کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے یہ آپ کو جس انصاف کی امید دلاتی ہیں وہ تا قیامت نہیں مل سکتا۔ آپ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔"

"مسٹر! تمہیں اپنے اس الزام کا جواب دینا ہوگا۔" بیگم نزہت غرائی تھی پھر اس نے شرر بار نظروں سے نوشین کو دیکھا۔

"احسان فراموش لڑکی دیکھ لوں گی تجھے بھی۔۔۔"

"بیگم صاحبہ! آپ مجھے دیکھیں یا نہ دیکھیں۔۔۔ میں اب پریس کو آپ کا چہرہ ضرور دکھاؤں گی۔"

بیگم نزہت پھنکارتی ہوئی چلی گئی۔ وزارت داخلہ کے اس افسر خالد احمد نے اسے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور اسے یقین دلایا کہ حکومت انصاف کی فراہمی میں اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے گی۔ یہاں نوشین نے آزادی سے ماں سے بات کی وہ افشین اور نورین سمیت اس سے ملنے آئی تھی۔ اس نے ایک جگہ مکان لے لیا تھا اور اب اس کی خواہش تھی کہ نوشین بھی اسکے ساتھ چل کر رہے۔

"نہیں ماں جی! جب تک میرے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا میرا آپ کے پاس آنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں مجھے حکومت کا پورا تعاون ہے اور وہ میری حفاظت بھی کر رہی ہے۔ گھر پر مجھے یہ سب نہیں ملے گا۔ لیکن یہ لوگ بیگم نزہت کی طرح نہیں ہیں اب نہ تو میں کہیں جاؤں گی اور نہ آپ کو مجھے ملنے سے روکا جائے گا۔"

"میری بچی نے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔" ماں نے اسے گلے لگا لیا۔

افشین نے موقع پا کر اسے کان میں کہا۔

"آپی! راحیل بھائی آپ کے لیے بہت بے قرار ہیں میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کے باہر جانے کا سن کر ان کی حالت کیا ہو گئی تھی جب میں نے انہیں آپ کے بارے میں آنے کا بتایا تو وہ آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ نوشین اجازت دے گی تب ملنے جاؤں گا۔" نوشین کا رنگ ایک لمحے کے لیے سرخ ہوا۔

"راحیل سے کہنا کہ میں اس کا انتظار کروں گی۔" افشین شوخی سے مسکرائی۔

"یعنی آگ برابر لگی ہے دونوں طرف۔۔۔"

"بتاؤں تجھے۔۔۔" نوشین مصنوعی غصے سے بولی۔

اسی شام راحیل اس سے ملنے آیا تھا نوشین کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"خدا کا شکر ہے تم اس عورت کے قبضے سے نکلیں۔"

"میں بھی خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔" نوشین نے اسے تفصیل بتائی۔

تم فکر نہ کرو میں اپنے دوست تنویر کی مدد سے اس کا سارا کچا چٹھا پریس میں چھپوا دوں گا۔" نوشین نے نفی میں سر ہلایا۔

"راحیل! تم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ اس قسم کے اسکینڈلز سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے میں اسے قریب سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ بہت طاقتور عورت ہے شکر ہے اس نے خود میری جان چھوڑ دی۔"

"نوشین! میں تم تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"میں۔۔۔ میں سمجھتی ہوں۔" نوشین کی نظریں جھک گئیں۔

"لیکن راحیل۔۔۔! میں تم سے کہوں گی کہ ابھی مجھ سے وہ کچھ نہ کہو۔"

"لیکن کیوں نوشین۔۔۔؟" راحیل نے احتجاج کیا۔

"میں جانتی ہوں انصاف کے حصول کے لیے مجھے بہت سارے صبر آزما اور رسوا کن مراحل سے گزرنا پڑے گا اور میں تم کو ان رسوائیوں میں حصے دار بنانا نہیں چاہتی۔"

"لیکن میں بننا چاہتا ہوں۔" راحیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"نوشین! یہ میری محبت کا امتحان ہے۔ میں مجنوں اور فرہاد جیسی افسانوی محبت کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اندر سے اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ مجھے جس سے محبت ہے اس کا مشکل وقت میں ساتھ نہ دیا تو پھر میری محبت کا فائدہ؟"

نوشین کے لبوں پر نہ جانے کتنے دنوں بعد سچی مسکراہٹ آئی تھی۔

"راحیل! آپ۔۔۔ آپ مجھ سچ مچ اتنی اتنی۔۔۔" جھجک نے اسے بات پوری نہ کرنے دی۔

"اس سے بھی زیادہ؟" راحیل سنجیدگی سے بولا۔

معانوشین کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ لیکن راحیل۔۔۔ خالہ۔۔۔ کیا وہ مان جائیں گی؟"

"میں ان سے پوچھوں گا بھی نہیں۔"

"تب۔۔۔ تب مجھے اپنے ساتھ سمجھیں۔"

☆ ☆ ☆

مخصوص تاریک کمرے میں وہ پراسرار شخص تھا اور اس کے ساتھ صرف پانچ افراد تھے۔ بیگم نزہت منیر احمد اور پروفیسر اشفاق احسن غائب تھے وہ شخص لرز رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"جناب! بیگم نزہت کی گرفتاری غیر متوقع ہے اس پر ملک سے غداری کا مقدمہ چل رہا ہے۔ البتہ منیر احمد اور اشفاق احسن کا معاملہ عجیب ہے منیر احمد کو فرینکفرٹ ائر پورٹ پر ہیروئن سمیت پکڑا گیا۔ یہ ہیروئن اس کے ہینڈ بیگ کی خفیہ تہوں میں پوشیدہ تھی۔ منیر احمد کا کہنا ہے کہ ہینڈ بیگ میرا نہیں ہے لیکن کوئی اس کی بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ ہینڈ بیگ میں اسکے پاسپورٹ سمیت اس کا ذاتی سامان تھا منیر احمد اسے اپنے خلاف سازش قرار دے رہا ہے مگر جناب! اسے سزا یافتہ سمجھیں۔ جرمنی میں منشیات اسمگلنگ کی سخت سزا ہے وہ شاید ہی زندگی میں جیل سے باہر آ سکے۔" منور علی نے رپورٹ دی تھی۔

"لعنت ہو اور پروفیسر کا کیا معاملہ ہے؟" وہ شخص غرایا۔ منور علی بولا۔

"پچھلے دنوں میں نے ایک خاص کام کے سلسلے میں اس سے رابطہ کیا تو اس نے حیرت انگیز جواب دیا اس نے کہا "اب میرا تم لوگوں سے یا اس نام نہاد اتحاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اپنے میں سے خارج سمجھو۔ اس نے دھمکی بھی دی ہے جناب! کہ اگر ہم نے اس علیحدگی پر اس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کی تو ہمارے بہت سارے راز منظر عام پر آ جائیں گے اور پھر ہم اپنا کام جاری نہیں رکھ سکیں گے۔"

"مجھے لگ رہا ہے کوئی خفیہ ایجنسی ہمارے خلاف حرکت میں ہے۔"

"ایسا کیسے ممکن ہے حکومت کی ہر ایجنسی اور ہر شعبے میں ہمارے آدمی ہیں اس قسم

کا کوئی خفیہ آپریشن ہوتا تو اب تک ہمیں اطلاع مل چکی ہوتی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ ہمارے آدمی ہوں۔" وہ شخص بولا۔

فاطمہ جواب تک خاموش تھی اس نے پہلی بار زبان کھولی۔

"جناب! میرا بھی یہی خیال ہے میں نے اب تک جو تجزیہ کیا ہے۔ اس کے مطابق کوئی ادارہ اتنی خاموشی سے ہمارے خلاف سرگرم ہے کہ ہمیں اس کی سرگرمیوں کا احساس تک نہیں ہے۔ منیر احمد اس قسم کا احمقانہ کام کر ہی نہیں سکتا کہ اپنے ہینڈ بیگ میں ہیروئن چھپا کر لے جائے۔"

"مس فاطمہ! تمہیں کیا پتا۔۔۔ آدمی بعض اوقات اسے بھی زیادہ احمقانہ کام محض دولت کے لیے کرتا ہے۔" منور علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بیگم نزہت کو زیادہ آگے نہیں جانا چاہیے تھا اب حکومت اس کے خلاف بالکل قانونی طریقے سے کارروائی کر رہی ہے۔"

"اور اشفاق احسن کو تم کس کھاتے میں ڈالو گے؟" پراسرار شخص نے دریافت کیا۔

"جناب! میرا خیال ہے اسے کسی نے بہانے سے بہکایا ہے یا پھر حکومت نے اس پر دباؤ ڈالا ہو۔ وہ سرکاری ملازم ہے اس لیے یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔"

"میں نہیں مانتا اشفاق احسن اتنا کمزور آدمی نہیں ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے اپنے عزائم ہوں۔" پراسرار شخص بولا۔

"لیکن میں کسی کو اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔"

"جناب! ہم سب آپ کے تابعدار ہیں۔" اس کا لہجہ سفاک تھا۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہیں۔"

وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور اپنا ڈھیلا سا لبادہ کھینچتا ہوا واپس سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اسکے جاتے ہی کمرے کی عمومی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ پانچوں دوسرے دروازے سے باہر نکلے اور ایک راہ داری سے ہوتے ہوئے کار پورچ میں آئے جہاں ان کی گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ ایک وسیع و عریض لیکن ویران اور اجاڑ کوٹھی تھی۔ اس کے چاروں

طرف پوش علاقہ کی مخصوص اونچی نیچی سرسبز لینڈ اسکیپ تھی۔ کوٹھی جی ٹی روڈ سے ذرا فاصلے پر تھی۔ پانچوں افراد یکے بعد دیگرے اپنی گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

ایک گھنٹے کے بعد کوٹھی سے ایک وین نکلی اور اس نے اسلام آباد کا رخ کیا۔ ایک پوش علاقے میں وین ایک بنگلے میں داخل ہوئی اس سے ایک طویل قد، بے حد دبلا پتلا بوڑھا اتر کر اندر داخل ہوا۔ اس نے سادہ سی پتلون قمیض پہن رکھی تھی بنگلے کے اندر نشست گاہ میں ایک ادھیڑ عمر سیاہ فام شخص بیٹھا تھا اس کے نقوش بتاتے تھے کہ وہ ساؤتھ انڈیا سے تعلق رکھتا ہے۔

"پرویز احمد!" اس نے بوڑھے کو دیکھتے ہی کہا۔

"میں پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں تم جانتے ہو میں کتنا مصروف آدمی ہوں۔"

"میں تم سے زیادہ مصروف ہوں۔" پرویز نامی بوڑھا غرایا۔

"اور تم مجھ سے تفریحاً ملنے نہیں آتے ہو میں تمہارے لیے کام کر رہا ہوں۔ کوئی میری پچاس برسوں کی محنت کو برباد کر رہا ہے۔"

"اس کا پتا لگانا تمہارا کام ہے۔" سیاہ رو شخص سرد لہجے میں بولا۔

"مسٹر ایمے سیڈرا! آخر بھارت ماتا نے اتنی ساری ایجنسیاں کس لیے پال رکھی ہیں میں بیک وقت ایجنٹ اور ایجنسی کا کام نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ مجھے بتایا جائے آخر میرے پیچھے کون پڑا ہے؟" بھارتی سفیر چراغ پا نظر آنے لگا تھا۔

"اس کام کے لیے تم نے مجھے کال کر لیا؟"

"مسٹر کرشنا! تم محض ایک ملازم ہو اور میں ایک بااختیار ایجنٹ۔ لہٰذا میں جب چاہوں اور جیسے چاہوں تمہیں استعمال کر سکتا ہوں۔ مجھے اپنی مطلوبہ معلومات چوبیس گھنٹے کے اندر چاہئیں۔"

کرشنا چند لمحے اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "مسٹر پرویز! کسی غلط فہمی میں مت رہنا تم جیسے نہ جانے کتنے ایجنٹ اس ملک میں ہیں۔"

"لیکن تمہارے لیے کوئی اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ میں ہوں۔ میں تمہارے لیے

وہ کارنامہ انجام دے رہا ہوں کہ آنے والے دنوں میں بھارت کی نسلیں مجھے یاد رکھیں گی۔ یہ میں ہوں جس نے اس ملک میں این جی اوز کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے بیرون ملک روابط قائم کیے ہیں اور بس چند مہینوں کی بات ہے تم سن لو گے کہ واحد سپر پاور نے اس ملک کی جانب سے پرامن جوہری تعاون کی درخواست مسترد کر دی ہے اور یہی معاہدہ بھارت کے ساتھ کر لیا ہے۔"

"ہاں لیکن ۔۔۔۔ پاکستان کے ساتھ معاہدہ نہ ہونے میں میرا ہی کردار ہے میں نے لابسٹ کھڑے کیے اور سپر پاور کے ذمے داروں کو باور کرایا کہ ایک اسلامی ملک کو کسی قسم کی جوہری ٹیکنالوجی دینا مناسب نہیں ہوگا۔" پرویز احمد کے لہجے میں فخر تھا۔

"مگر تم ایف سولہ اور دوسرے جنگی سامان تو رکوانے میں ناکام رہے۔"

"اس میں امریکہ کا اپنا مفاد ہے اسے وہ طیارے اور سامان نکالنا ہے جو چند سال بعد ویسے بھی اس کے کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس کے مقابلے میں وہ بھارت کو زیادہ مقدار میں اور جدید ترین طیارے اور ہتھیار دینے کے لیے تیار ہے۔"

"یہ بھی اس کا اپنا مفاد ہے۔" کرشنا نے روکھے انداز میں کہا۔

"بھارت اپنا مفاد خود طے کرتا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری مطلوبہ معلومات جلد از جلد حاصل کر لوں۔"

"یہ بے حد ضروری ہے اس طرح ہم شور مچا سکتے ہیں کہ حکومت این جی اوز کے خلاف اندرون خانہ سرگرم ہے۔"

کرشنا سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ پرویز احمد ایک کمرے میں آیا اس نے وہاں ایک خفیہ جگہ سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا۔

"پی اے کالنگ!" اس نے پکارنا شروع کیا۔

"یس پی اے رسیونگ۔" چند لمحے بعد دوسری طرف سے جواب ملا۔

"اے ون سے میری بات کراؤ۔"

"اے ون حاضر ہے جناب!"

ایک کھردری سی آواز نے کہا۔

''حکم فرمائیں۔''

''اے اے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی سمجھ گئے نا؟''

''جی سر۔۔۔۔! سمجھ گیا کوئی اور حکم بھی ہے؟'' کھردری آواز نے پوچھا۔

''نہیں بس یہی کام کرنا ہے۔''

اس نے کہا اور ٹرانسمیٹر بند کر کے واپس خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ وہ بے حد محتاط زندگی گزارتا تھا اپنے اردگرد کے ماحول کے لحاظ سے بھی اور اپنی صحت کے لحاظ سے بھی۔ اس کی عمر ستر برس تھی اور وہ پوری طرح صحت مند تھا۔ دبلے پتلے جسم سے قطع نظر اسے کوئی بیماری یا کمزوری نہیں تھی سوائے نقرت کی بیماری سے۔ یہ بیماری اسے بارہ سال کی عمر میں لاحق ہوئی تھی۔

آج سے اٹھاون برس پہلے وہ جب بارہ برس کا تھا تب اپنے باپ کے ہمراہ گائیڈ کا کام کرتا تھا۔ وہ سرینگر کے رہنے والے تھے اور اس کا باپ پورے کشمیر کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں کی طرح جانتا تھا۔ زمینی راستے دشوار گزار تھے لہذا اندرون کشمیر اور خاص طور پر گلگت کی طرف جانے کے لیے گائیڈ لازمی تھا۔ پرویز کا باپ غلام احمد گائیڈ تھا۔

پھر تقسیم کا مسئلہ کھڑا ہوا اور کشمیر کی جنت نظیر وادی آگ میں جلنے لگی۔ ہری سنگھ کی مکاری نے کشمیر کو ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ عوام اس فیصلے کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئے تھے۔ مجاہدین کے قافلے سری نگر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ دستے کو تحریک کے نامور قائد چلا رہے تھے۔ غلام محمد ان مجاہدین کے لیے رہنمائی کا کام کر رہا تھا۔ ایک دستے کو نامور قائد نے سری نگر ائرپورٹ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا مگر ایک دن کا سفر اس دستے نے پورے دو دن میں طے کیا تھا اور جب وہ ائرپورٹ پہنچے تو وہاں پر بھارتی افواج اتر چکی تھی محض ایک دن کی تاخیر نے اس وادی کے چالیس لاکھ عوام کو آنے والے برسوں میں غلامی کے ایک نئے دور میں داخل کر دیا تھا۔ بھارتی فوج کی آمد کے ساتھ۔ بے سروسامان مجاہدین پسپا ہونے لگے۔ گوریلا دستہ بھی تیزی سے واپس ہوا اور راستے میں دستے افراد نے غلام محمد پر غداری کا الزام عائد کیا کہ اس نے قیمتی وقت برباد کیا اور اس کی وجہ سے بھارتی فوج کو سری نگر میں اترنے کا موقع ملا۔ غلام محمد نے اس الزام کی تردید کی مگر وہ اس بات کی

وضاحت کرنے قاصر رہا تھا کہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہونے کے باوجود اس نے سری نگر تک پہنچنے میں اتنی دیر کیوں لگائی قافلے کے امیر نے اس پر فرد جرم عائد کر کے اسے سزائے موت سنا دی اور پرویز احمد کے سامنے اس کے باپ کو گولی مار دی گئی۔ وہ منظر آج بھی پرویز احمد کے ذہن میں تازہ تھا۔ جب اسے اپنے باپ کی خون میں لتھڑی لاش یاد آئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں نفرت ابلنے لگی تھی۔

باپ کے مرنے کے بعد گوریلا دستے نے اسے مظفر آباد رکھا، جہاں اس نے ایک مہاجر کیمپ میں دو سال گزارے پھر ایک شخص خیال نبی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے پرویز احمد کی پرورش کی تھی وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کی نفرت کی پرورش بھی کرتا رہا۔ اسے بتاتا رہا کہ اس نے بڑے ہو کر اس سرزمین کے رہنے والوں سے اپنے باپ کا انتقام لینا ہے۔ خیال نبی نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور مرنے سے پہلے اسے ایک کاروبار کرا دیا تھا۔ پرویز نے اس کاروبار کو پروان چڑھایا۔ اسوقت وہ ارب پتی تھا۔ مگر اس نے دولت کو اپنا مشن نہیں بنایا تھا۔ اس کا مشن اس سرزمین کی بربادی تھی جس نے اسے پروان چڑھایا تھا اور اس نے زندگی کی نعمتوں پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس نے خیال نبی کی طرح ان افراد کو معمولی درجے سے اٹھا کر بلندیوں پر لا پہنچایا تھا اور ان کی مدد سے اپنے مشن کی تکمیل کر رہا تھا۔

اب تک سب ٹھیک تھا لیکن اچانک ہی حالات خراب ہونے لگے تھے۔ اسے بھی شبہ تھا کہ کوئی ایجنسی خفیہ طور پر سرگرم ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے این جی اوز کی کارکردگی پر نظر رکھی جا رہی تھی اور ان کی ملک دشمن سرگرمیوں کے حوالے سے سوالات اٹھائے جا رہے تھے اس کے بعد بیگم نزحت کے خلاف ایکشن لیا گیا۔ اگرچہ اس کی گرفتاری پر این جی اوز اور انسانی حقوق کے علم برداروں نے خاصا شور مچایا تھا لیکن معاملہ عدالت میں تھا اور ساری کاروائی اوپن تھی۔ منیر احمد کی طرف سے وہ بھی مایوس تھا انسانی حقوق کے حوالے سے اس کی حیثیت بھی اسے نہیں بچا سکتی تھی اور پروفیسر کے بارے میں وہ مشکوک تھا کہ اس نے کالی بھیڑ کا کردار ادا کر کے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔ وہ باقی پانچ کے بارے میں فکرمند تھا وہ سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسور اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔سادات۔۔۔۔"

"سر! ایک بری خبر ہے۔صفیہ ناز کی کار ائر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی وہ موقع پر ہی ختم ہوگئی۔"

"او۔۔۔او۔۔۔" پرویز احمد غرایا۔

"سادات! بہت بڑی سازش ہے۔سب سے کہو کہ محتاط رہیں ورنہ اسی طرح ایک ایک کر کے ختم کر دیئے جائیں گے۔"

☆ ☆ ☆

"یہ حربے ان پر آزمائے ہوں گے۔بہر حال پروفیسر! وطن دشمنوں کے خلاف یہ کامیابی آپ کی وجہ سے مل رہی ہے۔"

"یہ میرا فرض تھا جناب! میں خود کچھ عرصے کے لیے بھٹک گیا تھا لیکن خدا نے مجھے راستہ دکھایا اور میں مزید گمراہ ہونے سے بچ گیا۔پرویز احمد کی اصل شخصیت سامنے آتے ہی میں اس گروہ سے متنفر ہوگیا تھا۔خدا کا شکر ہے ہم نے ان میں دراڑیں ڈال دیں ہیں ورنہ یہ پوری دنیا میں ہمیں اکیلے کرنے کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔"

"ان کا کام اب بھی جاری ہے اور ایسے شواہد ملے ہیں کہ ان کا تعلق پڑوسی دشمن ملک سے بھی ہے۔پرویز احمد کی بھارتی سفیر سے ملاقات ہوئی ہے۔" سادہ پوش نے کہا۔

"مناسب وقت آنے پر اسے بھی گرفت میں لے لیا جائے گا۔فی الحال وہ ہمارے لیے آزادانہ کر زیادہ کام کر رہا ہے۔"

"تو جناب! میں اجازت چاہوں گا۔" پروفیسر نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"اور اپنا خیال رکھیے گا۔اب آپ ان وطن دشمنوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے ہوں گے۔"

"میں اپنی جان اس زمین اور اس کے لوگوں سے زیادہ عزیز نہیں سمجھتا مگر پھر بھی اسے اللہ کی امانت جان کر اس کی پوری حفاظت کروں گا۔" پروفیسر نے جواب دیا اور نکل گیا۔

اسی شام وہ واپس اپنے شہر جانے کے لیے موٹروے سے روانہ ہوا تو اسے پتا چلا

کہ ایک بڑی ڈاج پک اپ اسکے تعاقب میں تھی۔وہ سارے سفر کے دوران میں مستقل اس کے پیچھے رہی تھی۔دو گھنٹے بعد جب ایک مقام پر موٹروے خم کھا رہی تھی اس طرف گہری کھائی تھی۔جسے محفوظ بنانے کے لیے اس پر ریلنگ لگا دی گئی تھی اچانک ڈاج پک اپ نے عقب سے پروفیسر کی کار کو ٹکر ماری اور پھر اسے رگڑتی چلی گئی۔پھر عقب سے پک اپ نے اسے دبایا اور پروفیسر کی کار ریلنگ توڑ کر کھائی میں جا گری۔تقریباً اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گرنے کے بعد اس میں موجود پروفیسر کو بچانا ناممکن تھا کھائی کی تہہ قریب آتے دیکھ کر اس نے بے اختیار کلمہ پڑھا تھا اور اس کے بعد ہر طرف تاریکی چھا گئی۔

☆ ☆ ☆

منور علی نے صفیہ ناز کا حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسی لمحے اس نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔وہ کتنا ہی شاطر سہی مملکتوں کی لڑائی میں اس کی حیثیت مینڈک سے زیادہ نہیں تھی۔لاہور آتے ہی اس نے اپنے ایجنٹ کو سوئزر لینڈ کے لیے دستیاب پہلی فلائٹ سے ٹکٹ بک کرانے کی ہدایت کی تھی اور جس روز اشفاق احسن کی کار موٹروے کے نزدیک کھائی میں سے نکالی جا رہی تھی۔منور علی سوئزر لینڈ کے لیے طیارے میں سوار ہو چکا تھا۔اس نے اب تک جتنا کمایا تھا اس کا نوے فیصد سوئس بینکوں میں محفوظ تھا۔ملک میں اس نے جو صنعتی اور تجارتی سلطنت قائم کر رکھی تھی اس میں تقریباً سارا ہی پیسہ دوسروں کا لگا تھا اور اسے پرواہ نہیں تھی کہ اس کے کاروبار کا کیا ہوتا ہے۔اسے اب اپنے پراسرار باس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔اسے امید تھی کہ وہ باقی زندگی آرام اور آسائش سے گزار سکتا ہے دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی اور اسے اپنی ذہانت پر بھی بھروسا تھا۔اسے یقین تھا جب چند سال بعد وہ دوبارہ کاروبار کی دنیا میں قدم رکھے گا تو تہلکہ مچا دیگا۔

☆ ☆ ☆

سلمان نے برآمدے میں سامنے پانی میں کھیلتی لڑکیوں کو دیکھا۔

"شکر ہے اس جگہ کچھ رنگینی تو ہے؟"

"تجھے رنگینی کی پڑی ہے۔" احسان جھنجھلا گیا۔

"ادھر پتا نہیں کب پولیس آ جائے۔"

"پولیس ادھر نہیں آئے گی۔" نوشاد بولا۔

"جب ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کا وقت آئے گا تو سجاد ہمیں واپس اسی کھنڈر میں لے جائے گا۔"

"زیادہ خوش فہمی میں نہ رہ۔۔۔ان کا ارادہ بدل بھی سکتا ہے۔"

"مشکل ہے یہ اس کا پکا ٹھکانا ہے وہ پولیس کو کیا بتائے گا کہ ہم اس کے مکان میں کیا کر رہے تھے۔ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ پاس پڑوس کے لوگ اسے ہمارے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں ہے پولیس پیسے والے کی بات مانے گی۔ وہ ہمیں اس جگہ سے گرفتار کر کے جہاں سے سجاد کہے گا گرفتاری دکھا دے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں گرفتار کرنے کے بجائے مار دیا جائے۔" احسان نے سرد لہجے میں کہا۔

"تب ہمیں اس جگہ سے نکل جانا چاہیے۔" سلمان اچھل کر بولا۔

"دوستوں تم لوگ ایک بات بھول رہے ہو۔ ہم کنگلے ہیں خالی جیب کہیں بھی نہیں جا سکتے۔" نوشاد بولا۔

"مگر پیسہ کہاں سے آئے گا؟" احسان نے سوال کیا۔

"ایک ذریعہ ہے ہم پیسے سجاد یا انصاری سے حاصل کریں گے۔" نوشاد نے کہا۔

"وہ کیسے۔۔۔کیا وہ فی سبیل اللہ پیسہ ہمیں دیں گے۔" سلمان نے طنز کیا۔

"نہیں ہم نکلوائیں گے یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور ہمیں ہر صورت رقم نکلوانی ہے۔ چاہے اس کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینا پڑے۔ اگر پیسہ ہوا تو ہم علاقہ غیر جا کر بھی پناہ لے سکتے ہیں۔"

"اگر علاقہ غیر تک جا سکتے تو۔۔۔" سلمان بولا۔

"دیکھو۔۔۔سجاد جب بھی ہمیں یہاں سے لے جانے کی کوشش کرے ہمیں اسے قابو کرنا ہے اور پھر جیسا موقع ہو اس سے رقم حاصل کرنی ہے۔"

"قابو کرنا ہے۔" سلمان متفکر ہو گیا۔

"خالی ہاتھ؟"

"یار وہ اکیلا ہے۔" نوشاد بولا۔

"بھائی! اگر وہ جوڈو کراٹے جانتا ہو تو خالی ہاتھ اکیلا ہم تینوں کے لیے کافی ہوگا۔"

"اسے قابو کرنے کی ترغیب لینا پڑے گی۔"

وہ تینوں بحث کرنے لگے۔ آخر تینوں ایک منصوبے پر متفق ہو گئے۔ اس شام سجاد آ گیا۔ وہ کار سے اترا تھا کہ اس کے چہرے کے اثرات نے ان تینوں کو بتا دیا تھا کہ عمل کا وقت آ گیا ہے۔ وہ تینوں سامنے والے لان میں تھے۔ سجاد کار سے اتر کر ان کی طرف بڑھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔

"چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"شکر ہے ہم بھی یہاں بور ہو گئے ہیں۔" احسان نے خوشی کا اظہار کیا۔

"کہاں جانا ہے۔"

"سپر ہائی وے والے اس کھنڈر میں۔۔۔صبح ایک ٹرک تم لوگوں کو بلوچستان لے جائے گا۔ یہاں سے لانچ کے ذریعے تمہیں دوبئی روانہ کر دیا جائے گا۔"

"ہم تیار ہیں۔" نوشاد نے مسکرا کر کہا۔

"کیا خیال ہے چلنے سے پہلے ایک کپ چائے نہ ہو جائے؟"

"کیوں نہیں؟" سجاد مسکرایا۔

لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ فکر مند ہے۔ اس نے اندر قدم رکھا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پندرہ منٹ بعد وہ فرش پر بے ہوشی کی حالت میں بندھا پڑا تھا سلمان نے اس کی تلاشی لے کر ایک عدد پستول برآمد کر لیا تھا۔ پستول دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ احسان بولا۔

"اب کام آسان ہو جائے گا۔"

سلمان نے خاصی قوت سے سجاد کے سر پر ڈنڈے کا وار کیا تھا۔ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں سجاد مر نہ جائے لیکن دو گھنٹے بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ جب اس کے حواس بجا ہوئے اور اس نے خود کو بندھے پایا تو اس نے واویلا مچایا۔

"یہ کیا حرکت ہے مجھے کیوں بے ہوش کیا؟"

"شورمت کرو استاد! تمہاری استادی ہم پر کھل گئی ہے۔" نوشاد نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں ڈبل کراس کر رہے ہو اب تم سب بتاؤ گے۔ آخر تم نے نوشین کو ہمارے ہاتھوں کیوں بے آبرو کروایا اور اب ہمیں پولیس کے حوالے کر کے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بکواس ہے سب ۔۔۔ میری ہمدردی کا اچھا صلہ دے رہے ہو تم لوگ ۔۔۔ لیکن یاد رکھو کہ تم پچھتاؤ گے۔"

سجاد نے صاف انکار کر دیا۔ یہ اور بات تھی کہ جب ان تینوں نے یہی سوال جب ذرا مختلف طریقے سے پوچھے تو اس نے مان لیا اس نے سب بتا دیا تھا۔ سلمان نے ایک سگریٹ اس کے بازو سے لگا کر ختم کر دی تھی تب اس نے جوابات دیئے تھے۔ سلمان نے اس سے کہا!

"ہمیں رقم کی ضرورت ہے وہ کہاں سے ملے گی۔"

"میرے پاس چند لاکھ روپے ہیں وہ بینک میں پڑے ہیں۔"

انہوں نے ایک بار پھر اس سے دوسرے انداز میں پوچھا مگر اس بار سجاد نے سخت جانی کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے بازو پر وہ دوسرا سگریٹ برداشت کر گیا تھا۔ البتہ اس نے صابر انصاری کے پاس بڑی رقم کی موجودگی کا اقرار کر لیا تھا۔ احسان نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ رقم کون دیتا ہے۔"

"میں تمہیں اس کے پاس لیے چلتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں صابر انصاری کا معمولی سا ملازم ہوں اور یہ سب میں نے اس کے اشارے پر کیا ہے۔"

"معمولی ملازم اتنی شاندار کاروں میں نہیں گھومتے ہیں اور نہ ان کے پاس پستول ہوتے ہیں۔" نوشاد بولا۔

"تم ہمیں صابر انصاری کے پاس لے چلو ۔۔۔ لیکن یاد رکھنا اگر کوئی چال چلی تو سب سے پہلے فوت ہونے والے شخص تم ہی ہو گے۔"

"خدا کی قسم میں کوئی چال نہیں چلوں گا۔" سجاد نے انہیں یقین دلایا۔

انہوں نے سجاد کو کھولا اور اپنے ساتھ لے کر چلے۔ سلمان پستول لیے اس کی

نشست کے عین پیچھے بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ احسان بیٹھا تھا۔ تکلیف کے باوجود سجاد کو انہوں نے ڈرائیونگ کرنے پر مجبور کیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور ایسا ہی ہوا۔ صابر انصاری کی کوٹھی کے چوکیدار نے ڈرائیونگ سیٹ پر سجاد کی صورت دیکھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ پستول پر سجاد انہیں اندر لے گیا۔ صابر انصاری اتفاق سے راہ داری میں مل گیا۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا اور پھر انجان بن کر بولا۔

"سجاد یہ کسے لے آئے ہو؟"

"جناب! میں نہیں یہ مجھے لائے ہیں۔" اسکے چہرے پر گھبراہٹ نظر آئی تھی۔

"مطلب یہ ۔۔۔" سلمان نے سجاد کی کمر سے لگا پستول اسے دکھایا۔

"اب خیریت اسی میں ہے جیسا ہم کہیں ویسا ہی کرنا۔"

صابر انصاری نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔

"خدا کے لیے گولی مت چلانا۔ تم جو کہو گے میں مانوں گا۔"

"تمہارے جیسے شخص کے پاس بڑا مال ہونا چاہیے۔ یعنی بلیک منی ۔۔۔ کہاں چھپا رکھی ہے تم نے؟" نوشاد نے پوچھا۔

"اس میں سے ہمیں بھی حصہ چاہیے۔"

"کیا کہہ رہے ہو میں سماجی کارکن ہوں میرے پاس بلیک منی کہاں سے آئی؟"

"یہ تمہارا دست راست سجاد ہمیں سب بتا چکا ہے۔ کیونکہ ہم نے اس نے بازوؤں پر جلتی سگریٹ لگائی تھی تمہاری سازش بھی کھل گئی ہے۔"

"جناب! میں نے مجبور ہو کر انہیں سب بتا دیا ہے۔" سجاد بولا۔

"آپ ان کا مطالبہ مان لیں انہیں پیسے دے دیں تاکہ یہ یہاں سے چلے جائیں۔"

صابری انصاری ہچکچایا تھا لیکن جب سلمان نے پستول اسکے سر سے لگایا تو وہ مان گیا۔ وہ انہیں لے کر اپنے بیڈ روم میں آیا جہاں دیوار میں تجوری فکس تھی۔ اتفاق سے اس روز اس کے بیوی بچے گھر پر نہیں تھے۔ صابر انصاری نے تجوری کھولی۔ اب نہ جانے اس کی نیت خراب تھی یا سلمان کو دھوکا ہوا۔ سامنے ایک پستول رکھا تھا۔ سلمان سمجھا کہ صابر انصاری

پستول اٹھانے جا رہا ہے۔ اس نے بوکھلا کر فائر کر دیا۔ اتنے نزدیک سے نشانہ خطا جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ گولی درمیان سے صابر انصاری کی ریڑھ کی ہڈی کے ٹکڑے کرتی ہوئی اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ سجاد جواب تک خاموش کھڑا تھا اس نے یکدم جست لگائی اور کمرے نکل گیا۔

''مارے گئے بھاگو یہاں سے۔'' احسان بولا۔

''پیسے تو لے لو۔''

نوشاد نے تجوری میں رکھی گڈیاں اٹھا کر اپنی شرٹ میں ڈالنا شروع کر دیں سلمان اور احسان نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ باہر نکلے مگر سامنے کی طرف سے مسلح گارڈ تھا۔ اس نے دیکھتے ہی ان پر برسٹ مارا تھا۔ احسان آگے تھا وہ گر گیا۔ سلمان کی جوابی فائرنگ سے گارڈ مارا گیا۔ وہ دونوں باہر کی طرف لپکے انہوں نے احسان پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کیا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا تھا۔ انہیں صرف اپنی جان کی پڑی تھی مگر ان بدقسمتی تھی پولیس آن ٹپکی گارڈ کی رائفل کے شور نے انہیں متوجہ کر لیا تھا۔ ایک منٹ میں سلمان بھی مارا جا چکا تھا اور نوشاد زخمی حالت میں مع رقم کے پولیس والوں کے ہاتھ لگ گیا تھا مگر اسے ہسپتال پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے اس کی قضا آئی تھی یا رقم دیکھ کر پولیس والوں کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ نوشاد زندہ رہتا تو رقم کے بارے میں بیان دے سکتا تھا البتہ کوٹھی میں داخل ہونے میں پولیس کو ذرا تاخیر ہوئی۔ سجاد تجوری کی باقی ماندہ رقم اپنی کار کی ڈکی میں منتقل کر چکا تھا۔ کیونکہ گارڈ بھی مارا جا چکا تھا اور صابر انصاری بھی اصل حقیقت بتانے کے لیے زندہ نہیں رہا تھا اس لیے سجاد نے ان تینوں کو ڈاکو قرار دے دیا۔

☆ ☆ ☆

پرویز احمد کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے بھارتی سفارت خانے کا ایک معمولی افسر موجود تھا۔

''مسٹر پرویز احمد! مجھے افسوس ہے آئندہ کے لیے تم سے تمام روابط ختم کیے جا چکے ہیں۔''

''ختم کر دو میں نے تمہارے لیے کام نہیں کیا تھا بلکہ اپنے لیے کیا تھا۔'' پرویز

احمد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''او کے۔ اب میں اجازت چاہوں گا۔''

بھارت سفارت خانے کا افسر چلا گیا۔ پرویز احمد بے حد دکھی تھا اس نے برسوں کی محنت سے جو ٹیم تیار کی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئی تھی۔ منور علی کے بعد آذر نے بھی بیرون ملک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس نے بی بی سی میں جاب کر لی تھی۔ باقی سب ختم ہو گئے تھے۔ یکدم اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے خود سے کہا۔

''بے شک سب ختم ہو جائیں چلے جائیں۔۔۔ اس ملک سے میری جنگ جاری رہے گی اسے ختم کیے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھوں گا یا خود ختم ہو جاؤں گا۔''

یہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس کے الفاظ ابھی منہ میں تھے کہ اسے سینے میں شدید قسم کا درد اٹھا۔ اس نے ساری عمر نفرت کا جو زہر پیا تھا اس نے بالآخر اس کے دل پر اثر کر دکھایا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے پیروں نے اس دھرتی پر جمنے سے انکار کر دیا۔ جس سے وہ ساری عمر غداری کرتا آیا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا اور رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلیں گئیں۔ کتنے ہی غدار اس سے پہلے اور کتنے ہی اس کے بعد یہ حسرت لے کر ختم ہو جائیں گے اور یہ سرزمین انشاء اللہ قائم رہے گی۔

☆ ☆ ☆

راحیل اور نوشین ساحل پر کھڑے تھے۔ نوشین نے زرد رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور مناسب میک اپ کے ساتھ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ آج اتنے مہینوں بعد وہ بنی سنوری تھی۔ خاص طور سے راحیل کے لیے۔ اس نے محبت سے راحیل کی طرف دیکھا۔

''خدا کا شکر ہے اس نے مجھے انصاف دیا۔''

''ہاں۔۔۔ لیکن نوشین! کیا ہمارے ملک میں کبھی لوگ شعور کی اس سطح تک پہنچیں گے کہ انصاف کے مروجہ طریقے کو استعمال کریں۔ کب تک ہم انصافی کے خلاف غلط طریقوں سے لڑتے رہیں گے۔'' راحیل بولا۔

''ہاں مجھے احساس ہے کہ میں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ مگر پھر میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔''

"نوشین! تمہارے ساتھ ظلم ہوا لیکن میں سمجھتا ہوں۔ یہ این جی اوز اور نام نہاد انسانی حقوق کے علم بردار ان مظلوم عورتوں پر زیادہ ظلم کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور جب کام نکل جائے تو یہ انہیں کچرے کی طرح پھینک دیں گے۔"

"نہ جانے کب ہمیں عقل آئے گی۔" نوشین نے سرد آہ بھری۔

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں تو آ گئی۔ اب یہ بتاؤ کہ برات لے کر کب آؤں؟"

نوشین شرما گئی تھی اس نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جب مرضی ہو جناب کی!"

"بس میں نکل آ رہا ہوں۔"

"ہشت۔۔۔ اب اتنی جلدی بھی نہیں۔" نوشین بے اختیار بولی۔

"چلو ایک سال بعد۔"

"اتنی دیر۔۔۔"

نوشین کا جملہ ادھورا رہ گیا تھا اور راحیل کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

☆ ☆ ☆

ہم کھلونے

نازلی نے خیمے سے جھانکا اور اسے پھر یری سی آ گئی تھی۔ خیمے کے اندر گرمی تھی جبکہ باہر غضب کی ٹھنڈ تھی۔ اس کے باوجود اسے جو نظر آیا وہ سحر زدہ سی رہ گئی تھی۔ ذرا فاصلے پر واقع جھیل سے کہر اٹھ رہا تھا اور اس کے عقب میں سورج نمودار ہونے جا رہا تھا۔ جھیل کے کنارے اگی لمبی گھاس سے پرندوں کی ڈاریں پرواز کر رہی تھیں۔ یہ پرندے وسط ایشیائی ممالک سے سردیوں میں برصغیر کا رخ کرتے ہیں اور خاص طور سے تھر کے صحرا میں سرحد کے دونوں جانب جہاں پانی نظر آئے ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ جھیل کے دائیں بائیں تا حد نگاہ لہر دار صحرا پھیلا ہوا تھا۔

نازلی نے جوتے اور جیکٹ پہنی اور خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس وقت

مرادخان پہرے پر تھا۔ نازلی جھیل کی طرف جانے لگی تو اس نے جلدی سے مشورہ دیا۔

"بی بی جی۔۔۔! جھاڑی سے دور رہنا ادھر سانپ، بچھو بہت ہوتے ہیں۔"

"فکر نہ کرو مرادخان! میں جانتی ہوں۔"

نازلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور تیز قدموں سے جھیل کی طرف بڑھ گئی۔ یہ جھیل نہیں تھی بلکہ کوئی دو سو گز لمبا اور سو گز چوڑا نشیب تھا جس میں گزشتہ بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا اور جھیل بن گئی تھی۔ روزانہ بے شمار مقامی افراد اس سے پانی لینے آتے تھے اور امکان یہ تھا کہ گرما کے باقاعدہ آغاز تک یہ جھیل غائب ہو جائے گی۔ اس کی جھاڑیوں میں بسیرا کرنے والے پرندے بھی اپنے علاقے کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اس وقت تک نازلی بھی یہاں سے جا چکی ہو گی۔ اس لیے اسے پرواہ نہیں تھی کہ یہ جھیل جلد خشک ہو جائے گی۔ وہ فی الحال اس کے حسن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج نکل آیا اور جھیل سے اٹھنے والا کہر معدوم ہونے لگا۔

"نازلی بی بی۔۔۔! کیا دیکھتا ہے؟" اسے قریب سے رمیش کی آواز آئی۔

رمیش اٹھارہ انیس برس کا خوبصورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ وہ مندر کے مہا پجاری لکشمن کا بیٹا تھا۔ اس کڑاکے کی سردی میں بھی اس نے دھوتی کے اوپر محض ایک چادر لے رکھی تھی۔ جس سے اس کا ایک شانہ ہی چھپا تھا۔

"مائی گاڈ۔۔۔ رمیش! تم کو سردی نہیں لگ رہی؟" نازلی بے ساختہ بولی۔

"نہیں بی بی۔۔۔! مجھے بچپن سے عادت ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"آپ کو زیادہ سردی لگتی ہے۔"

"ہاں کیونکہ میں بچپن سے اس کی عادی نہیں ہوں۔" نازلی مسکرائی۔

"رمیش! کیا اپنے باپ کے بعد تم اس مندر کے مہا پجاری بنو گے؟"

"پتاجی یہی کہتے ہیں۔"

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ اس محدود سی جگہ سے نکل کر دنیا دیکھو۔"

اس نے تعجب سے نازلی کو دیکھا۔

"بی بی۔۔۔! محدود کہاں یہ تو بہت بڑا ہے۔۔۔۔ میں نے پورا تھر دیکھا

ہے۔ سرے پار بھی گیا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے اس صحرا سے نکل کر شہروں کو دیکھو۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ کراچی اتنا بڑا شہر ہو گا۔ یہ ہانگ کانگ سے بڑا ہے۔"

"نہیں بی بی۔۔۔! میرا صحرا سے باہر جانے کو دل نہیں چاہتا۔" رمیش نے انکار کیا پھر اس نے تجسس سے پوچھا۔

"بی بی۔۔۔! یہ بتاؤ آپ لوگ جو زمین کھود رہے ہیں اس سے کیا نکالو گے؟"

"ہم اس سے پرانی بستیاں برآمد کریں گے۔"

"پرانی بستیاں۔۔۔؟" رمیش کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"پرانی بستیاں دھرتی کے اندر کہاں ہو گی۔ وہ دھرتی کے اوپر ہوتی ہیں۔"

"دیکھو۔۔۔ یہ تمہارا مندر ہے پرانی بستی ہے۔ فرض کرو کوئی حادثہ ہو جائے ادھر کا پانی خشک ہو جائے تو تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے۔ مندر اور بستی ویران ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور پھر گرد پڑتی رہے گی۔ یہ سب مٹی کے نیچے دب جائے گا اور ایک وقت آئے گا جب اس پر دوسری بستی تعمیر ہو جائے گی۔ تب یہ زمین کے نیچے ہو گا۔ ایسے صدیوں پہلے اس زمین پر کوئی بستی آباد ہو گی جو اب زمین تلے جا چکی ہے۔ ہم اسے نکالنا چاہتے ہیں۔" نازلی نے اسے وضاحت سے سمجھایا۔

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ اس سے ہمیں پتا چلتا ہے پرانے زمانے میں لوگ کیسے رہا کرتے تھے۔"

"ایسے ہی رہتے تھے جیسا کہ آج رہ رہے ہیں۔" رمیش نے مندر اور بستی کی طرف اشارہ کیا۔

"پتاجی بتاتے ہیں کئی ہزار سال سے اس علاقے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

"ممکن ہے لیکن باقی دنیا بہت بدل چکی ہے۔ تم گھر سے نکل کر دیکھو۔"

"نہ بی بی۔۔۔! میں ادھر ہی بھلا۔ مجھے بس اپنا صحرا اچھا لگتا ہے۔"

"سنا ہے آنے والی جمعرات کو مندر میں کوئی جشن ہے؟" رمیش مسکرایا۔

"جشن نہیں بی بی۔۔۔! تیوہار ہے ہمارا۔۔۔ پوجا کی رات۔۔۔۔ ساری بستی مندر میں جمع ہو کر پوجا کرے گی۔ ناچے گی اور بھجن گائے گی۔ درگا دیوی کی پوجا ہوگی۔"

"کیا میں دیکھنے آسکتی ہوں۔"

"شاید نہیں۔۔۔ میں نے کبھی کوئی مسلمان اس، ات مندر میں نہیں دیکھا ہے ویسے مسلمان مندر آجاسکتے ہیں مسجد والے مولانا تو اکثر پتاجی سے ملنے آتے ہیں۔ دونوں دوست ہیں۔"

"اچھا!" نازلی کو تعجب ہوا۔

☆ ☆ ☆

دو مہینے پہلے نازلی امریکہ سے ایک کورس میں شرکت کر کے واپس ہانگ کانگ پہنچی تھی۔ اس کا باپ پروفیسر طارق تیس سال سے ہانگ کانگ میں تھا۔ وہ پڑھنے کے لیے یہاں آیا تھا اور دوران تعلیم نازلی کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ نازلی کی ماں چینی نژاد تھی نازلی کی پیدائش کے دو سال بعد وہ اپنے رشتہ داروں سے ملنے چین گئی اور ان ہی دنوں چین میں سیاسی ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ تیان من اسکوائر کا واقعہ پیش آیا تھا۔ ان ہنگاموں میں نازلی کی ماں اور پروفیسر طارق کی بیوی لاپتہ ہوگئی تھی۔ پروفیسر نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی خود دو بار چین کا سفر کیا مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ کئی سال بعد پروفیسر نے اپنی بیوی کے لئے صبر کر لیا تھا۔

پروفیسر کا حلیہ منفرد تھا۔ سامنے سے صاف چٹ، کانوں کے ساتھ بالوں کا سلسلہ دائرے میں اس کے پورے چہرے کا احاطہ کرتا دوسری طرف سر تک چلا جاتا تھا مونچھیں اور رخسار بالوں سے بالکل صاف تھے وہ مونوکل عینک لگاتا تھا جس کا عدسہ ڈوری سے منسلک ہمہ وقت اسکے کوٹ کی جیب میں موجود رہتا تھا۔ اسے اپنے شعبے کے بعد کسی شے سے دلچسپی تھی۔ نازلی تھی اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ طارق کی خواہش پر نازلی نے بھی آرکیالوجی کا شعبہ چنا تھا۔ ایک سال پہلے اس نے ایم فل کیا تھا اور پھر جدید مشینی آرکیالوجی کا ایک کورس کرنے امریکہ گئی تھی۔

پروفیسر نے اگرچہ قدیم چینی تہذیب پر تحقیقات میں نام کمایا تھا۔ اس کے پی ایچ

ڈی کے مقالے کا موضوع بھی قدیم چینی تہذیب تھا لیکن گزشتہ چند سال۔ سے وہ وادی سندھ کی قدیم تہذیب میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جن دنوں نازلی امریکہ میں تھی۔ پروفیسر نے پاکستان کا سفر کیا تھا وہ خاص طور پر تھر کے علاقے میں گیا تھا۔ اس نے میر پور خاص سے کوئی پچاس کلومیٹر جنوب مشرق میں ایک جگہ دیکھی تھی اور وہاں کچھ کھدائی بھی کروائی تھی۔ پھر واپس آکر اس نے یونیورسٹی سے پروجیکٹ کی درخواست کی تھی۔ ایک تو پاکستان کا معاملہ تھا جس میں چین کو ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ دوسرے کبھی یونیورسٹی نے بین الاقوامی طور پر کوئی خاص پروجیکٹ نہیں کیا تھا۔ اس لیے پروفیسر طارق کو اجازت مل گئی۔ پروجیکٹ کو پاکستانی اداروں کی مدد حاصل تھی اور پروفیسر اس کا انچارج تھا اسے تین پاکستانی معاونین فراہم کیے گئے تھے۔

پروفیسر کا ارادہ اس مقام پر کھدوائی کروانے کا تھا۔ سامان اور دوسرے انتظامات اس نے پاکستانی معاونین کے سپرد کر دیئے تھے اور خود نازلی کے ہمراہ سائٹ پر پہنچ گیا تھا پروفیسر کی دلچسپی کا مرکز وہاں موجود مندر کی قدیم عمارت تھی۔ سرخ اینٹوں سے تعمیر کیا جانے والا یہ مندر مخصوص طرز تعمیر کا نمونہ تھا جو مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ خستہ حال ہو رہا تھا۔ پروفیسر کے خیال میں یہ کم سے کم چھ سو سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور اس دور میں اس مقام پر کوئی بڑی آبادی تھی اتنا بڑا مندر بنا تھا۔ ورنہ اب اس کے ساتھ ایک معمولی سی بستی تھی جس میں بہ مشکل دو سو افراد آباد تھے۔ آبادی کی حالت بتاتی تھی کہ اسے بنے چند عشرے سے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر نے مندر کے مہا پجاری لکشمن سے اس آبادی کے بارے میں پوچھا تھا۔

"حیدر آباد سے لٹ پٹ کر آنے والے ہندو یہاں آباد ہوئے تھے۔" لکشمن نے بتایا۔

"کچھ مقامی بھی ہیں۔"

"یعنی پاکستان بننے تک اس علاقے میں ہندو آبادی کم تھی۔ پھر مندر کی دیکھ بھال کون کرتا تھا؟"

"ہمارے پرکھے۔" لکشمن نے فخر سے کہا۔

"بدترین حالات میں بھی وہ مندر چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے تم لوگ نسلوں سے اس جگہ آباد ہو۔ کیا تمہاری روایات میں اس جگہ کسی بڑی آبادی کا ذکر ملتا ہے؟" لکشمن نے ذرا تعجب سے دیکھا۔

"بابو۔۔۔! آبادی نہ ہوتی تو اتنا بڑا مندر کیسے بنتا۔۔۔ بھگوان خود تو آ کر بنانے سے رہا۔"

"یعنی اس طرف کوئی بڑی آبادی تھی۔" پروفیسر نے مندر کے چبوترے سے چاروں طرف دیکھا تھا۔

"لیکن اس کے آثار نظر نہیں آ رہے۔"

"سمے نے سب برباد کر دیا۔" لکشمن نے سرد آہ بھری۔

"یا زمین نے اسے چھپا لیا؟"

پروفیسر طارق نے بہ غور مندر کے چبوترے کو دیکھا جو زمین سے صرف چار پانچ سیڑھیاں بلند تھا جبکہ پرانے زمانے میں ایسی عمارتوں کی بنیاد خاصی اونچی رکھی جاتی تھی۔ عام سطح زمین سے کم سے کم بیس سے پچیس فٹ بلند اور اس پر اصل عمارت تعمیر کی جاتی تھی تاکہ باڑ آنے کی صورت میں اصل عمارت پانی سے محفوظ رہے۔ جبکہ چبوترے کی سطح زمین سے محض چار پانچ فٹ بلند ہونے کا مطلب تھا کہ زمین اس وقت کے مقابلے میں بہت اونچی ہو چکی ہے جب مندر کی عمارت بنی تھی۔ عمارت سے کوئی چار سو گز شمال کی جانب نشیب تھا جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا تھا اس وقت بھی اتنا پانی جمع تھا کہ اس پر جھیل کا گمان لگتا تھا۔ پروفیسر نے اس نشیب سے کوئی سو گز جنوب میں ایک جگہ منتخب کر کے کچھ کھدوائی کروائی تھی اور اسے بعض ایسی چیزیں ملی تھیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ اس جگہ زیر زمین کسی پرانی تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ لہذا اس نے پوری تیاری کے ساتھ پھر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہانگ کانگ اب چین کے زیر انتظام تھا۔ اس لیے پروفیسر دراصل چین کی طرف سے آیا تھا۔ اس لیے چین کی حکومت نے پروفیسر اور اس کی بیٹی کی حفاظت کی درخواست کی تھی۔ اس پر حکومت نے ان کے ساتھ رینجرز کا ایک دستہ بھیج دیا تھا۔ وہ جب تک اس جگہ

رہتے یہ دستہ ان کی حفاظت کرتا۔

☆ ☆ ☆

محبوب شاہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کا کہا قانون اور اس کا کیا درست ہوتا تھا۔ کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اس کے کسی بھی اقدام سے اختلاف کر سکے۔ محبوب شاہ کی زمینیں نہر کے آخری حصے میں تھیں اور اس حصے کی زمینوں کو پانی کم ملتا تھا لیکن محبوب شاہ کی زمینوں کو پورا پانی ملتا تھا۔ اسکی زمین پر آم کے باغات تھے۔ کپاس اور مرچ کی فصل لگتی تھی۔ کئی ہزار ایکڑ زمین اس کی ملکیت تھی اور دولت کے ساتھ رعیت کی جان و مال آبرو سے کھیلنے کے لیے بھی پوری طرح آزاد تھا۔ اس کی زمین پر دس بارہ ہزار افراد بستے تھے۔ یہ سب اس کے بے دام غلام تھے۔

اتنے افراد پر حکومت کرنے والا سیاست کے سبز چارے میں منہ نہ مارے یہ کیسے ممکن تھا۔ محبوب شاہ بھی سیاست کے کھیل کا شاطر کھلاڑی تھا۔ اس علاقے میں اس کے گروپ کی نشستیں صوبائی اور قومی اسمبلی کے لیے پکی ہوتی تھیں۔ اگر کسی پارٹی سے بات نہ بنتی تو یہ آزاد لڑتے تھے اور کوئی ان کے مدمقابل جیتنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ جو ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا یا اس کی نسلوں تک کے دشمن بن جاتے تھے اور جو ان کو مدد دیتا تھا ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے۔

پچھلے انتخابات میں صابر علی جو کھیوتے محبوب شاہ کے مدمقابل لڑ کر سیٹ حاصل کر لی تھی۔ محبوب شاہ ششدر رہ گیا تھا۔ صابر علی نے مضبوط پارٹی کا ٹکٹ حاصل کیا تھا اور عوام نے اسے ووٹ دیئے تھے اگرچہ وہ اپوزیشن کا حصہ رہا تھا اور محبوب شاہ حکومتی پارٹی کا ہوتے ہوئے بھی اسمبلی سے باہر تھا۔ یہ بات اس کے سینے میں آتش انتقام دہکانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ جب تک صابر علی کو مزہ نہیں چکھائے گا آرام سے نہیں بیٹھے گا۔

اسمبلی کی مدت پوری ہوتے ہی ملک بھر میں ہنگامے پھوٹ پڑے تھے۔ ایسے میں صابر علی انتخابی مہم کے دوران ایک جلوس کی قیادت کر رہا تھا کہ اچانک بم پھٹا اور صابر علی سمیت نصف درجن افراد ہلاک ہو گئے۔ الزام نامعلوم خودکش حملہ آور کے سر گیا اور

محبوب شاہ کا مقابلہ کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔اس بار بھی اس نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑنے کا فیصلہ کیا تھا گزشتہ انتخابات میں اسے دوسرا دھچکا اس کے حمایت کردہ اقلیتی امیدوار سندھورائے کی شکست سے پہنچا تھا۔ یہاں بھی میدان صابر علی کی پارٹی کے ہاتھ رہا تھا اور اس کا امیدوار ہندوؤں کے لیے مخصوص اقلیتی نشست پر کامیاب رہا تھا۔محبوب شاہ اب اس داغ کو مٹانے کی فکر میں تھا اور اس کام کے لیے اس نے عزیز چاچڑ کو طلب کیا تھا۔

عزیز چاچڑ سکھر کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہائشی تھا۔اوائل نوجوانی میں مجرمانہ سرگرمیوں میں پڑ گیا تھا۔اسکے بعد درجہ بہ درجہ ترقی کرتا ڈاکو بنا۔ان دنوں اس کا باقاعدہ گروہ تھا جس میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس دو درجن ڈاکو تھے جو ڈاکے، اغوا برائے تاوان اور شاہراہوں پر راہزنی کی وارداتوں میں ملوث تھے۔وہ بہت چالاک اور عیار شخص تھا۔کتنی بار پولیس نے سے گھیرا تھا مگر وہ اپنے ساتھیوں کو آگے کر کے بچ نکلا تھا۔ان دنوں عزیز چاچڑ محبوب شاہ کے لیے کام کر رہا تھا اور اسکے ایک دیہی بنگلے میں رہائش پزیر تھا اگرچہ فی الحال اسے پولیس سے خطرہ نہیں تھا لیکن وہ محتاط آدمی تھا۔آئے دن کسی نہ کسی بہانے بنگلے سے غائب رہا کرتا تھا۔اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ محبوب شاہ جیسے لوگ کسی کے نہیں ہوتے ہیں اور وقت پڑنے پر وہ اسے مرواتے ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ساتھ ہی وہ محبوب شاہ کو کوئی ایسا تاثر بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اس پر اعتماد نہیں کرتا ہے۔یہی وجہ تھی جب محبوب شاہ نے اسے بلایا تو اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے تسلی کر لی تھی کہ اس کے خلاف کوئی جال نہیں بچھایا گیا ہے۔

وہ رات کی تاریکی میں دو جیپوں میں سوار ساتھیوں کے ہمراہ محبوب شاہ کے باغات والے ڈیرے پہنچا تھا۔محبوب شاہ اپنی اوطاق میں بیٹھا نیلم پری سے دل بہلا رہا تھا ۔ولایتی وہسکی کو وہ نیلم پری کہتا تھا کئی دن سے طبیعت بے کیف تھی اردگرد سے کسی شکار کی اطلاع نہیں ملی تھی ۔اس کے آدمی گھر گھر کھوجتے پھرتے تھے ۔جیسے ہی کوئی جوان اور خوبصورت لڑکی نظر آتی ۔محبوب شاہ کو اطلاع کر دی جاتی تھی اور وہ موقع محل دیکھ کر اسے اٹھوا لیتا تھا۔عام طور سے جیسے لڑکی اٹھوائی جاتی تھی اسی خاموشی سے واپس بھی دی جاتی

تھی۔مگر مزاحمت کرنے والوں کا حشر خراب ہوتا تھا لڑکی اور اس کے گھر والے دونوں غائب کر کے محبوب شاہ کی نجی جیل میں پہنچا دیئے جاتے تھے جہاں وہ باقی عمر مشقت کرتے گزارتے تھے۔

اپنا اصلحہ محبوب شاہ کے آدمیوں کے حوالے کر کے عزیز چاچڑ اندر آیا اور غلامانہ انداز میں محبوب شاہ کے قدموں میں جھک گیا۔

''سائیں آپ کا خادم حاضر ہے۔''محبوب شاہ نے مخمور نظروں سے اسے دیکھا۔

''چاچڑ! تیرے ساتھ کتنے بندے ہیں؟''

''سائیں! دو درجن جاں نثار آپ کے پیروں پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔''محبوب شاہ پیتا رہا اور سوچتا رہا۔

''اس بار تیری جاں نثاری کی نہیں چالاکی کی ضرورت ہے۔''

''آپ حکم کریں سائیں۔''

''آنے والی رات کو درگاہ کے مندر میں کوئی جشن ہے۔''محبوب شاہ نے گلاس میں شراب انڈیلی۔

''تو جانتا ہے ان لوگوں نے پچھلے انتخابات میں میرے آدمی کو ووٹ نہیں دیا تھا۔''

''مجھے پتا ہے سائیں اور حیرت بھی ہے کہ یہ اب تک جیتے کیوں ہیں۔''

''اب جیتے نہیں رہیں گے۔''محبوب شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جب یہ سارے جمع ہوں گے تو وہاں دھماکہ ہوگا۔''

''دھماکہ۔۔۔؟''عزیز چاچڑ نے غور کیا۔

''دھماکہ کون کرے گا؟''

''وہی جو اس ملک میں دھماکے کرتے ہیں۔''محبوب شاہ معنی خیز انداز میں بولا۔

عزیز چاچڑ مسکرانے لگا۔

''سمجھ گیا سائیں۔۔۔!پر حکومت بھی تو تفتیش کرے گی۔''

''اسی لیے تو تجھے بلایا ہے۔ایک سر کا بندوبست بھی کرنا ہے۔۔۔خیال رہے سر

داڑھی والا ہو تو اچھا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سائیں! سر لانا میرا کام ہے۔ پر سائیں بم۔۔۔ میرے پاس اتنا بڑا بم نہیں ہے۔"

"بم تجھے ہم دیں گے۔ بم بھی ایسا کہ تو دیکھے تو کبھی نہیں جان سکے گا کہ یہ بم ہے۔"

"سائیں وہ کیسے؟"

"بس جب بم دیکھے گا تو سمجھ جائے گا۔ اب تو جا اور جا کر تیاری کر۔۔۔ یعنی سرکا بندوبست کر اور دھما کے بعد تیرے آدمیوں کو بچ کر بھاگنے والوں میں سے عورتیں اور لڑکیاں چن کر لے جانی ہوں گی۔ ان کو سیدھا میری جیل تک پہنچانا ہوگا۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات۔"

"سائیں کا کتا ہوں۔" عزیز چاچڑ نے دانت نکالے سائیں کی آنکھ کا اشارہ سمجھتا ہوں۔

وہ الٹے قدموں سے دروازے تک گیا اور اوطاق سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

عظیم، حماد اور طاہر پروفیسر کے پاکستانی معاونین میں سے تھے۔ عظیم اور طاہر محکمہ آثار قدیمہ سے تعلق رکھتے تھے لہذا اسی صورت میں کام کرنے کے قائل تھے جب سر پر پڑ جائے۔ جبکہ حماد کا تعلق ایک یونیورسٹی سے تھا۔ وہ لیکچرار تھا اور پروفیسر نے خود اس کا انتخاب کیا تھا اسے ان تینوں آدمیوں میں سے یہی کام کا آدمی لگا تھا۔ پروفیسر کا تعلق پاکستان سے تھا اور وہ بائیس برس کا تھا جب یہاں سے گیا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ سرکاری آدمی کیسے کام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے حماد کو یونیورسٹی سے لیا تھا حماد کو دلچسپی بھی تھی اور وہ پہلے بھی تھر کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ پروفیسر اور حماد مل کر کھدائی کے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ کھدائی کے لئے دو درجن مقامی مزدور حاصل کیے گئے تھے۔ ان کو کھدائی کے طریقے اور اوزاروں کا استعمال سکھایا گیا تھا۔ پروفیسر نے جو جگہ منتخب کی تھی اس جگہ بیک وقت سات مقامات پر اس طرح کھدائی شروع کی تھی کہ ہر مقام کا

دوسرے سے فاصلہ سو فٹ تھا۔ اس طرح ملنے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ مزدوروں کو ہدایت کی تھی کہ ملنے والی کسی شے کو نظر انداز نہ کریں اور نہ ان سے پوچھے بغیر کچرے میں پھینکیں۔ پروفیسر اور حماد مزدوروں کی نگرانی کرتے ہوئے آپس میں بات کر رہے تھے حماد نے کہا۔

"سر! کیا وجہ ہے کہ اس علاقے میں سوائے موہنجوداڑو کے اور کسی قدیم شہر کے آثار نہیں ملے جبکہ اس علاقے میں کئی شہر ہونا چاہیے تھے؟"

"اس کی سب سے بڑی وجہ دریائے سندھ خود ہے۔ اس نے اتنی بار اپنا رخ بدلا ہے کہ حب ندی سے لے کر رن کچھ تک شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جو سندھ کی گزرگاہ نہ رہا ہو اس کے بار بار رخ بدلنے سے یہ ساری پرانی تہذیبیں پانی کے دھارے میں بہہ گئیں دریا نے شہروں کو اس طرح نیست و نابود کیا کہ اب ان کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں رہی ہے۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں سر۔۔۔! پرانے زمانے میں تمام ہی شہر دریا کے کنارے آباد ہوتے تھے۔ اس وجہ سے ہمیں صرف دریاؤں کے کنارے کے آثار ملتے ہیں جو مستقل مزاجی سے ایک ہی مقام پر بستے ہیں۔"

اتنے میں ایک گڑھے میں کھدائی کرنے والے مزدور زور زور سے بات کرنے لگے تھے۔ پروفیسر اور حماد اس طرح بڑھے۔ مزدور آپس میں ایک دوسرے کو کوئی شے دکھا رہے تھے۔

"کیا چیز نکلی ہے۔" حماد نے جھک کر پوچھا۔

"سائیں! یہ دیکھو۔"

گڑھے کے اندر سے مزدور نے اسے ایک چوکور سی شے تھما دی۔ مٹی اور کسی قدرتی کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی لیکن حماد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ ایک چوکور دھاتی تختی تھی۔ اس نے اسے انگلیوں سے رگڑ کر صاف کیا۔ یہ شاید کانسی کی پلیٹ تھی جس پر ایک تنومند بیل کی شبیہ کھدی ہوئی تھی اور قدیم زبان میں کچھ تحریر تھا۔ اس نے پروفیسر کو دکھائی۔

"اوہ۔۔۔یہ کم سے کم پانچ سو برس پرانا ہے۔" پروفیسر پرجوش تھا۔

"ممکن ہے اس سے بھی زیادہ پرانا ہو۔" نازلی نے کہا۔ پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔

"آریاؤں کی آمد سے قبل اس علاقے میں کانسی کا رواج نہیں تھا۔ یہ شبیہہ ضرور ان شبیہوں سے ملتی ہے جو موہنجوداڑو سے ملی ہیں لیکن یہ اس سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ بہر حال اس کی اہمیت ہے سندھ کے مسلمان حاکموں کے دور میں بھی اس خطے میں پرانی رسومات ماننے والے لوگ تھے۔ یہ شبیہہ شاید مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔"

پروفیسر نے اسے اپنے رومال سے صاف کیا تو اندر کی دھات چمکنے لگی تھی۔

"پاپا آپ کا اندازہ درست نکلا۔"

"اب مجھے امید ہے کہ میں اس جگہ کوئی قدیم شہر دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔"

پروفیسر نے پرامید لہجے میں کہا۔ ہر آرکیالوجسٹ کی طرح کسی قدیم تہذیب اور انسانوں کے تمدن کی دریافت اس کا خواب تھی۔ اس نے اپنے اٹھارہ سالہ کیریئر میں علمی کام تو خوب کیا تھا۔ اس نے وسطی ایشیا اور مشرق بعید کی پرانی تہذیبوں کے بارے میں ایک اتھارٹی بنایا تھا۔ لیکن وہ اب تک کسی عملی کام سے محروم رہی تھی۔ اس لیے جب اسے اس جگہ کام کرنے کا موقع ملا تو اسے امید تھی کہ کسی قدیم ترین نہ سہی لیکن وہ کسی پرانی اور درمیانی عرصے کی آبادی کی دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

شام تک مزدور اس گڑھے سے کئی اور چیزیں دریافت کر چکے تھے۔ اس میں چاندی کا زیور اور ایک چاندی کی پلیٹ تھی جس پر کسی ہندو دیوی کی تصویر نقش تھی۔ وہ بیٹھنے کے انداز میں پوز بنائے ہوئے تھی۔ حماد نے تصدیق کی۔

"یہ درگاہ دیوی کی تصویر ہے۔ اس کا مندر بھی یہاں ہے۔"

"اس کا مطلب تھا کہ پرانے زمانے میں یہاں کوئی مندر تھا۔" نازلی بولی۔

"لازمی بات ہے۔ ہندومت اور بدھ مت اس خطے کے پرانے مذہب ہیں۔ اس لیے یہاں جا بہ جا پرانے مندروں کے نشانات ملتے ہیں۔" حماد نے بتایا۔

شام کو جب وہ اپنے خیموں کے سامنے الاؤ جلائے آگ تاپ رہے تھے تو لکشمن وہاں چلا آیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولا۔

"میں نے سنا ہے کھدائی کے دوران درگاہ دیوی کی مورتی ملی ہے۔"

"مورتی نہیں ہے۔۔۔ایک پلیٹ پر درگا دیوی کی تصویر ہے۔"

حماد نے اسے صاف کی ہوئی پلیٹ دکھائی۔ چاندی کا زنگ صاف کرنے کے بعد پلیٹ اور اس کی تصویر بالکل واضح ہو گئی تھی۔

مہا پجاری لکشمن نے غور سے تصویر دیکھی۔ یہ دھات پر تصویر نقش کرنے کا فن تھا جو اس خطے میں پرانے زمانے میں پایا جاتا ہے۔"

مہاراج یہ تصویر ہمارے دھرم سے سمبندھ رکھتی ہے اس لیے یہ ہمیں دے دیں۔"

"اس کا کسی مذہب سے زیادہ تاریخ سے تعلق ہے۔" پروفیسر طارق نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"اس لیے یہ کسی فرد کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ملکیت ہے۔"

"پھر بھی مہاراج میری بنتی ہے۔"

"تمہیں بتا دیا نا۔۔۔اس کا تعلق اس سرزمین کی پرانی تہذیب سے ہے۔" حماد نے اسے ڈانٹا۔

"ممکن ہے کھدائی کے دوران میں۔۔۔کوئی مندر اور اس کی رکھی ہوئی مورتیاں نکل آئیں تو کیا تم انکے بھی دعوے دار بن جاؤ گے حالانکہ یہ سب محکمہ آثار قدیمہ کی ملکیت ہوں گی۔" لکشمن وہاں سے سر جھکا کر چلا گیا۔ حماد تشویش میں پڑ گیا تھا۔

"پروفیسر! کوئی شرارت نہ کرے ہمیں ان چیزوں کی حفاظت کرنا ہوگی۔"

"تم فکر مت کرو۔ یہ میرے خیمے میں محفوظ رہیں گی۔ آج سے ایک پہرے دار مستقل میرے خیمے کے سامنے رہے گا۔" پروفیسر نے اسے تسلی دی تھی۔

اگلے روز پروفیسر نے سیٹلائٹ انٹرنیٹ کے ذریعے یونیورسٹی کے حکام کو اپنی کامیابی سے آگاہ کیا تھا۔ ان کو اشیاء اور سائٹ کی تصویر بھی بھیجی تھیں۔ چند ہفتے بعد

یونیورسٹی کے آرکیالوجی کا میگزین آنے والا تھا۔ پروفیسر چاہتا تھا کہ اس میں شائع ہو جائے۔ اگلے روز اس نے باقی تمام گڑھوں میں کھدائی کا کام رکوا کر باقی مزدوروں کو بھی اس طرف لگا دیا تھا۔ اس سے کام کی رفتار کہیں تیز ہو گئی تھی۔ شام تک گڑھے میں ایک دیوار اور کھڑکی دریافت ہوئی تھی۔ کوئی عمارت تھی جو وقت کے ہاتھوں مٹی میں دفن ہو کر رہ گئی تھی پروفیسر اور اس کے ساتھی بے حد پرجوش تھے۔

نازلی فارغ ہو کر جھیل کی طرف گئی تھی اور وہاں بسیرا کرنے والے پرندوں کی تصویریں لینے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے مڑ کر دیکھا رمیش تھا جو دلچسپی سے اسے تصویریں لیتے دیکھ رہا تھا۔

"بی بی کیسی ہو آپ؟"

"ٹھیک ہو۔۔۔ تم پھر آئے نہیں۔۔۔ آج بھی گڑھے سے بہت ساری چیزیں نکلی ہیں۔"

"پتا جی بتا رہے تھے کہ کل درگاہ دیوی کی تصویر نکلی ہے اس نے اشتیاق سے پوچھا۔"

"بی بی کیا مجھے دکھا سکتی ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں۔۔۔ تم کل صبح آنا میں دکھا دوں گی۔"

"ابھی بی بی۔۔۔ صبح تو مجھے بہت سارے کام ہیں۔"

"اچھا ابھی دکھا دوں گی۔" نازلی نے کہا۔

نہ جانے کیوں اسے یہ معصوم نوجوان اچھا لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے اندر کی معصومیت برقرار تھی۔ اس وجہ سے وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"بی بی آپ کو پنچھی اچھے لگتے ہیں؟"

"ہاں جبھی تو ان کی تصویریں لے رہی ہوں۔" نازلی نے ایک مرغابی کی تصویر لی۔

"اور تمہیں؟"

"مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔۔۔ پر یہ چلے جاتے ہیں۔" رمیش کا لہجہ بچگانہ تھا۔

"ہاں جو آتے ہیں ان کو جانا بھی ہوتا ہے۔"

"بی بی آپ بھی چلی جاؤ گی؟" اس بار رمیش نے ذرا عجیب سے لہجے میں کہا۔ نازلی نے اسے چونک کر دیکھا۔

"ہاں میں بھی چلی جاؤں گی۔"

اس جواب کو سن کر رمیش کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔ نازلی اسے غور سے دیکھ رہی تھی، اس نے کیمرہ رمیش کی طرف کر کے اس کی تصویر اتار لی۔ وہ چونکا۔

"میری تصویر کیوں بی بی؟"

"بس یادگار رہے گی۔ آؤ میں تمہیں تمہاری دیوی کی تصویر دکھاتی ہوں۔"

"جدھر سے کوئی تصویر نکلی ہے ادھر کوئی مندر تھا؟"

"ممکن ہے کیونکہ ایک دیوار اور کھڑکی نکلی ہے۔"

وہ رمیش کو پروفیسر کے خیمے میں لائی۔ اسے علم تھا کہ تصویر اور بیل والا منقش پتھر کہاں رکھا تھا۔ رمیش نے ان کو دلچسپی دیکھا۔

"ایسی تصویریں مندر میں بھی دیوار پر بنی ہیں۔"

"اچھا!" نازلی نے اشتیاق سے کہا۔

"رمیش! کیا تم مجھے مندر اندر سے دکھا سکتے ہو؟"

"نہیں بی بی۔۔۔ آپ مسلمان ہیں۔۔۔ آپ مندر میں نہیں آسکتیں۔" اس نے انکار کیا۔

"پتا جی کو پتا چل گیا تو بہت ناراض ہوں گے۔"

"ان سے چھپ کر نہیں لے جا سکتے؟" نازلی نے التجا کی۔

"بہت مشکل ہے۔" رمیش سوچ میں پڑ گیا تھا پھر چونکا۔

"ہاں۔۔۔ ایک کام ہو سکتا ہے بی بی۔۔۔ پرسوں تیوہار ہے اس میں پوری بستی آئے گی آپ بھی لوگوں کے درمیان آ جانا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن کوئی مجھے پہچان تو نہ لے گا۔"

"آپ ادھر کی عورتوں جیسے کپڑے پہن لینا۔ سر پر چنری ڈال لینا۔ پھر کوئی

نہیں پہچانے گا۔"

"جشن کب شروع ہوگا؟"

"نصف رات سے صبح تک جاری رہے گا۔ہم ناچتے گاتے ہیں درگا دیوی کی پوجا ہوتی ہے پرساد کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔"

"شراب۔۔۔!" نازلی چونکی۔

مندر میں شراب؟"

"یہ ہماری پوجا کا حصہ ہے بی بی۔۔۔!" رمیش نے سادگی سے کہا۔

"اب میں جاؤں؟"

رمیش کے جانے کے بعد نازلی پلان بنانے لگی تھی۔کہ اسے کس طرح مذہبی تقریب میں شرکت کرنا ہے سب سے پہلا مرحلہ کپڑوں کا حصول تھا۔

☆ ☆ ☆

تھر کا جنوب مشرق اور مشرق میں دراز ہوتا ہوا بھارت میں راجستھان کے صحرا سے جا ملتا تھا۔سرحد کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔بڑے شہر سرحد سے ذرا فاصلے پر ہیں۔راجستھان کا مرکزی شہر جے پور ہے اور سرحد سے پاس ہونے کی وجہ سے یہاں بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کئی دفاتر تھے۔ان میں سے ایک دفتر میں شام کے وقت بھی گہما گہمی تھی۔دہلی سے ایجنسی کا اعلیٰ افسر آیا ہوا تھا اور مقامی افسران سے اس کی خاص میٹنگ تھی۔اے جے ملہوترا نامی یہ افسر خاص طور سے پاکستانی ڈیسک کا انچارج تھا اس کے ساتھ اسکا آپریشن چیف بھی آیا تھا۔

مقامی افسران حیران تھے کہ ایسا کون سا اہم کام ہے جو دہلی سے افسر آرہے ہیں آخری بار یہ لوگ اس وقت آئے تھے جب دونوں ملکوں کی افواج سرحدوں پر آمنے سامنے کھڑی تھی اور حالات نارمل تھے بلکہ دونوں ملکوں میں دوستی کے وفود کا تبادلہ ہو رہا تھا برصغیر کی تقسیم کے بعد پہلی بار تھر میں مونا باؤ کا ریلوے اسٹیشن آپریشن میں آیا تھا۔تھر ایکسپریس چلنے لگی تھی۔ایجنسی کے مقامی چیف نے ملہوترا سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"سر! ایسا کون سا اہم کام ہے جس کے لیے آپ نے آنے کی زحمت کی؟"

ملہوترا سخت چہرے والا شخص تھا۔اس کی آنکھوں سے سخت دلی عیاں تھی۔اس درجے کے افسر کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔اس نے کہا۔

"مسٹر ایس کے سنگھ۔۔۔!شاید آپ موجودہ حالات سے دھوکا کھا رہے ہیں حالانکہ آپ کو کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ پاکستان ہمارا دوست ملک ہے یا بن سکتا ہے۔آپ کو ہمیشہ اکھنڈ بھارت کے بارے میں سوچنا چاہیے اور اس میں واحد رکاوٹ پاکستان ہے ہمیں ہمیشہ پاکستان کے خلاف منصوبوں پر غور کرنا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں سر۔۔۔!" ایس کے سنگھ نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"اسی وجہ سے آپ سے سوال کیا تھا۔اس پلاننگ کا ہمیں بھی علم نہیں ہے حالانکہ ہم فیلڈ ورکرز ہیں۔"

"پلان چھوٹا سا ہے لیکن مستقبل کے پلانز کا بہت اہم حصہ ہے۔یہ امن وامان اور صلح کی باتیں محض عارضی ہیں۔ابھی بھارت خود کو مغرب کے سرمائے سے معاشی طور پر مضبوط بنا رہا ہے اور جیسا کہ اس کے علم میں ہے ہم نے جنگی تیاریوں میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اسلحے اور اس کی ٹیکنالوجی کے حصول کے نئے معاہدے کیے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ہم مغربی دریاؤں پر ڈیم بنا کر ایسی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں جس کا مقصد آنے والے دس برسوں میں دشمن کی زراعت کو تباہ کرنا ہے۔یہ سب کہنے کا مقصد آپ کو یاد دلانا ہے ہمارے عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔صرف طریقہ کار بدلا ہے۔"

"تھینکس گاڈ!" ایس کے سنگھ مسکرایا۔

"ورنہ ہمیں تو اپنی جان اور نوکریوں کی فکر پڑ گئی تھی۔کہ فارغ ہی نہ کر دیے جائیں اب ہماری ضرورت نہیں رہی ہے۔"

"ضرورت پہلے سے زیادہ ہے مسٹر ایس کے سنگھ۔" ملہوترا نے سنجیدگی سے کہا۔

"اب مسٹر روی ورما۔۔۔ہماری ڈیسک کے آپریشن انچارج پلان کی وضاحت کریں گے۔"

روی ورما کے اشارے پر دو افراد ایک دو فٹ لمبا چوڑا اور کوئی چار فٹ اونچا لکڑی کا ڈبا لے کر آئے۔اسے میٹنگ ٹیبل کے وسط میں رکھ کر لکڑی کے تختے ہٹانے لگے۔جب

تھے تو اندر سے سیاہ رنگ کا مجسمہ برآمد ہوا۔ اس کی اونچائی تین فٹ کے قریب تھی برہنہ عورت کے اس مجسمے نے صرف زیورات پہن رکھے تھے۔۔۔ یہ مخصوص راجستھانی انداز کے زیورات تھے۔ عورت کا بایاں ہاتھ بائیں طرف کے گھٹنے پر تھا اور دایاں ہاتھ کمر پر تھا بائیں ہاتھ میں بازو کے اوپر سے کلائی تک چوڑیوں کی صورت میں کڑے تھے۔ سر کے بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے اور گلے میں چاندی کا چوڑے تعویز والا لاکٹ اور ہار تھا۔

ایسے مجسمے راجستھان میں عام ملتے تھے۔ بعض مندروں میں ایسے مجسمے لکشمی دیوی کے طور پر پوجے جاتے تھے۔ حالانکہ یہ بنگال میں بننے والے لکشمی دیوی کے مجسموں سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ ایس کے سنگھ نے سوالیہ نظروں سے ملہوترا کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے سر؟"

"بہ ظاہر بھاری پلاسٹک سے بنا ہوا مجسمہ ہے۔"

روی ورما نے جواب دیا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی مجسمے کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے۔ ناپسندیدگی اسکے چہرے سے عیاں تھی۔

"اور حقیقت؟" اس بار ایس کے سنگھ نے روی ورما سے ہی پوچھا۔

"جدید ترین ہائی ایکسلوسیو میٹریل سے بنا ہے۔ محض ایک اور مادے کو ریلیز کرنے کی ضرورت ہے یہ پورا ہی مجسمہ سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں گیس میں بدل جائے گا۔ اس سے ہونے والا بم دھماکہ خیز مادے سے کم سے کم دگنا ہوگا۔ دھماکے کی شدت اور محفوظ ہونے کے لحاظ سے صرف C4 پلاسٹک دھماکہ خیز اس کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ یہ ہمارے سائنس دانوں کی ایجاد ہے اسے آسانی سے کسی بھی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔"

"مولڈنگ کے دوران یہ خطرناک نہیں ہوتا؟ اتنا ہی جتنا کہ عام پلاسٹک ہوسکتا ہے۔ جب تک اس سے دوسرا ایک اور خاص مادہ ٹچ نہیں کیا جاتا ہے یہ بے ضرر رہتا ہے۔" روی ورما نے بتایا۔

"وہ مادہ کہاں ہے سر!؟" ایک جونیئر افسر نے سوال کیا۔

"اس کے اندر ہے۔"

یہ سنتے ہی وہاں موجود افسران کے چہرے پر خوف نظر آنے لگا تھا۔ روی ورما نے ان کو تسلی دی۔

"وہ چیز ایک میکنزم کے تحت محفوظ ہے۔ جب تک وہ میکنزم حرکت میں نہیں آئے گا۔ بم بلاسٹ نہیں ہوگا۔"

"یہ اتنا ہی محفوظ ہے جتنا کہ دوسرا بم ہوسکتا ہے۔" ملہوترا نے کہا۔

"اسے پاکستان پہنچانا ہے۔"

"کوئی بڑا پلان ہے سر؟" ایس کے سنگھ نے غور کیا۔

"نہیں میں نے بتایا نا۔۔۔ پلان چھوٹا سا ہے۔۔۔ لیکن یہ آئندہ کے بڑے پلان کا حصہ ہے۔"

روی ورما نے ایک سی ڈی نکال کر ایس کے سنگھ کے حوالے کی۔

"اس میں تمام تفصیلات ہیں۔ اس مجسمے کو کیسے اور کہاں پہنچانا ہے۔ درمیان کے روابط بھی اس میں ہیں۔۔۔ لیکن خیال رہے یہ ٹاپ سیکرٹ ہے یہ باتیں ہم پانچ افراد کے علاوہ اور کسی کے علم میں نہیں آنی چاہئیں۔"

"ہم جانتے ہیں سر۔۔۔! ہمارے پیشے میں رازداری کی بنیادی اہمیت ہے۔" ایس کے سنگھ نے جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

غلام فرید ایک عام سا نوجوان تھا اور عام سے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ کسان تھا۔ سندھ اور پنجاب کی سرحد کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا غلام فرید نے ایک مدرسے سے قرآن کریم حفظ کیا تھا اور اسکول سے مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے بعد وہ صادق آباد میں محنت مزدوری کا کام کرنے لگا تھا۔ پھر اس کے ایک آدمی نے اس کو کراچی آنے کو کہا یہاں مزدوری اچھی مل جاتی تھی اور کام بھی زیادہ تھا۔ صادق آباد چھوٹا شہر تھا جہاں کام کم ملتا تھا اور مزدوری بھی کم تھی۔ غلام فرید نے اپنے باپ سے مشورہ کیا اس نے بھی اس فیصلے کی تائید کی تھی۔

"تو چار پانچ سال کراچی میں رہ کر اتنا کمالے گا کہ ادھر اپنا کام کرسکے۔ یہ سوچ

کر میں جانا چاہتا ہوں۔" غلام فرید نے باپ سے کہا۔

لیکن اس کی ماں اسے جانے کی اجازت دینے سے ہچکچا رہی تھی۔ کراچی دور تھا اور غلام فرید اس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیاہ دی تھی اور دوسری غلام فرید سے خاصی چھوٹی تھی۔

"تو میری آنکھ سے دور جائے۔۔۔ مجھے گوارہ نہیں ہے۔" غلام فرید کی ماں نے کہا۔

"ماں۔۔۔! میں کراچی سے بھی آجاؤں گا۔ زیادہ دور نہیں ہے بس سے، ٹرین سے دس بارہ گھنٹے لگتے ہیں۔" غلام فرید نے ماں کو سمجھایا۔

"پھر سکینہ کی شادی بھی کرنی ہے۔ اس کے لیے بھی تو پیسہ جوڑنا ہوگا۔"

اس دلیل نے ماں کو قائل کرلیا۔ ان کے پاس جو تھا وہ پہلی بیٹی کی شادی پر لگا چکے تھے اور سکینہ پندرہ سال کی ہونے والی تھی۔ شادی کے قابل ہو چکی تھی اور ان میں شادی جلد کرنے کا رواج تھا۔ ادھر غلام فرید اور اس کا باپ جو کماتے تھے اس سے تو بہ مشکل گزارہ ہی ہوتا تھا اس لیے ماں نے دل پر پتھر رکھ کر اسے کراچی جانے کی اجازت دے دی تھی۔

غلام فرید صرف انیس برس کا تھا لیکن اپنے ڈیل ڈول اور چہرے پر سجی ہلکی سی داڑھی کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا پہلے غلام فرید نے ٹرین سے جانے کا سوچا تھا لیکن پھر اس نے بس کا ٹکٹ لے لیا۔ اس نے سنا تھا کہ بس جلدی اور آرام سے پہنچا دیتی تھی۔ جبکہ ٹرین میں دھکے کھانے پڑتے تھے۔ پھر اس کے گاؤں سے بس اسٹاپ زیادہ قریب تھا۔ ٹرین کے لیے اسے صادق آباد جانا پڑتا جبکہ وہاں عام طور سے ساری ہی ٹرینیں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔

غلام فرید صبح سویرے روانہ ہوا تھا۔ باپ غلام محمد اسے اسٹاپ تک چھوڑنے آیا تھا بس وقت پر آئی۔ غلام فرید باپ کے گلے لگ کر جلدی سے بس میں سوار ہوگیا۔ اسکا چھوٹا سا بیگ اس کے ساتھ تھا۔ یہ بڑی بس تھی جس میں کشادہ سیٹیں اور ائر کینڈیشنر بھی تھا لیکن اس موسم میں ہیٹر کی ضرورت تھی غلام فرید پہلی بار اپنے گاؤں سے اتنی دور جا رہا تھا کراچی میں اس کا رشتے دار سہراب گوٹھ کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس نے غلام فرید سے کہا تھا کہ سہراب

گوٹھ پر اتر کر اس کے موبائل نمبر پر کال کردے وہ اسے آکر لے جائے گا۔

بارہ بجے بس نیشنل ہائی وے کے کنارے ایک ہوٹل کے سامنے رکی مسافروں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور بس آگے روانہ ہوئی بس ڈرائیور نے بتایا تھا کہ وہ پانچ بجے تک کراچی میں ہوں گے۔ پیٹ بھرنے کے بعد غلام فرید کو اونگھ آنے لگی تھی وہ سو گیا تھا اچانک بس جھٹکے سے رکی اور جب مسافروں نے ذرا شور کیا اور کوئی درشت لہجے میں سب کو خاموش رہنے کا حکم دینے لگا تو غلام فرید کی نیند بھاگ گئی۔ ڈھائے پوش مسلح افراد کو دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا۔ ڈاکو مسافروں کی تلاشی لے رہے تھے حتیٰ کہ وہ عورتوں کو بھی نہیں بخش رہے تھے ایک ڈاکو غلام فرید کے پاس آیا اسے کھڑا ہونے کا حکم دیا اور اسکی تلاشی لی۔ غلام کا بٹوا اور گھڑی قبضے میں لے لی اور پرس میں صرف پانچ سو روپے تھے ڈرائیور نے بس ایک طرف روک دی تھی۔ اسکے پاس موجود نقدی بھی ڈاکو لوٹ چکے تھے چار ڈاکو بس میں تھے اور دو باہر کھڑے تھے۔ وہ ایک بڑے سائز کی جیپ لے کر آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا۔ ایک ڈاکو جو ڈرائیور کے پاس کھڑا تھا مسافروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"اڑے چھورا! ادھر آ۔" اس نے غلام فرید کو اشارہ کیا۔

"میں؟" غلام فرید گھبرا گیا تھا۔

"ہاں تو۔۔۔ اور کون!" وہ شخص غرایا۔

ڈھائے سے جھانکتی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ بہت خوں خوار لگ رہا تھا۔

"اٹھ!" ایک دوسرے ڈاکو نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی طرف دھکیل دیا۔ اس ڈاکو نے سر سے پاؤں تک غلام فرید کا جائزہ لیا۔

"چلے گا۔" اس نے جیسے خود سے کہا اور پھر بلند آواز سے بولا۔

"اڑے چھورا کو جیپ میں بٹھاؤ یہ ہمارے ساتھ جائیگا۔"

"نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" غلام فرید گھبرا کر بولا۔

"بکواس نہ کر چھورا۔"

دوسرے ڈاکو نے اسے دھکا دیا اور اسی طرح دھکے دے کر بس سے نیچے اتار دیا تھا۔ اس نے باہر موجود ایک ڈاکو سے کہا کہ لڑکے کو جیپ میں بٹھائے۔ اس نے سیون ایم

ایم کی نال کے زور پر غلام فرید کو جیپ میں دھکیل دیا تھا۔ دس منٹ میں اپنا کام مکمل کر کے بقیہ ڈاکو بھی لوٹ کے مال سمیت جیپ میں آ گھسے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اس گڑھے کے پاس کھدائی اگلے روز بھی جاری رہی تھی۔ زیادہ مزدوروں کی وجہ سے مٹی ہٹانے کا کام آسان رہا تھا۔ حماد نے ہندوؤں کی بستی سے نصف درجن مزدور اور بلوا لیے تھے جن کا کام کھدائی سے نکلنے والی مٹی کو دور کرنا تھا تاکہ کوئی مسئلہ باقی نہ رہے دیوار اور کھڑکی مکمل طور پر سامنے آ گئی تھی۔ دیوار سپاٹ ہی تھی اور کھڑکی کے پٹ غائب تھے یہ کسی بڑی عمارت کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ پروفیسر نے لکشمن سے بات کی لیکن اس نے کسی ایسے مندر کی موجودگی سے انکار کر دیا جو تباہ ہو گیا ہو۔

"صاحب۔۔۔۔! یہ صدیوں پرانی بات ہے۔"

"بستی میں ایسے ہندو ہیں جو نسلوں سے یہاں آباد ہیں؟"

"بالکل ہیں۔" لکشمن نے سر ہلایا۔

"ان میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو پرانے واقعات یاد ہوں۔" حماد نے درمیان میں مداخلت کی۔

"ممکن ہے ان کو کسی ایسی روایت کا علم ہو جس میں اس مقام پر کسی تاریخی عمارت کا علم ہو۔"

"دریافت ہونے والی عمارت یقیناً مندر کی ہے کیونکہ اس میں مخصوص طرح کی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ ایسی اینٹیں پرانے دور میں مندروں کی تعمیر کے لیے مخصوص تھیں۔"

"میں تلاش کروں گا صاحب۔۔۔۔!" لکشمن نے یقین دلایا تھا۔

دیوار کے ساتھ بے شمار اشیا بھی ملی تھیں لیکن ان میں سے بیشتر تباہ شدہ تھیں۔ یا مٹی نے ان کو گلا سڑا دیا تھا۔ بہرحال پھر بھی بہت کچھ بچا تھا۔ نازلی شام کے وقت اپنے خیمے کے سامنے ایک چادر پر رکھ کر ان اشیا کی تصویر لے رہی تھی۔ اسکے بعد سے ان کا اندراج کرنا تھا۔ اچانک ہی نزدیک سے کسی طاقتور گاڑی کے انجن کے غرانے کی آواز آئی

وہ چونگی ایک بڑی فوڈ جیپ اس طرف آ رہی تھی۔ وہ پاس آ کر رکی اور سب سے پہلے اس کی عقبی نشست سے دو مسلح افراد کودے انہوں نے جیپ کے دائیں بائیں پوزیشن سنبھال لی اس کے بعد جیپ سے ایک سیاہ رنگ کا شخص بڑے کروفر سے اترا۔ اس نے سر پر سفید رنگ کا کپڑا باندھ رکھا تھا اور مونچھیں چڑھی ہوئی تھیں وہ تقریباً پچاس برس کا شخص تھا نازلی کو اس کا انداز بدمعاشوں جیسا لگا تھا وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی اس شخص نے نازلی کو غور سے دیکھا۔ نازلی نے جرسی اور پتلون کے اوپر عنابی رنگ کی شال لے رکھی تھی۔ جس کے شانے والے حصے پر تتلی کے پروں جیسی گرہ تھی۔ یہ صرف فیشن تھا ورنہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں تھا شال جدید قسم کے کپڑے کی ہلکی اور بے حد گرم تھی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے بالوں اور اسی رنگ کی آنکھوں کے ساتھ نازلی دلکش لگ رہی تھی اور کوئی دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن اس شخص کی آنکھوں میں اتنی کھلی بے غیرتی تھی کہ نازلی کو غصہ آ گیا۔ اس نے ناگواری سے اسے دیکھا اور اپنے خیمے میں چلی آئی جیپ کی آواز سن کر حماد اس طرف چلا آیا تھا۔ پروفیسر سائٹ پر تھے حماد نے اسے غور سے دیکھا اور محتاط انداز میں بولا۔

"اے چھورا۔۔۔۔! ہمارا نام محبوب شاہ ہے اور یہ سارا علاقہ ہماری جاگیر میں شامل ہے۔"

"لیکن یہ تو سرکاری زمین ہے۔" اس بار حماد نے ذرا بدلے لہجے میں کہا۔

"میرا نام چھورا نہیں حماد ہے۔"

"زمین سرکار کی ہو یا کسی کے باپ کی۔" محبوب شاہ نے تکبر آمیز انداز میں کہا۔

"پر ادھر حکم محبوب شاہ کا ہی چلتا ہے۔"

تم کون ہو؟"

"بتایا تو ہے۔"

اے سائیں سے سیدھے لہجے میں بات کر۔" محبوب شاہ کے ایک لڑکے نے غرا کر کہا۔

حماد پریشان ہو گیا تھا یہ مصیبت کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ حقیر سے لوگ خود کو فرعون وقت سے کم نہیں سمجھتے۔ اس نے حفاظتی دستے کے سربراہ حوالدار

خان محمد کو بلایا۔

"خان محمد! یہ لوگ ادھر آئے ہیں۔ ان سے پوچھو یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"جی صاحب کیا بات ہے؟" خان محمد نے براہ راست محبوب شاہ سے پوچھا۔

"ادھر کا حاکم کون ہے؟" محبوب شاہ نے پوچھا۔

"پروفیسر طارق صاحب ہے وہ ادھر کام رہا ہے۔"

"اسے ادھر بلاؤ۔" اس بار محبوب شاہ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"سائیں! کیا کرتے ہو۔ ادھر تو چیف منسٹر بھی آئے تو اسے خود پروفیسر سے ملنے جانا ہوگا۔"

"چیف منسٹر ملتا ہوگا پر ادھر مالک ہم ہیں۔" محبوب شاہ نے غصے سے کہا۔

"تب انتظار کرو۔ ابھی پروفیسر صاحب آتا ہوگا۔" خان محمد نے رکھائی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

محبوب شاہ کے انداز سے لگ رہا تھا وہ بہ مشکل خود پر ضبط کر رہا ہے۔ شاید اسے عادت نہیں تھی کہ کوئی اسے نظر انداز کرے۔ خاصی دیر بعد پروفیسر اس طرف آئے انہوں نے محبوب شاہ کو دیکھا۔

"تم کون ہو؟"

"سائیں! میں محبوب شاہ ہوں۔ یہ ساری زمین میری ہے۔"

"غلط۔۔۔ اگر یہ تمہاری زمین ہوتی تو ہم اس پر کس طرح کھدائی کر سکتے تھے۔" محبوب شاہ کھسیانا ہو گیا۔

"میرا مطلب ہے سائیں۔۔۔! میں ادھر کا حاکم ہوں۔"

"یہ علاقے کی تمام زمین کو اپنا سمجھتے ہیں۔" حماد نے طنز کیا۔

"سائیں کیسے زحمت کی؟" پروفیسر نے جلدی سے پوچھا۔

"بات یہ ہے سائیں کہ ادھر باغ میں میری عمارت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ ادھر خیموں میں رہنے کی بجائے ادھر آ کر رہو۔"

"شکریہ محبوب شاہ صاحب۔۔۔! لیکن ہم خیموں میں رہنے کے عادی ہیں۔"

"سائیں! ادھر سردی ہے۔ بارش بھی ہو سکتی ہے پھر ڈاکو کا خطرہ ہے آپ کے ساتھ لڑکی ہے۔"

"اس کے لیے ہمارے ساتھ رینجرز ہے۔ آپ فکر مت کرو سائیں۔۔۔!" پروفیسر نے بے زاری سے کہا۔

"اور کوئی بات؟"

"نہیں۔۔۔ میں یہی کہنے آیا تھا۔ اب مجھے اجازت دو۔" محبوب شاہ کے جانے کے بعد پروفیسر نے حماد سے پوچھا۔

"یہ کیا نمونہ تھا؟"

"شہروں سے نکل جائیں تو پورے ملک میں جا بہ جا ایسے ہی نمونے نظر آتے ہیں۔" حماد نے گہری سانس لی۔

"شاید اس نے مس سے کچھ کہا ہے۔ وہ غصے سے اندر جا رہی تھیں۔" پروفیسر نے نازلی کو آواز دی۔

"اس شخص نے تم سے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں بابا! لیکن مجھے اس کا انداز دیکھ کر کوفت ہو رہی تھی۔ اسلئے میں اندر چلی گئی نازلی نے جھوٹ بولا۔

اسے باپ سے کہتے شرم آ رہی تھی کہ وہ اسے کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر سر ہلاتے ہوئے اپنے خیمے میں چلے گئے اور نازلی اپنا کام کرنے لگی تھی۔ اس نے تصویریں مکمل کر کے ایک فہرست بنائی۔ اس کے بعد وہ حسب معمول ٹہلنے کے لیے جھیل کی طرف چلی گئی۔ وہاں پر قریبی بستی سے عورتیں پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ نازلی ان کی تصویریں لینے لگی۔

نوجوان لڑکیاں اور عورتیں شرما رہی تھیں۔ ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے سے مذاق کر رہی تھیں۔ البتہ ان میں سے ایک اپنے تانبے کے گھڑے کو کمر پر رکھے ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ اس کے سانولے سے پرکشش چہرے پر ایسی اداسی تھی کہ نازلی نے خاص طور سے اس کی تصویر اتاری تھی۔

"بی بی۔۔۔! سیتا کی تصویر لے رہی ہو؟" نازلی کو حسب معمول پاس سے رمیش کی آواز آئی۔

"یہ ہے کون؟" نازلی نے پوچھا۔

"اس کے چہرے پر کتنی اداسی ہے۔"

"بے چاری کے ساتھ بڑا انیائے ہوا ہے۔ ظالموں نے اس کی عزت برباد کردی۔" نازلی چونکی تھی۔

"کس نے۔۔۔ کون ظالم ہیں؟"

وڈیرہ محبوب شاہ۔۔۔!" رمیش نے نفرت سے کہا۔

"اسکے کارندے اس بے چاری کو اغوا کر کے لے گئے تھے تین دن تک اس کے ماتا پتا محبوب شاہ کے سامنے روتے گڑگڑاتے رہے تب کہیں جا کر واپس کیا۔ پر تب سے بیچاری اب تک کشٹ ہی اٹھا رہی ہے۔"

"پولیس نے محبوب شاہ کو پکڑا نہیں؟"

"بی بی! ادھر سب اس کی مٹھی میں ہیں پولیس بھی اس کی اپنی ہے۔"

"میرے خدا اتنی لاقانونیت ہے اس ملک میں۔"

نازلی کو محبوب شاہ کی پرہوس نگاہیں یاد آ گئی تھیں۔ اسے یہ شخص اچھا نہیں لگا تھا وہ اتنا بڑا مجرم اور ظالم نکلے گا۔ نازلی نے افسوس سے سیتا کو دیکھا جو دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے جانے کے بعد جھیل سے پانی بھر رہی تھی۔ رمیش نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میری بستی کی کتنی لڑکیوں کی عزت برباد ہو چکی ہے۔"

"تم لوگ اس کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔"

"جن لوگوں نے ذرا بھی آواز نکالی وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں یا محبوب شاہ کی جیل میں ہیں۔" رمیش نے بتایا کہ محبوب شاہ علاقے کا بھگوان ہے۔

"وہ ایک انسان ہے۔"

"ہاں۔۔۔ پر بھگوان بھی اس کی مرضی میں دخل نہیں دیتا ہے۔"

"سب مل کر اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں تو یہ کیا کر لے گا۔"

"کوئی وڈیرے کی طاقت سے نہیں لڑ سکتا۔" رمیش کے لہجے میں خوف آ گیا تھا۔

"یہاں کوئی ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اگر تم لوگ ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی سکت نہیں رکھتے تب تمہیں ان کے ظلم برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔" نازلی نے ایک آفاقی حقیقت بیان کی۔

☆ ☆ ☆

"ارے گوراخان!"

محبوب شاہ نے اپنے روسیاہ مینیجر سے کہا۔

"یہ لوگ ہمارے منہ نہیں آنے لگے ہیں۔"

"شاہ سائیں۔۔۔ یہ باہر کا لوگ ہے۔" گوراخان نے ہاتھ جوڑ کر خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"وہ شاہ سائیں کے مرجے کو کیا جانیں۔"

"کیوں نہیں جانتے؟" محبوب شاہ نے غصے سے شراب کا گلاس میز پر پٹخ دیا اور شیشے کی میز پر مکڑی کا جالا سا بن گیا۔

"یہ ہماری زمین ہے۔"

"ٹھیک فرمایا شاہ سائیں۔۔۔! پر یہ غیر ملکی ہیں۔ ادھر کے ہوتے تو بھلا ایسی جرات کرتے۔"

"غیر ملکی ہیں۔۔۔ وہ بڈھا تو بالکل ادھر کے لوگوں کی طرح اردو بول رہا تھا۔"

"شاہ سائیں! وہ ادھر کا تھا پر اب ہانگ کانگ کا شہری ہے۔ اس کی بیوی ادھر کی تھی۔" اچھا محبوب شاہ نے غور کیا۔

"تبھی اس کی لڑکی اتنی خوبصورت ہے۔ سنا ہے دو نسلوں سے پیدا ہونے والی لڑکیاں زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"جی شاہ سائیں! میں نے بھی سنا ہے۔"

"تب اس لڑکی کے قریب سے دیکھنا چاہیے۔ کیا خیال ہے تیرا گوراخان؟"

"جی شاہ سائیں۔" اس بار گوراخان ہچکچایا۔

محبوب شاہ نے قہقہہ لگایا تھا۔

''ڈرتا کیوں ہے۔۔۔۔تیرا شاہ سائیں بہت طاقتور ہے۔جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اسے کسی کا ڈر نہیں ہے۔''

''ایسا کر عزیز چاچڑ کو حکم بھیج۔۔۔۔آ کر مجھ سے آج رات ملے۔''

''میں ابھی جاتا ہوں شاہ سائیں۔۔۔؟'' گورا خان نے مستعدی سے کہا۔

گورا خان کے جانے کے بعد اس نے تالی بجائی ایک نوجوان خادمہ اندر سے آئی

''جی شاہ سائیں!''

''جا کر میرا کالا کیس لے کر آ۔''

''جی شاہ سائیں۔۔۔۔ابھی لائی۔''

خادمہ چلی گئی کچھ دیر بعد اس نے محبوب شاہ کے سامنے ایک قیمتی سیاہ رنگ کا بریف کیس لا کر رکھ دیا۔خادمہ کے جانے کے بعد محبوب شاہ نے خود اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا بریف کیس سے ایک سیٹلائٹ فون نکال کر اسے پلگ کیا۔اس کی سرخ روشنی جھپکنے لگی تھی محبوب شاہ نے اپنے لیے ایک اور پیگ بنایا اور انتظار کرنے کے انداز میں وقت گزارنے لگا۔تقریباً دس منٹ بعد فون سے ہلکی سی بزرگی آواز آئی۔محبوب شاہ نے فون اٹھایا۔

''محبوب شاہ!'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''مال آج رات مل جائے گا۔اسے کل صبح سے پہلے مندر پہنچانا ہے۔''

''کام ہو جائے گا۔''

محبوب شاہ نے جواب دیا اور فون بند کر دیا اور فون نکال کر واپس بریف کیس میں رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول کر تالی بجائی۔نوجوان خادمہ شاید کمرے کے آس پاس رہتی تھی فوراً اندر آ گئی۔

''جی شاہ سائیں!''

''یہ لے جا اور کھانے کے لیے کچھ لا۔''

محبوب شاہ نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

کھانے اور پینے کے شغل میں مزید دو گھنٹے گزر گئے۔نصف رات کے قریب گورا خان اجازت لے کر اندر آیا۔

''سائیں عزیز چاچڑ حاضر ہے۔''

''بلاؤ اسے۔'' محبوب شاہ نے نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔لیکن عزیز چاچڑ کے اندر آنے تک وہ سنبھل گیا تھا۔

''حکم شاہ سائیں!'' عزیز چاچڑ نے اندر آنے کے بعد اس کے پاؤں چھونے کے بعد کہا۔

''پہلے تو یہ بتا جو کام تیرے سپرد کیا تھا اس کا کیا بنا؟''

''سائیں حکم دیوے اور کام نہ ہو۔'' عزیز چاچڑ نے فخر سے کہا۔

''آج ہی میرے آدمی مطلوبہ بندے کو لے آئے ہیں۔''

''شاباش چاچڑ۔۔۔اب غور سن۔۔۔تیرے دو آدمی۔۔۔مٹھری تک جائیں گے۔مٹھری دیکھا ہے نا؟''

''سائیں! سارا علاقہ ہتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہوں۔''

''ادھر فیض جوکھیو کا گھر ہے اس سے ملنا اور جو دے وہ حفاظت سے لے آنا۔۔۔یہ کام دو گھنٹے میں کرنا ہے۔''

''تب میں خود جاتا ہوں سائیں۔۔۔اپر سامان کیا ہے؟''

''اس سے تجھے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔فوراً جا اور فوراً آ، میں انتظار کروں گا۔''

عزیز چاچڑ روانہ ہو گیا۔محبوب شاہ کا نشہ وقت گزرنے کے ساتھ گہرا ہو رہا تھا اس نے تالی بجائی تو نوجوان خادمہ اندر آ گئی۔محبوب شاہ کچھ دیر تک اسے یوں دیکھتا رہا جیسے کسائی بکرے کو دیکھتا ہے۔لیکن پھر اس نے اپنے پر جبر کر کے اسے جانے کا اشارہ کیا۔آج رات اس کا ہوش میں اور چاک و چوبند رہنا ضروری تھا۔خادمہ کے جانے کے بعد اس نے کمرے میں موجود الماری سے دوا نکال کر کھائی۔یہ نشے کا توڑ کرنے والی دوا تھی۔اس کو کھانے کے دس پندرہ منٹ بعد اس کی حالت سنبھلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔مگر اب وقت گزارنا مشکل تھا خدا خدا کر کے رات کے دو بجے اور اس کے چند منٹ بعد عزیز چاچڑ

آ گیا۔

''سائیں! سامان لے آیا ہوں۔'' اس نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''شاباش چاچڑ کدھر ہے؟'' محبوب شاہ نے خوش ہو کر کہا۔

''باہر گاڑی میں رکھا ہے شاہ سائیں!'' عزیز چاچڑ نے بتایا۔

''اڑے اس کو باہر کیوں رکھا ہے اسے اندر لا۔''

''ابھی لایا سائیں!''

چاچڑ باہر کی طرف لپکا۔ کچھ دیر میں وہ ایک لکڑی کا باکس اندر لے آیا۔

''سائیں فیض نے یہ دیا ہے۔'' محبوب شاہ نے باکس کا معائنہ کیا اور گورا خان سے کہا۔

''اسے کھول۔''

گورا خان نے چاقو سے پتریاں کاٹ کر اور کیلیں نکال کر باکس کھول دیا تھا۔ اس کے اندر سے ایک مجسمہ نکلا تھا۔ سیاہ فام برہنہ عورت کا جو ایک پلیٹ پر نصب تھا محبوب شاہ نے اس کا جائزہ لیا۔ عزیز بھی اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔

''سائیں! یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تیرے کو نظر نہیں آتا۔'' گورا خان نے اسے جھڑکا۔

''مجسمہ ہے۔''

''عزیز! اب تو جا اور کل رات کے لیے تیار رہنا۔'' محبوب شاہ نے اسے حکم دیا۔

''جی شاہ سائیں!''

عزیز بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہوا۔ اس کی بے عزتی پر گورا خان بے حد خوش تھا۔

''گورا خان تو بھی جا۔'' اچانک محبوب شاہ نے کہا تو گورا خان حیران ہوا تھا۔

''میں شاہ سائیں۔۔۔۔؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں۔۔۔۔ تیرے باپ کو کہہ رہا ہوں۔''

محبوب شاہ نے چڑ کر کہا تو گورا خان بدحواسی میں وہاں سے فرار ہوا تھا اس کے

جانے کے بعد محبوب شاہ نے نوجوان خادمہ سے ایک بار پھر بریف کیس طلب کیا۔ اس نے سیٹلائٹ فون نکال کر اس پر کسی سے رابطہ کیا۔

''مال مل گیا ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ بتاؤ۔''

دوسری طرف سے جو کہا جانے لگا محبوب شاہ اسے غور سے سن رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح سویرے منہ اندھیرے شدت کی سردی میں جب گرم بستر سے نکلنے کے لیے دل پر جبر کرنا پڑتا تھا لکشمن مندر کے عقبی حصے میں کھلے صحن میں اپنی دھوتی اور شانے پر پڑی شال میں موجود تھا۔ اس کے سامنے گرم کوٹ اور چادر میں چھپا گورا خان تھا۔ اس نے ایک لفافہ لکشمن کے حوالے کیا۔

''اس سال سائیں نے دگنی رقم بھیجی ہے۔ مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے۔''

لکشمن نے دانت نکالے اور لفافہ لے لیا۔

''سائیں! نے ایک تحفہ اور بھیجا ہے۔'' گورا خان بولا۔

''میرے ساتھ آؤ۔''

گورا خان اسے مندر سے ذرا فاصلے پر کھڑی جیپ تک لایا جس کے عقبی کھلے حصے میں کوئی چیز کپڑے تلے چھپی تھی۔

''گورا خان نے چادر اتاری تو لکشمن کے چہرے پر عقیدت کے تاثرات آ گئے اسنے ہاتھ جوڑ کر ماتھے کو لگائے۔

''درگاہ دیوی۔۔۔''

''سائیں نے مندر کے لیے تحفہ دیا ہے۔''

''سائیں کی خواہش ہے اسے سالانہ جشن میں رکھا جائے۔'' گورا خان بولا۔

''آؤ میں اسے اندر پہنچا دوں۔''

لکشمن یوں گورا خان کے ساتھ اندر گیا جیسے اس کے لئے کوئی نئی بات نہ ہو۔ ایک عقبی راستے سے وہ براہ راست مندر کے مرکزی ہال تک پہنچے۔ گورا خان نے ہال کا جائزہ لیا اور مرکز میں رکھی درگاہ دیوی کی مورتی کے برابر میں مجسمہ رکھ دیا۔

"اس جگہ ٹھیک رہے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" لکشمن نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ بھاری بھرکم لفافے نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ ایسے تو اسے ہر سال جشن سے پہلے محبوب شاہ کی جانب سے رقم ملا کرتی تھی۔ تاکہ وہ اپنے لوگوں کو قابو میں رکھے اور ان کے دلوں پر شاہ سائیں کی عظمت کا سکہ جمائے رکھے تاکہ وہ بے چون چرا اپنی جان و مال اور آبرو پر محبوب شاہ کا حق مسلم سمجھتے رہیں اور اس کے خلاف دم مارنے کا بھی نہ سوچیں۔ اپنا کام کرنے کے بعد گوراخان نے لکشمن سے کہا۔

"تیری بستی میں وہ سندر سی ناری۔۔۔ کیا نام ہے سنیتا۔۔۔" لکشمن عیاری سے مسکرایا۔

"سائیں وہ تو اترن ہے۔"

گوراخان رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔

"بعض کپڑے ایسے ہوتے ہیں کہ بار بار پہننے کو جی چاہتا ہے۔"

"سائیں! مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔۔۔ مالک بھلا اپنی چیزوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔" لکشمن بے غیرتی سے ہنسا۔

"بس تو کل شام اسے کسی بہانے مندر بلوالو۔۔۔ میرے آدمی اسے لے جائیں گے۔"

"کل وہ آئے گی۔ مندر کی صفائی کرنے۔۔۔ واپسی میں لے جانا۔"

"اور اس کے ماں باپ کو ٹھنڈا رکھنا۔۔۔ سائیں تک نہ جائیں۔۔۔ چھوکری پرسوں صبح سے پہلے گھر آجائے گی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

"ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ اس کے لیے کون سی نئی بات ہے۔"

گوراخان جب جیپ میں بیٹھ کر رخصت ہوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے لکشمن اندر جانے لگا تھا کہ اچانک ہی رمیش سامنے آگیا۔ لکشمن اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

"رمیش! تو اتنی سویرے۔"

"پتاجی۔۔۔ ایہ شخص یہاں کیا کرنے آیا تھا۔" رمیش کے لہجے میں غصہ تھا۔

"شاہ سائیں! کی جانب سے سالانہ تیوہار کا نذرانہ دینے آیا تھا۔"

"پر یہ سنیتا کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟" رمیش نے شک سے پوچھا۔

"کچھ نہیں افسوس کر رہا تھا۔" لکشمن صفائی سے مکر گیا تھا۔

"پتاجی۔۔۔! اس بار سنیتا کے ساتھ اگر انیائے ہوا تو برادری کا کوئی بھی جوان چپ نہیں بیٹھے گا۔ سب کٹ مریں گے۔"

"رمیش! احمقانہ باتیں نہ کرو۔ تو نے میرے بعد اس مندر کا مہا پجاری بننا ہے یہ مسلمان کا دیس ہے۔ ہر قدم پھونک پھونک کر اور ان کی مرضی کے مطابق رکھنا ہوگا۔"

"پر اپنی آبرو بیچنا تو بے حیائی ہوگی۔" رمیش نے کہا۔ تو لکشمن نے بے ساختہ اسے تھپڑ مارا۔

"بہت چل رہی ہے تیزی زبان۔۔۔" لکشمن گرجا اور سنتا تا ہوا اندر چلا گیا۔

رمیش منہ پر ہاتھ رکھے باپ کو جاتے دیکھتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سنیتا کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ عام سی شکل و صورت کی وہ کم عمری میں بیاہ کر چلی گئی تھیں مگر سنیتا کا رشتہ بچپن میں اس کے تایا نے مانگ لیا تھا۔ رمیش پڑھا لکھا تھا اور میرپور خاص میں سرکاری ملازم تھا اور صورت شکل کا بھی خاص نہیں تھا۔ مگر سنیتا اسے پھر بھی پسند کرتی تھی۔ بچپن سے جو اس کا نام اس کے کانوں میں پڑتا رہا تھا تو سولہویں برس میں لگی سنیتا کے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں تھی۔ اگرچہ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس بستی میں ہر خوبصورت لڑکی کو اس مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ درندوں کا علاقہ تھا اور وہ جسے چاہتے شکار کرلیا کرتے تھے مگر ہر ماں باپ یہی سوچتے تھے کہ شاید ان کی لڑکی پر درندوں کی نظر نہ پڑے وہ خیر و عافیت سے اپنے گھر کی ہو جائے۔ لیکن ان کی باری بھی آجاتی تھی۔ ایسا ہی سنیتا کے ساتھ ہوا۔ وہ ماں کی بیماری کی وجہ سے خود پانی بھرنے گئی تھی اور واپسی پر اسے گوراخان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اٹھا کر لے گیا۔ پہلے اسے وڈیرہ محبوب شاہ کے سامنے پیش کیا اور پھر سب نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ تین دن بعد وہ لٹی پٹی آئی تو اس کے تایا کے گھر والے رشتہ توڑ کر جا چکے تھے۔

بستی کے نوجوان سنیتا کے ساتھ ہونے والے ظلم پر مشتعل تھے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس وجہ سے بھی سب کو اس سے ہمدردی تھی لیکن کمشن اور بستی کے بڑے بوڑھوں نے نوجوانوں کو ٹھنڈا کیا کہ آبرو تو جا چکی تھی جان بھی جاتی اور کئی افراد غائب ہو کر وڈیرے کی جیل میں پہنچ جاتے۔ سنیتا اس واقعے کے بعد چلتی پھرتی لاش بن گئی تھی۔ کتنے دن پاگل سی رہی لیکن رفتہ رفتہ اسے صبر آ گیا یوں وہ دوبارہ کبھی نارمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس روز بستی میں سب خوش تھے۔ رات کو تہوار تھا۔ سب تیاریاں کر رہے تھے۔ سنیتا اور لڑکیوں کے ایک گروہ کو دن میں جا کر مندر کی صفائی اور دھلائی کرنا تھی۔ سنیتا کو حیرت تھی اس کام کے لیے اسے کیوں منتخب کیا گیا تھا۔ وہ بے آبرو لڑکی تھی جسے کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔ سوائے اس کے ماں باپ کے کوئی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت لڑکیوں کے ساتھ مندر کی طرف جا رہی تھی کہ جھیل کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے رمیش نظر آیا۔ رمیش اس بستی کا واحد مرد تھا جو اس سے ہمدردی سے پیش آتا تھا اور اس کی ہمدردی خالص ہمدردی ہوتی تھی اس کی آڑ میں کوئی جذبہ نہیں تھا جیسا کے بستی کے کئی نوجوانوں کے انداز میں موجود ہوتا تھا۔ رمیش نے اسے اشارہ کیا۔

سنیتا لڑکیوں کے پیچھے تھی اور کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر رمیش کی طرف آئی۔

"کیا بات ہے۔"

"سنیتا! ابھی تم واپس گھر جاؤ۔" رمیش نے اس سے کہا۔

"پر کیوں؟"

"سوال مت کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" رمیش بولا۔

"تمہیں خطرہ ہے۔ گورا خان تمہیں پھر لیجانے کی کوشش کرے گا۔"

"تو لے جانے دے اور کیا بگاڑ لے گا میرا۔" سنیتا نے تلخی سے کہا تھا۔

"تو میری بات نہیں مانے گی۔"

"چھوڑ چھوٹے پنڈت میرے لیے فکر نہ کر۔" سنیتا بولی۔

"بھگوان کے لیے سنیتا۔" رمیش نے اس سے التجا کی۔

مگر سنیتا پلٹ کر مندر کی طرف جانے لگی۔ رمیش نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا لیکن پھر رک گیا۔ وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا پھر پلٹ کر کیمپ کی طرف چلا گیا۔

مگر نازلی بھی فارغ نہ تھی۔ وہ کام کر رہی تھی۔ مایوسی کے عالم میں رمیش بستی کی طرف چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

نازلی رمیش کا انتظار کر رہی تھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ رمیش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کے بجائے وہاں حماد آ گیا۔

"مس نازلی! آپ یہاں۔۔۔ اس وقت اور اکیلی؟"

"ہاں تو کیا ہوا مسٹر حماد۔۔۔! میں روز اکیلی جھیل کے کنارے آتی ہوں۔"

نازلی کو اسے دیکھ کر کوفت ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ حماد کو پسند کرتی تھی۔ یہ سنجیدہ کام سے تخلص شخص اس سے یوں پیش آتا تھا جیسے کوئی عورت نہیں محض ان کی ساتھی ہو۔ وہ اس وجہ سے اچھا لگا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کبھی نازلی کو اپنے لیے میل نظر نہیں آیا تھا۔

"مس نازلی۔۔۔! یہ علاقہ ویران ہے اور یہاں ڈاکو دندناتے پھرتے ہیں۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔" نازلی نے بور ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"اور پلیز اس وقت میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

"جیسی آپ کی مرضی مس نازلی! میں نے خبردار کر دیا ہے۔" حماد نے شانے اچکائے اور وہاں سے چلا گیا۔

حماد کے جاتے ہی رمیش جھاڑیوں سے نکل کر آ گیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا شاپنگ بیگ اٹھا رکھا تھا۔

"شکر نا بی بی۔۔۔ میں آ گیا تھا پر اس کی وجہ سے رک گیا تھا۔" رمیش نے دور جاتے حماد کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا کیا تم نے۔۔۔ کپڑے لائے؟"

"جی بی بی۔۔۔ یہ رہے۔" اس نے شاپنگ بیگ نازلی کو تھما دیا۔

"پر بی بی ایک بات کہوں۔۔۔ یہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ علاقہ ٹھیک نہیں ہے ڈاکو ادھر

گھومتے رہتے ہیں۔"

"آج تو سب مجھے لیکچر دے رہے ہیں آئندہ احتیاط کروں گی۔ یہ بتادو کہ مجھے لینے کب آؤ گے۔"

"ٹھیک بارہ بجے۔ میں اسی جگہ انتظار کروں گا۔ آپ خاموشی سے آیئے گا۔ میں آپ کو مندر کے خفیہ راستے سے اندر لے جاؤں گا۔"

"میں ٹھیک بارہ بجے آجاؤں گی۔" نازلی نے کہا اور شاپنگ بیگ لے کر خیمے کی طرف چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

گوراخان بہت خوش تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہ بات محبوب شاہ نے بھی محسوس کرلی تھی۔

"اڑے۔۔۔ گوراخان! کیا بات ہے۔۔۔۔ تیری کوئی لاٹری نکل آئی ہے؟"

"سائیں۔۔۔! لاٹری کیا۔ میرا سب کچھ آپ ہو۔" گوراخان نے ہاتھ جوڑے

"جب تک آپ کے سائے میں ہوں موج ہی موج ہے۔ میں تو اس لیے خوش ہوں کہ آج رات سائیں کے نافرمانوں پر بھاری پڑنے والی ہے۔"

"گوراخان۔۔۔۔" محبوب شاہ دہاڑا تھا۔

"تیری جرات کیسے ہوئی اس بارے میں بات کرنے کی۔"

"شاہ سائیں! معاف کردو۔۔۔ بھول ہوگئی۔" گوراخان لرز کر اس کے قدموں میں گر گیا۔

"اسے معمولی مت سمجھو۔۔۔ ابھی کل ادھر نہ جانے کتنا ایجنسی کا بندہ ہوگا۔ بابا ادھر دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

محبوب شاہ نے اس بار ذرا نرم لہجے میں کہا۔ گوراخان ہاتھ جوڑے جوڑے اٹھ گیا۔

"سائیں! ایک بار پھر معافی۔"

گوراخان یہ بتادو۔۔۔ چھوکری کیسی ہے۔۔۔۔ وہی پروفیسر کی لڑکی؟"

"سائیں! وہ تو ہیرا ہے۔"

"تو بابا! اس ہیرے کو تیرے سائیں کی حویلی میں ہونا چاہیے نا؟" گوراخان پریشان نظر آنے لگا۔

"سائیں! اس کے باپ کی آسلام آباد تک رسائی ہے وہ آپ کے لیے پریشانی کھڑی کرسکتا ہے۔"

"ہمارے لیے کیوں؟" محبوب شاہ نے مکاری سے کہا۔

"اس کی لڑکی کو ڈاکو لے جائیں گے۔"

"سائیں! یہ کام آسان نہیں ہے۔ کیمپ پر رینجرز والے ہیں ان سے لڑائی ہوئی تو ہم پھنس جائیں گے۔"

"بابا! کیسے پھنسے گا۔ لڑکی کو خاموشی سے اٹھالو کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ گوراخان میں نے تم لوگوں کو کس لیے پالا ہے جا کر اپنے آدمیوں کو تیار کر۔ مندر میں دھماکہ ہوگا۔ اس کے بعد ہونے والے ہنگامے میں لڑکی کو اٹھالانا۔ وہ رات ہر صورت اوطاق میں چاہیے۔"

محبوب شاہ کی فرمائش نے گوراخان کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ گوراخان اپنے لیے سنیتا کو لانے کی فکر میں تھا۔ اس بار اس نے خود جانے کے بجائے اپنے آدمیوں کو بھیجا تھا اسے معلوم تھا کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اس کے آدمی مندر سے نکلنے کے بعد سنیتا کا پیچھا کریں گے اور اسے موقع پاکر اغوا کرلائیں گے۔ مگر پروفیسر کی بیٹی عام لڑکی نہیں تھی۔ اسے سخت پہرے سے نکال لانا بچوں کا کھیل نہیں تھا مگر ساتھ ہی اسے معلوم تھا محبوب شاہ انکار نہیں سنے گا۔ اگر اسے اپنی کھال بچانا تھی تو لڑکی کو لانا ہی لانا تھا وہ ڈیرے کی حویلی سے نکلا تو سورج غروب ہوچکا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل پر اوطاق کا رخ کیا جو باغوں کے درمیان تھی۔ حویلی سے کوئی تین چار میل کا فاصلہ بنتا تھا۔ وہ اوطاق پہنچا تو خاص قسم کے کاموں کے لیے استعمال ہونے والی جیپ وہاں موجود تھی۔

سرنگی گوراخان کا دست راست تھا جیسے گوراخان محبوب شاہ کا دست راست تھا اس نے سرنگی کو سنیتا کے اغوا کا کام سونپا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اسے لے آیا ہوگا۔ سرنگی اسے احاطے میں مل گیا۔

''کام ہو گیا کیا؟''

''کمدار سائیں۔۔۔! سرنگی جائے اور کام نہ ہو۔''

''چھوکری تو خود آرام سے آ گئی۔ بازو بھی نہیں پکڑانے دیا۔''

''اچھا۔۔۔'' گوراخان کو حیرت ہوئی تھی۔

''پچھلی بار زبردستی لانا پڑا تھا۔ اسے کہاں رکھا ہے۔''

''پچھلے کمرے میں۔'' سرنگی خباثت سے بولا۔

''میں تیرا انتظار کر رہا تھا۔ کمدار سائیں پہلے تو ہو آ۔''

''سرنگی ابھی اسے بھول جا۔ ابھی سائیں نے ایک مشکل کام سونپا ہے تو نے وہ کیمپ والی لڑکی دیکھی ہے؟''

''وہ شہری چھوکری۔''

''شہری نہیں۔۔۔ وہ دوسرے ملک سے آئی ہے۔'' گوراخان نے تصحیح کی۔

''سائیں نے اسے آج رات اوطاق میں لانے کا حکم دیا ہے۔''

''سائیں۔۔۔! یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ ادھر تو چھ سرکاری بندے ہیں۔''

''پھر بھی لانا ہے تو جانتا ہے سائیں صرف حکم دینا جانتا ہے کام کیسے ہوا ہے اس سے غرض نہیں ہے۔''

اس حکم نے سرنگی کو فکر مند کر دیا تھا۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

جیسے جیسے رات بھیگ رہی تھی بستی کے لوگ مندر کا رخ کر رہے تھے۔ سب نے نئے یا حسب توفیق برق لباس پہن رکھے تھے۔ خاص طور سے نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بجی سنوری تھیں۔ مرد، عورتیں اور بچے بوڑھے سب خوشی سے جگمگاتے چہروں کے ساتھ مندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سنیتا کے ماں باپ بھی تھے مگر وہ فریاد کرنے جا رہے تھے مندر کے دروازے پر ان کو رمیش مل گیا۔ وہ ان کے ساتھ سنیتا کو نہ دیکھ کر چونکا۔

''سنیتا کہاں ہے موسی؟''

''ہم پھر برباد ہو گئے۔'' سنیتا کے باپ نے لرزتی آواز میں کہا۔

''سنیتا مندر سے واپس نہیں آئی۔ دوسری لڑکیاں آ گئیں پر سنیتا۔۔۔'' اس کی آواز اسکے حلق میں پھنس گئی تھی۔

رمیش کا دل ایک لمحے کو رک گیا تھا۔ اسے معلوم تھا درندے ایک بار پھر سنیتا کو لے گئے تھے۔ اور وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا اس نے ان دونوں کو تسلی دی تھی۔

''آپ اندر جاؤ میں سنیتا کو تلاش کرتا ہوں۔''

اگلے ایک گھنٹے تک مندر اور آس پاس کا سارا علاقہ چھاننے کے بعد بھی اسے سنیتا نہیں ملی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ کہاں ہو گی۔ لیکن وہ اس طرف نہیں جا سکتا تھا۔ یہ سودا اس کے باپ نے کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے کیسے نظریں ملا سکتا تھا۔ جن کا اس کا باپ نمک خوار تھا اور شاید وہ بھی۔۔۔۔ کیونکہ وہ بھی اس کا کھاتا پیتا تھا وہ تھکے ہوئے قدموں سے مندر لوٹ آیا۔ جہاں دیوی اور شعلوں کی روشنی میں جشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ موسیقی کی لہروں کے ساتھ نوجوان لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

عزیز چاچڑ اپنے دو درجن ساتھیوں کے ساتھ بالکل تیار تھا۔ ان کے پاس آٹھ عدد جدید ترین ماڈلز کی ایسی گاڑیاں تھیں جو ہر قسم کے راستوں پر آسانی سے دوڑ سکتی تھیں ان سب کی نمبر پلیٹیں جعلی تھیں بلکہ سرے سے رجسٹریشن نمبر ہی نہیں تھا کیونکہ افغانستان اور دبئی سے اسمگل کر کے لائی گئی گاڑیاں تھیں۔ جن کو شاہراہوں سے ہٹ کر پورے ملک میں جرائم پیشہ افراد کو فراہم کیا جاتا تھا۔ عزیز کے پاس ایسی درجنوں گاڑیاں تھیں اور اس کے آدمی دھڑلے سے ان کو شاہراہوں پر بھی چلاتے تھے۔ اس کے تمام ساتھی پوری طرح مسلح تھے ان کے پاس دستی بم اور راکٹ لانچر تک موجود تھے۔

''خمیسو۔۔۔ چھورا کدھر ہے؟'' عزیز نے اپنے نائب سے پوچھا۔

''ادھر ہے سائیں! اسے دانہ پانی ڈال دیا ہے۔''

''اسے بھی تیار کر۔۔۔ اسے لے کر چلنا ہے۔''

''آج رات؟'' خمیسو نے حیرت سے کہا تھا۔

''سائیں اس کا کیا کام ہے؟''

''اسی کا تو کام ہے۔'' عزیز چاچا نے اپنی رائفل کو سہلایا۔

''آج ادھر سے بہت شکار ملے گا۔ پر بالکل تازہ اور جوان شکار لانا ہے۔ کوئی خراب مال نہیں چلے گا۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھا دینا۔''

''خیال رہے ادھر ایک کیمپ لگا ہے۔۔۔۔۔ کوئی بڈھا ہے وہ موہنجوڈرو تلاش کر رہا ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے رینجر والے لگے ہیں۔ اس طرف نہیں جانا ہوگا۔''

''جائیں گے نہیں ہمیں رک کر انتظار کرنا ہوگا۔ جیسے ہی اشارہ ملے سب نے مندر کو گھیر لینا ہے۔ فکر مت کرو کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔ جو بھی باہر نکلے اسے دیکھ کر گاڑی میں ڈال لینا۔''

''سمجھ گیا سائیں! اور کوئی مزاحمت کرے؟''

''لڑکیاں تو مزاحمت کرتی ہیں پر ان کو پیار سے سمجھانا۔۔۔۔ باقی جو بھی ہو اسے اڑا دینا۔ اب جا کر یہ سب دوسروں کو سمجھا دے۔''

☆ ☆ ☆

وہ رات کو نو بجے تک کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ اس رات بھی جلدی سو گئے حالانکہ مندر کی طرف سے ہوا کے دوش پر موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ مندر اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ رات دس بجے صرف دو محافظ پہرہ دے رہے تھے باقی چار سونے کے لیے چلے گئے تھے مگر دھند اور کہر کے باعث ان کی روشنی ہلکی لگ رہی تھی اور دس بارہ گز کے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال ایک ہفتے سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس لیے محافظوں سمیت سب ہی مطمئن تھے۔

گیارہ بجے نازلی نے لیمپ کی بے حد ہلکی سی روشنی میں لباس تبدیل کرنا شروع کیا۔ یہ کرتی اور لہنگا تھا اوپر بڑا سا دوپٹا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے جرسی اور لیکن پہن لیا تھا۔ اگرچہ شدت کی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ناکافی تھے لیکن کچھ نہ کچھ بچاؤ تو ہو جاتا۔ اسے اس لباس کا پتا نہیں تھا۔ پھر اس نے جیسے تیسے پہن لیا۔ اس مہم جوئی سے اس نے اپنے باپ کو بھی لاعلم رکھا تھا کیونکہ وہ اسے کبھی اجازت نہ دیتا۔ اسے رمیش پر اعتماد تھا اور اس سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ یہاں آنے کے بعد پروفیسر نے اس کے

اور اپنے لیے اسلحے کا پرمٹ حاصل کیا تھا۔ نازلی کے لیے انہوں نے ایک چھوٹا اعشاریہ 22 کا پستول لیا تھا۔ نزدیک سے یہ اتنا ہی مہلک ہوتا تھا جتنا کسی بڑے بور کا پستول۔ نازلی نے شوٹنگ کی تربیت لے رکھی تھی اور اسے پستول چلانا آتا تھا اس نے پستول لہنگے کے نیچے ران پر اس کے مخصوص ہولسٹر کی مدد سے باندھ لیا تھا۔ اس کے خیمے کے عقبی حصے میں زپ سے کھلنے والی چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ وہ اس کی مدد سے بہ آسانی کسی کی نظروں میں آئے بغیر کیمپ سے باہر جا سکتی تھی۔ رمیش نے نصف شب کو آنے کا کہا تھا۔

نازلی ٹھیک پونے بارہ بجے خیمے کے عقبی حصے سے نکلی تھی۔ دھند اور کہر کی وجہ سے حد نگاہ بالکل ہی محدود ہو گئی تھی اور کیمپ سے ذرا دور آ کر اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نازلی اپنے ساتھ ایک مختصر لیکن طاقتور ٹارچ لائٹ لائی تھی۔ جو بیک وقت فلیش لائٹ بھی تھی اور سرچ لائٹ بھی۔ اس نے اسے روشن کر لیا۔ اسے جھیل تک پہنچنے میں پانچ منٹ لگے تھے۔ اس نے وہاں جاتے ہی آہستہ سے رمیش کو آواز دی۔

''رمیش۔ کہاں ہو تم؟''

مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا رمیش ابھی تک نہیں آیا تھا وہ انتظار کرنے لگی۔ اس نے ٹارچ روشن رکھی تھی تاکہ رمیش دیکھے تو سیدھا اس طرف آئے۔ ٹارچ اور پستول کے علاوہ اس کے پاس تیسری شے اپنا چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرہ تھا۔ اس کا ارادہ مندر میں ہونے والی تقریب کی تصاویر لینے کا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اس کا اندازہ تھا کہ بارہ بج چکے ہیں اس نے ایک بار پھر بے چین ہو کر رمیش کو آواز دی۔ اسی لمحے اسے عقب میں آہٹ سی سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن ایک مضبوط ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ ہاتھ خالی نہیں تھا بلکہ اس میں کوئی کپڑا تھا جس سے حواس پر طاری ہوتی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ نازلی نے تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا لیکن اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ چند سیکنڈ کے اندر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ زمین پر گر چکی تھی۔ اسکے آس پاس تین سائے نظر آ رہے تھے۔ ایک نے اس کا منہ دبا رکھا تھا جب اسے یقین ہو گیا کہ نازلی بے ہوش ہو گئی ہے تو اس نے کپڑا اس کے منہ سے ہٹا لیا۔

''لے چلو۔۔۔ بے ہوش ہے۔''

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور انہوں نے اسے شانے پر لاد لیا۔

☆ ☆ ☆

حماد کا پیٹ ذرا گڑبڑ تھا۔ اس نے رات کو کھانے میں سارڈین مچھلی کا ایک ٹن کھولا تھا اور شاید اسی نے اس کے پیٹ کو گڑبڑ کر دیا تھا۔ رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو اسے حاجت محسوس ہوئی وہ لوٹا لے کر جھیل سے ذرا فاصلے تک گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں حماد نے پانی لیا اور گڑھے کے طرف چلا گیا۔ وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ اس نے نازلی کے خیمے کے عقبی حصے میں کسی کو دیکھا۔ ہلکی سی روشنی میں وہ کوئی عورت لگ رہی تھی اس نے مقامی عورتوں جیسا لباس پہن رکھا تھا حماد نے اسے للکارنے کا سوچا مگر پھر اس کے اندر تجسس جاگ اٹھا۔ وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ یہ عورت یہاں کیا کر رہی ہے۔ ممکن ہے وہ اسے للکارتا تو وہ فرار ہو جاتی۔

عورت دبے قدموں کیمپ سے نکلی اور جھیل کی طرف جانے لگی۔ حماد بھی خاموشی سے اس کے تعاقب میں چل پڑا ابھی وہ ٹارچ روشن کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ عورت نے روشن کر لی۔ وہ حماد کو واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس لیے اس نے روشنی کا ارادہ ترک کر دیا۔ ممکن ہے وہ عورت چونک جاتی اور فرار ہو جاتی۔ حماد پیٹ کی تکلیف کے ساتھ اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ جھیل کے پاس وہ عورت پہنچ کر رک گئی اور حماد نے اس کی ہلکی سی آواز سنی۔ وہ کسی رمیش کو پکار رہی تھی۔ حماد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو نازلی کی آواز لگ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ رمیش مندر کے مہا پجاری کے لڑکے کا نام تھا۔ کیا نازلی اس سے ملنے آئی تھی مگر کیوں؟ حماد نے نازلی کو کبھی خراب کردار کی لڑکی نہیں سمجھا تھا۔ بلکہ اسے اس کے کردار میں ایک ایسی پختگی نظر آئی تھی جو عام طور سے آزاد معاشروں میں پرورش پانے والی لڑکیوں میں نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے بارے میں حماد کے ذہن میں کوئی غلط بات نہیں آ رہی تھی۔ البتہ تجسس تھا کہ وہ اتنی رات گئے اس جگہ رمیش سے ملنے کیوں آئی تھی۔ خاصی دیر بعد نازلی نے پھر رمیش کو پکارا عین اسی لمحے حماد نے اس کے عقب میں تین سائے دیکھے اور ایک نے اچانک نازلی کا منہ دبا لیا۔ اس نے ایک دو بار ناک کے بل آواز نکالی اور پھر ساکت ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر گر گئی تھی۔ حماد

نے کسی کو کہتے سنا۔

"لے چلو۔۔۔ بے ہوش ہے۔"

حماد کے ذہن میں پہلا خیال ڈاکوؤں کا آیا تھا اور یہ خیال آتے ہی وہ اپنی جگہ دبک گیا۔ ڈاکوؤں نے اسے دیکھ لیا تو اسے گولی بھی مار سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے پاس اسلحہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے نازلی کو اپنے شانے پر لاد لیا۔ انہوں نے ٹارچ بھی اٹھا لی اور ایک طرف بڑھ گئے حماد بھی ان کے پیچھے جانے لگا حالانکہ اسے چاہیے تھا کہ وہ کیمپ کی طرف جاتا اور گارڈ کو لاتا مگر اس صورت حال نے اس کی عقل خبط کر دی تھی۔ وہ خود ان کے پیچھے جانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کا منہ مندر کی طرف تھا۔ حماد کو تعجب ہوا۔ ڈاکوؤں کا مندر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

وہ تینوں نازلی کو شانے پر اٹھائے مندر کے عقبی حصے تک پہنچے اور وہ اچانک غائب ہو گئے۔ حماد بوکھلا گیا تھا۔ جس جگہ چند لمحے پہلے روشنی تھی وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حماد نے جلدی سے اپنی ٹارچ روشن کر لی۔ مندر کے اس حصے میں سوائے ایک دیوار کے کچھ نہیں تھا۔ حماد نے دیوار پر ہاتھ پھیرا اس کا خیال تھا اس دیوار میں کوئی خفیہ راستہ تھا۔ جس سے وہ لوگ نازلی کو لے کر اندر چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

عزیز چاچڑ اپنے دو درجن مسلح ساتھیوں کے ہمراہ گاڑیوں میں مندر کی طرف چل پڑا تھا۔ غلام فرید اسکی جیپ میں عقبی حصے میں ذرا سہما بیٹھا تھا۔ وہ جب سے ان کی قید میں آیا تھا انہوں نے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود غلام فرید کو احساس تھا کہ اس کے ساتھ کوئی برا ہونے والا ہے اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ڈاکو بہت سفاک تھے اور اسے کسی کار خیر کے لیے اٹھا کر نہیں لائے تھے اور ابھی وہ اسے کہیں لے جا رہے تھے۔ اسے لگا جیسے اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ ان لوگوں کی بعض باتوں سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اسکا دل اندر سے رکا جا رہا تھا۔

"غلام فرید! اگر جان پیاری ہے تو ان کے چنگل سے نکل کر بھاگ جا۔"

وہ عقبی حصے میں اس طرح بیٹھا تھا کہ اس پانچ دروازوں والی جیپ کا عقبی دروازہ

اسکے پاس تھا لیکن اس کیساتھ ایک ڈاکو اور بیٹھا تھا اور وہ اسے فرار کی اجازت کیوں دیتا غلام فرید کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے۔ اصل میں اس نے کبھی ان لوگوں کے سامنے مزاحمت نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ غلام فرید کے ہاتھ فرش پر رینگ رہے تھے۔ اس کی کوشش تھی کہ اس طرح حرکت کرے کہ اسکے ساتھ موجود ڈاکو کو اس پر شک نہ ہو۔

''چھورا تو خوش تو ہے نا؟'' اچانک عزیز چاچڑ نے پوچھا۔

غلام فرید بوکھلا گیا۔

''آج تجھے بہت بڑا اعزاز ملے گا۔'' عزیز چاچڑ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تیری آخرت تک سنور جائے گی۔''

''جی سائیں۔۔۔؟'' غلام فرید کو اس کے لہجے سے خطرے کا احساس ہوا تھا۔

اس کے ساتھ بیٹھا شخص ذرا عمر رسیدہ تھا۔ اگرچہ جسامت میں وہ نوجوان ڈاکوؤں سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ وہ بے حد چڑچڑا اور بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑنے والا شخص تھا۔ وہ بے زاری سے باہر دیکھ رہا تھا۔ گاڑیاں اس وقت آموں کے باغات کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ غلام فرید نے پہلو بدلا تو اس کا ساتھی غرایا۔

''کیا بات ہے! آرام سے بیٹھ۔''

جواب میں غلام فرید نے ہاتھ گھمایا اور پانا پوری طاقت سے اس کے سر پر مارا پگڑی کی وجہ سے وار کی آواز دب گئی تھی اور اس کی کراہ جیپ کے انجن کے شور میں کھو گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جھول گیا۔ غلام فرید نے آہستہ سے عقبی دروازہ کھولا اور چلتی جیپ سے کود گیا۔ جب تک عزیز صورت حال دیکھ کر سمجھ کر جیپ روکتا وہ اٹھ کر بھاگا تھا اور آموں کے باغات میں گھس گیا۔ اسے عقب سے فائر کی آواز آئی تھی۔ لیکن کوئی گولی اسے نہیں لگی۔ وہ جان توڑ کر درختوں کے درمیان میں بھاگنے لگا۔ اسے پتا تھا کہ وہ دوبارہ ان ڈاکوؤں کے ہاتھ آ گیا تو شاید وہ اسے گولی ہی مار دیں۔

عقب سے۔

''بھاگو۔۔۔ پکڑو۔۔۔ گولی مار۔۔۔۔''

کا شور سنائی دے رہا تھا۔ آموں کے باغات میں گاڑی لے کر گھسنا ممکن نہیں تھا درخت اس طرح لگے تھے کہ ان کے درمیان سے گاڑیوں کا گزرنا محال تھا۔ غلام فرید کی ساری جان پیروں میں سمٹ آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر کوئی حادثہ پیش آتا تو وہ اسے نہیں پکڑ سکتے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اسے ذرا فاصلے پر روشنیاں نظر آئیں تھیں۔ یہ کوئی بڑی عمارت تھی۔ غلام فرید اس کی طرف بھاگا۔ ممکن ہے اسے یہاں پناہ مل جاتی اور وہ ڈاکوؤں سے بچ جاتا۔ عمارت دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ شاید یہ باغات کے مالک کی بیٹھک تھی۔ وہ گھوم کر عمارت کے پچھلے حصے میں آیا کیونکہ سامنے والے حصے سے بھی شور سنائی دے رہا تھا شاید ڈاکو اس طرف بھی آ گئے تھے۔

غلام فرید نے ہراساں انداز میں چاروں طرف دیکھا پھر درخت کے ذریعے عمارت کے چھجے پر چڑھ گیا۔ یہ چھجا اصل چھت سے نیچے تھا۔ اور کھڑکیوں کے عین اوپر تھا جبکہ اس کے اوپر روشن دان تھے۔ روشندان خاصے بڑے تھے جیسا کہ دیہات میں رواج ہوتا ہے۔ اس نے ایک روشن دان سے اندر جھانکا۔ وہ اس جگہ بھی محفوظ نہیں تھا۔ ڈاکو اس طرف آ جاتے تو بآسانی اسے تلاش کر لیتے۔ تیسرے روشندان سے جھانکنے پر اسے کمرے کے اندر۔۔۔ پلنگ پر ایک لڑکی اس حال میں نظر آئی کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر اور پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ غلام فرید ابھی اندر جھانک رہا تھا کہ اسے اس طرف لوگوں کی آواز سنائی دی۔

''سائیں ادھر کدھر آئے گا۔۔۔ یہ محبوب شاہ کا اوطاق ہے۔''

''مجھے معلوم ہے پر اسے تو نہیں معلوم۔۔۔۔ ہو سکتا ہے ادھر آ کر چھپ گیا ہو۔''

عزیز چاچڑ کی آواز سنائی دی۔

غلام فرید کا جسم سن ہو گیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ عزیز چاچڑ کے جاننے والے کی عمارت میں آ گیا تھا۔ نارچیں لہرانے لگے تھیں۔ اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ غلام فرید نے پہلے پاؤں روشن دان سے اندر کیے اور پھر خود بھی اندر کود گیا۔ لڑکی اسے خوف سے دیکھ رہی تھی۔ غلام فرید نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔

''جن لوگوں نے تجھے قید کر رکھا ہے وہ میرے دشمن ہیں۔ مجھے تلاش کر رہے ہیں

بولنا مت۔۔۔۔ مجھے چھپالو۔"

آوازیں اب اوطاق کے اندر بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈاکو اس طرف ہی آرہے تھے۔ لڑکی نے اسے کہا

"پلنگ کے نیچے چلے جائیے۔ آواز مت نکالنا۔"

لڑکی مقامی بولی بول رہی تھی۔ لیکن غلام فرید نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔ وہ پھرتی سے پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ چاروں طرف چادر لٹکی ہوئی تھی اور جب تک کوئی اٹھا کر نہ دیکھتا اسے غلام فرید نظر نہ آتا۔ چند منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور غلام فرید نے خیسو کی آواز سنی

"یہ چھوری کون ہے؟"

"گورا سائیں لایا ہے۔ پہلے بھی آچکی ہے۔"

دروازہ بند ہوا اور وہ لوگ چلے گئے۔ غلام فرید چند منٹ کے انتظار کے بعد باہر نکل آیا تھا۔ لڑکی کی کرتی سامنے سے کسی دست درازہاتھوں کی وجہ سے پھٹ گئی تھی اور غلام فرید کو اس کی طرف دیکھتے شرم آرہی تھی۔ اس نے نظریں جھکاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے۔

تیرا نام کیا ہے؟"

"سنیتا۔" اس نے آزاد ہوتے ہی اپنا لباس درست کیا اور چنری تلاش کرنے لگی۔

"اور تیرا؟"

"غلام فرید۔۔۔۔ کراچی جارہا تھا کہ مجھے ڈاکو پکڑ لائے۔"

"کراچی تو بہت دور ہے۔"

"ہاں۔" غلام فرید نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خاصی دلکش لڑکی تھی۔ بالآخر اس کی چنری مل گئی۔ اس نے چنری کا سرا کھولا۔ اس میں ایک ننھی سی پلاسٹک کی پڑیا بندھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"زہر۔"

سنیتا نے اطمینان سے جواب دیا پھر غلام فرید کی پریشانی دیکھ کر بولی۔

"فکر نہ کر تجھے نہیں دوں گی۔"

اس طرف لکڑی کی پٹی رکھی تھی۔ سنیتا نے اسے کھولا اور اس کے اندر پڑیا کا سارا زہر ملایا۔ دیکھتے دیکھتے ہی اس نے اوپر رکھی ہوئی چار بوتلوں میں سارا زہر ملادیا اور بوتلیں ویسے ہی بند کردیں۔

"ایک سنیاسی سے لیا تھا اس نے کہا تھا کسی انسان کو اس کا ایک ذرا کھلا دو وہ کچھ لمحے میں تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ بھگوان کرے میرے سارے ابرادھی یہ پی لیں۔"

"بھگوان!" غلام فرید چونکا۔

"تم مسلمان نہیں ہو؟"

"اگر میں مسلمان نہیں ہوں تو تو مجھے چھوڑ جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔۔ میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔" غلام فرید نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اس جگہ سے نکل سکتی ہو۔"

اس نے روشندان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں اگر تو سہارا دے تو۔" سنیتا نے سر ہلایا۔

☆ ☆ ☆

حماد کو خاصی دیر بعد ہوش آیا تھا کہ وہ کیمپ واپس جائے اور پروفیسر کو اس کی اطلاع دے۔ وہ واپس بھاگا کیمپ میں داخل ہوتے ہی اس نے چلا چلا کر پروفیسر کو پکارا پہرے پر تعینات دونوں اہلکار جھپٹ کر اس کے پاس آئے۔

"کیا ہوا؟" ایک نے پوچھا۔

شور سن کر پروفیسر بھی نکل آیا تھا۔

"کیا ہوا حماد؟"

"پروفیسر صاحب۔۔۔۔! کچھ لوگ نازلی بی بی کو اغوا کر کے مندر کی طرف لے گئے ہیں۔ میں نے مندر تک ان کا تعاقب کیا تھا۔ لیکن پھر وہ نا جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔" حماد نے جلدی جلدی بتایا تھا۔

حماد نے مختصر الفاظ میں ساری روداد سنائی۔ اس دوران میں تمام محافظ بیدار ہو کر

آ گئے تھے۔ پروفیسر نے ان سے کہا۔

''چلو میرے ساتھ مندر تک۔۔۔۔ میرے خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟''

پروفیسر اور حماد کے ساتھ رینجرز کے چھ افراد بھی تھے۔ باقی افراد کو کیمپ میں رکنے اور ہوشیار رہنے کا کہا گیا تھا۔ پروفیسر اس وقت فکر کے ساتھ غصے میں تھا۔ اس نے اپنا پستول بھی ساتھ لے لیا۔ راستے میں اصل بات حماد نے چپکے سے بتائی کہ نازلی خود وہاں رمیش سے ملنے گئی تھی۔ پروفیسر نے اسے گھورا۔

''تمہیں یقین ہے اس بات کا۔''

''سو فیصد پروفیسر۔۔۔! میں نے دوسروں کے سامنے بتانا گوارہ نہیں سمجھا۔''

''تم نے اچھا کیا۔''

وہ سیدھے مندر کے داخلی دروازے سے اندر گئے۔ پروفیسر نے رینجر اہلکار کو مندر کے چاروں طرف رہنے اور باہر نکلنے والوں پر نظر رکھنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اور حماد اندر داخل ہوئے۔ ایک چھوٹے پجاری نے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر پروفیسر کا پستول دیکھ کر وہ سہم گیا۔

''لکشمن کہاں ہے اسے بلاؤ جلدی۔''

''لکشمن! میری بیٹی اغوا کر کے مندر میں لائی گئی ہے۔''

''مہاراج'' لکشمن کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہ کیسی بات کر رہے ہو۔ مندر میں لڑکی اغوا کر کے لائی گئی ہے۔ یہ سوچنا بھی پاپ ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ میرے سامنے۔۔۔۔ میری بچی یہاں لائی گئی ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ مندر کے عقبی حصے سے کسی خفیہ راستے سے اندر لائی گئی ہے۔'' پروفیسر نے حماد کی طرف اشارہ کیا۔

''لکشمن! مجھے ابھی میری بچی مل جائے اور اسے کوئی نقصان نہ ہو تو میں سب بھول جاؤں گا۔ معاملہ عزت کا ہے۔ لیکن اگر وہ نہ ملی تو پولیس آئے گی خفیہ راستہ بھی مل جائے گا اور نازلی بھی۔۔۔۔ پھر تم نہیں بچ سکو گے۔''

لکشمن نے وہ جگہ دکھانے کو کہا جس جگہ نازلی کو لانے والے غائب ہوئے تھے حماد ان کو مندر کے عقبی حصے میں لایا۔ اس نے وہ دیوار دکھائی۔

''میں نے انہیں اس جگہ تک دیکھا تھا۔ اس کے بعد اچانک روشنی غائب ہو گئی۔ جب تک میں نے اپنی ٹارچ جلائی ان لوگوں کا نام و نشان نہیں تھا۔''

پروفیسر غور سے لکشمن کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ مندروں میں آمد و رفت کے خفیہ راستے ہوتے ہیں اور اتنے بڑے مندر میں تو لازمی ہوں گے۔''

لکشمن نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی لمحے بے شمار قدموں کی آہٹیں آئیں۔ وہاں گورا خان اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آیا تھا۔ لکشمن نے روشنی کے لیے ایک مشعل ساتھ لے لی تھی اور اس کی روشنی میں ارد گرد کا منظر واضح تھا۔ گورا خان نے ان سب کو دیکھا پھر پروفیسر سے پوچھا۔

''سائیں! خیر تو ہے؟''

''میری بیٹی نازلی کو کچھ لوگ اغوا کر کے مندر میں لائے ہیں۔'' گورا خان چونکا۔ اس نے کہر آلود نظروں سے لکشمن کی طرف دیکھا۔

''بابا! تم یہ کام بھی کرتے ہو؟''

''نا مہاراج۔'' لکشمن گڑگڑانے لگا تھا۔

گورا خان پروفیسر اور حماد سے معلومات حاصل کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''اس کی اطلاع سائیں کو دینا ہو گی۔''

''تم جا کر اپنے سائیں کو اطلاع دو۔'' پروفیسر نے ناگواری سے کہا۔

''بلکہ پولیس کو اطلاع کرو۔''

''نہیں سائیں۔۔۔!'' لکشمن باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''پولیس کو اطلاع نہ کرو میں تمہاری بیٹی تلاش کروں گا۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔'' گورا خان یہ سب سن رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔

☆ ☆ ☆

محبوب شاہ متفکر سا اپنی حویلی کے خاص کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے نصف رات کے قریب اطلاع ملی تھی۔ فون اس کی اوطاق سے آیا تھا۔ اوطاق کا نگران شمس خان تھا اس نے بتایا۔

"سائیں۔۔۔۔ اعزیز ادھر آیا ہے؟"

"سائیں وہ کسی قیدی کو لا رہا تھا وہ باغ کے پاس اس کی گاڑی سے بھاگ نکلا۔ وہ اسے تلاش کر رہا ہے۔"

"عزیز کہاں ہے؟ اسے بلا۔" محبوب شاہ نے بے چینی سے کہا تھا۔

چند لمحے بعد عزیز لائن پر تھا۔

"سائیں! وہ بدبخت بھاگ گیا ہے۔"

"عزیز چاچڑ میں نے تجھے کام دیا تھا۔ وہ تجھے ہر حال میں کرنا ہے۔" محبوب شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"سائیں اس میں میرا قصور کیا ہے۔ میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

عزیز چاچڑ نے بھی لہجہ بدل لیا تھا۔

"میں نے تمہارے کام سے انکار تو نہیں کیا سائیں۔۔۔!"

"تجھے اندازہ نہیں ہے یہ کتنا اہم کام ہے۔ اسے ہر قیمت پر تلاش کرو۔"

فون بند کر کے محبوب شاہ ٹہلنے لگا تھا۔ اس نے حسب معمول اپنے لیے شراب نکالی تھی۔ اسکے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔ اگر اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا تو دھماکے کا الزام اس پر بھی آ سکتا تھا۔ سب جانتے تھے عزیز کی بے پروائی نے کام بگاڑ دیا تھا۔ مگر محبوب شاہ اسے ایک حد سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہر حال ڈاکو تھا اور اس کا دماغ گھومتے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ معاملات الجھ رہے تھے۔ گوراخان نازلی کے لیے گیا تھا اس نے سوچا کہ اسے اوطاق پہنچنا چاہیے کہیں گوراخان بھی اپنی کسی حرکت سے کام نہ بگاڑ لے۔ وہ جانے لگا تھا۔ کہ اس کے واکی ٹاکی سیٹ نے بزردی۔ اپنے آدمیوں سے رابطے کے لیے اس نے یہ طاقتور واکی ٹاکی رکھے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس علاقے میں موبائل کی سہولت نہیں تھی۔ اس نے کال رسیو کی۔ دوسری طرف گوراخان تھا۔

"سائیں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔"

"آج ہر طرف سے مسئلے آ رہے ہیں۔ بابا تم لوگوں کو حرام کی روٹیاں لگ گئی ہیں بکو کیا ہوا ہے؟"

"سائیں لڑکی غائب ہے۔۔۔۔ اس کا باپ الزام لگا رہا ہے کہ لڑکی اغوا کر کے مندر لائی گئی ہے۔ میں خود بھی ابھی مندر کے پاس ہوں۔"

"لڑکی مندر میں ہے؟" محبوب شاہ چونکا۔

"پرادھر تو۔۔۔۔"

"سائیں ابھی آدھا گھنٹہ ہے۔" گوراخان جلدی سے بولا۔

"لڑکی کو تلاش کر کے وہاں سے نکالو۔ یہ سب پجاری کی بدمعاشی ہے۔ بچ گیا تو اسے دیکھ لوں گا۔" محبوب شاہ نے اسے حکم دیا۔

"عزیز نے کام بگاڑ دیا ہے جو بندہ لا رہا تھا وہ بھاگ گیا ہے۔"

"بندہ بھاگ گیا ہے تو اس صورت میں کام خراب ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" محبوب شاہ بولا۔

"تو شاہ سائیں۔۔۔ الوگوں کو باہر نکال دوں؟" گوراخان بولا۔

بکواس مت کرو۔۔ جو بولا ہے وہ کرو۔۔۔۔ لڑکی کو نکالو۔ میں اوطاق جا رہا ہوں۔۔۔۔ عزیز سے کہو مندر کے گرد اپنے آدمی پھیلا دے۔ بچ نکلنے والوں کو غائب کرنا ہے۔ کوئی بچ کر نا جانے پائے۔" محبوب شاہ نے واکی ٹاکی بند کر کے خادم کو طلب کیا۔

"ڈرائیور کو بول گاڑی نکالے جلدی کرے۔"

"جی سائیں۔۔۔!" خادم نے کہا اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

محبوب شاہ کچھ دیر بعد اپنی شاندار جیپ میں اوطاق کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ ذمے داری اٹھا کر غلطی کی ہے۔ اگر نام اس پر آیا تو آنے والے انتخابات میں اس کی ساکھ کو بہت زیادہ نقصان ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور تکبر آمیز لہجے میں خود سے کہا۔

"محبوب شاہ ہوں۔ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

جیسے ہی جیپ اوطاق کیسامنے رکی وہ تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

نازلی کو ایسے لگا جیسے وہ پانی سے ابھر رہی ہو۔اسے کوئی خوشبو آ رہی تھی۔پھر اسے چھینک آئی اور وہ بیدار ہوگئی۔کچھ دیر اس کا سر چکراتا رہا تھا۔اس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں۔اس کے سامنے ایک سیاہ رو اور مکروہ صورت آدمی تھا وہ اس کی ناک کے آگے باریک کپڑے کی ایک تھیلی لہرا رہا تھا۔اس سے انوکھی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔اس خوشبو کو سونگھ کر وہ ہوش میں آئی تھی۔سیاہ رو پر نظر پڑتے ہیں وہ سہم کر سمٹ گئی تھی۔اس کی بے حد سفید آنکھوں اور دانتوں سے یوں لگ رہا تھا۔جیسے کوئی درندہ اسے گھور رہا ہو۔

''کک۔۔۔کون ہو تم؟''

''کتنی سندر ناری ہے۔''اس شخص نے منمناتی آواز میں کہا۔

''ابھی اسے ہاتھ مت لگانا۔''ایک اور شخص بولا۔

وہ دائیں طرف بیٹھا تھا۔اس کا رنگ سانولا تھا مگر چہرے پر مکروہ پن سیاہ رو سے زیادہ تھا۔نازلی کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔وہ نامعلوم جگہ تھی۔اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ جھیل کے کنارے تھی کہ اچانک کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔عجیب سے بو آ رہی تھی اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔۔اور اب وہ اس جگہ تھی۔

''مجھے کیوں لائے ہو؟''

نازلی نے لہنگا درست کرنے کے بہانے یہ چیک کیا تو پستول اپنی جگہ ہے یا نہیں پستول اپنی جگہ پر تھا اس نے غیر محسوس انداز میں سکون کا سانس لیا اور اوپر سے بدستور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتی رہی۔وہ جس جگہ تھی یہ سیاہ دیواروں والا کمرہ تھا۔دیوار پر جلتی مشعل کی تیز روشنی محدود لگ رہی تھی۔نہ جانے اسے کیوں محسوس ہوا کہ یہ کمرہ مندر تھا اس قسم کے کمرے مندروں میں پائے جاتے ہیں۔تو کیا اسے اغوا کر کے مندر لایا گیا تھا۔سیاہ رو سانولا دونوں اس سے ذرا فاصلے پر تھے اور اسے گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔البتہ انہوں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔نازلی کو خیال آیا ان کو کسی کا انتظار تھا۔

''کمار کو یہ آج کیا سوجھی ہے۔''سانولے نے ایک اور شخص سے پوچھا۔

''سنیتا کے اغوا نے اسے پاگل کر دیا ہے۔''

''وہ بدلے میں اسے اٹھا لایا۔''سانولے نے نازلی کی طرف دیکھا۔

سیاہ رو نے مسکرا کر کہا۔

''مسلمانوں کا مذہب کہتا ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ۔۔۔۔اور جان کے بدلے جان۔۔۔۔عورت کے بدلے عورت ہو سکتی ہے۔۔۔۔''

نازلی چونکی تھی۔سنیتا کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔یہ بات اس نے ان دونوں سے کہی۔سانولے نے شانے اچکائے۔

''یہ تو کمار جانے۔۔۔ہم نے تو اسکے لیے کام کیا ہے۔اب ہمیں بھی حصہ ملے گا۔''

نازلی کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی تھی۔کہ وہ کس شے میں حصے کی بات کر رہا تھا۔اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔وہ مسلح تھی لیکن پستول نکال کر ان لوگوں پر استعمال کرنا آسان نہیں تھا۔وہ صورت اور باتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔

''کمار کون ہے؟''

''ابھی آئے گا تو دیکھ لینا۔۔۔پر دعا کر ذرا دیر سے آئے۔۔۔۔جب تک وہ نہیں آتا تو محفوظ رہے گی۔''اسی لمحے ایک طرف سے دیوار کو تھپکنے جیسی آواز آئی۔سانولا چونکا۔

''تیری قسمت اچھی ہے۔۔۔کمار آ گیا۔اب تیار ہو جا۔''

اسی لمحے دیوار اپنی جگہ سے سرکی اور نازلی رمیش کو اندر آتے دیکھ کر اچھل پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

لکشمن اور پروفیسر اندر آئے۔لکشمن نے اس سے کہا۔

''مہاراج یہ مندر کا راز ہے۔پر میں صرف آپ کے واسطے اسے ظاہر کر رہا ہوں۔۔۔۔آیئے۔''

لکشمن نے ایک الگ کمرے میں کالی کی دیوی کے بت کا ایک ہاتھ پکڑ کر کھینچا

اور بت فرش سمیت ایک طرف ہو گیا۔ سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ لکشمن پروفیسر کو لے کر نیچے گیا۔ یہ تہہ خانہ تھا اور اس کے ایک طرف سرنگ نما راستہ مندر کے عقبی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ تہہ خانہ خالی تھا۔ پروفیسر نے سرنگ میں جھانکا۔ سرنگ کوئی بیس پچیس گز لمبی تھی اور کا خاتمہ ایک سپاٹ سی دیوار پر ہوا رہا تھا۔ لکشمن نے پروفیسر کو اس کے پیچھے لے جا کر دکھایا۔

"یہ کنڈی گھمانے سے دیوار میں دروازہ کھل جاتا ہے۔"

"اور باہر سے؟"

"اس کا طریقہ دوسرا ہے۔" لکشمن نے غیر واضح انداز میں کہا۔

"آپ نے دیکھ لیا ادھر کوئی نہیں ہے۔"

"میری بیٹی اسی جگہ لائی گئی ہے۔" پروفیسر نے ارد گرد دیکھا۔

"اس سرنگ کو دیکھنے کے بعد مجھے تو پورا یقین ہو گیا ہے کہ جمادغلط نہیں کہہ رہا ہے نازلی اس مندر میں ہے۔ میرا یہ خیال ہے مجھے پولیس بلانی پڑے گی۔"

"مہاراج۔" لکشمن بوکھلا گیا۔

"میں آپ کو پورا مندر دکھا سکتا ہوں۔"

جس طرح یہ خفیہ جگہ ہے اس طرح اس میں نہ جانے کتنے خفیہ حصے ہوں گے۔ اگر تم شرافت سے نا مانے تو مجھے پولیس بلانی پڑے گی۔ لکشمن تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔"

لکشمن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تھیں۔ پروفیسر نے گھڑی پر نظر جما دی تھیں۔ ایک منٹ۔۔۔ دو منٹ۔۔۔ پانچ منٹ۔۔۔ اور پھر دس منٹ ہو گئے۔

"لکشمن تم نے موقع گنوا دیا۔ مشکل سے ایک گھنٹے کے اندر پولیس اس پورے مندر کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔"

"پولیس بلانے کی ضرورت نہیں ہے پروفیسر سائیں۔۔۔!" سیڑھیوں کی طرف سے گورا خان کی آواز آئی۔

"یہ ابھی بتائے گا۔ لے آؤ اس کی بیٹی کو۔۔۔"

گورا خان نے اوپر موجود افراد سے کہا۔ اور وہ ایک پندرہ سولہ کی ڈری سہمی لڑکی کو اندر لے آئے۔ وہ خوبصورت تھی اور صورت کے لحاظ سے رمیش سے ملتی تھی۔ لکشمن بے اختیار اس کی طرف لپکا۔

"ساریہ۔۔۔ یہ تجھے لے آئے۔۔۔" گورا خان نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

"لکشمن۔۔۔! پروفیسر کی لڑکی کہاں ہے۔ بتا دے۔۔۔ ورنہ ابھی تیرے سامنے آدمی تیری لڑکی سے جو سلوک کریں گے وہ تجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"بھگوان کے لیے مہاراج۔۔۔ مجھے معلوم نہیں۔ میری ساریہ بے قصور ہے۔"

"تو اس طرح نہیں مانے گا۔ اتارو لڑکی کے کپڑے۔" گورا خان نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" پروفیسر نے برہمی سے کہا۔

"میری بچی غائب ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی بے گناہ کو سزا دی جائے۔"

"پروفیسر تم بھی چپ رہو۔"

گورا خان غرایا۔ اس نے کلاشنکوف اٹھا رکھی تھی۔ اس کے آدمیوں نے اس کے حکم پر عمل درآمد شروع کیا۔ تو ساریہ مچلنے لگی۔ لیکن وہ کمزور سی لڑکی۔ ان مسٹنڈوں کا مقابلہ کیسے کرتی۔ لکشمن گورا خان کی منت سماجت کرنے لگا۔

"بھگوان کے لیے مہاراج۔۔۔!"

"تب بتاؤ پروفیسر کی لڑکی کہاں ہے؟"

"بتاتا ہوں۔"

لکشمن نے ایک نظر اپنی بیٹی کو دیکھ کر کہا جسکے بیشتر کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اپنی برادری کی بیٹیوں کا سودا کرنے والا اپنی بیٹی کو اپنی نظروں کے سامنے بے آبرو ہوتے دیکھ کر ہمت ہار گیا تھا۔ وہ سرنگ والے راستے کی طرف بڑھا تھا کہ تہہ خانے کی محدود فضا میں دھماکے کی آواز گونجی اور پھر پے در پے فائر ہونے لگے۔

☆ ☆ ☆

سیتا کسی نہ کسی طرح روشندان سے نکل آئی۔ اس کے لہنگے کا نچلا حصہ کسی کیل

سے اٹک کر پھٹ گیا تھا۔ ہاتھ پیروں پر خراشیں آئی تھیں مگر اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ دونوں نیچے پہنچ گئے غلام فرید نے اس سے کہا آواز مت نکالنا اور جیسا وہ کہے ویسا کرنا۔

عزیز چاچڑ اور اسکے ساتھی وہاں سے جا چکے تھے۔ ورنہ اتنا سناٹا نا ہوتا۔ غلام فرید پہلے خود نیچے اترا اور پھر اس نے سنیتا کو اتارا۔ نہ جانے کیوں سنیتا کو اس کے ہاتھ لگے تو اسے شرم آنے لگی۔ اسے تعجب ہوا اس کا خیال تھا وہ اپنی شرم وحیا کھو چکی ہے۔ اگرچہ ماحول تاریک تھا اس کے باوجود اسے فکر تھی کہ غلام فرید کی نظر کے سامنے اس کے لباس کا کوئی حصہ کھل نہ جائے۔

"اب کدھر جانا ہے۔"

غلام فرید نے اوطاق کی عمارت سے دور نکلنے کے بعد سرگوشی میں پوچھا۔

"مجھے اس علاقے کا پتا نہیں ہے۔ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"بستی نہیں جا سکتے۔" سنیتا نے خود سے کہا۔ اسے معلوم تھا جیسے ہی اس کی گمشدگی کا علم ہوگا یہ بھوکے درندے اس کے گھر کا رخ کریں گے۔

"ایک جگہ ہے۔" اس نے غلام فرید کا ہاتھ تھام لیا۔

"مندر۔ ہمیں وہاں پناہ مل سکتی ہے۔ مہا پجاری کا لڑکا رمیش مجھ سے ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ مجھے اور تجھے چھپا لے گا۔"

"میں مسلمان ہوں۔ مجھے مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

"مہا پجاری کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ رمیش بہت اچھا لڑکا ہے۔"

نہ جانے کیوں غلام فرید کو اس کے منہ سے رمیش کا تذکرہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"کیا وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"

"پسند۔۔۔ نہ بابو۔۔۔ مجھے کون پسند کرے گا۔ بے آبرو لڑکی کا کیا مول۔۔۔"

غلام فرید کو اندر سے دھچکا سا لگا۔

"تجھ پر اتنا ظلم ہوا ہے؟"

"یہ تو پرانی بات ہے بابو۔۔۔! آج یہ مجھے پھر اٹھا لائے۔۔۔ پر بھگوان نے بچانا تھا اس لیے تجھے بھیج دیا۔"

"یہ جگہ کس کی ہے؟"

"تو نہیں جانتا۔۔۔ وڈیرے محبوب شاہ کو۔۔۔" سنیتا نے حیرت اور نفرت سے کہا۔

"اس سے بڑا پاپی اور کون ہوگا۔ اس نے پہلے مجھے بے آبرو کیا اور پھر اپنے کتوں کے آگے ہڈی کی طرح پھینک دیا۔ وہ مجھے۔۔۔۔"

"خدا کے لیے چپ کرو۔"

غلام فرید گھبرا گیا اس کی ماں نے اسے عورتوں کی عزت کرنا سکھایا تھا اور وہ کسی عورت کے منہ سے بھی اسکے اپنے بارے میں اس قسم کے الفاظ نہیں سن سکتا تھا۔

"تو سن کر ڈر گیا۔ مجھ پر تو گزری ہے۔۔۔ بتا ایسی لڑکی کو کون پسند کرے گا۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ پر اتنا سمجھتا ہوں تو بے گناہ اور معصوم ہے۔ اس معاملے میں تیرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" سنیتا چلتے چلتے رک گئی۔

"سچ۔۔۔ تو سچ کہہ رہا ہے بابو۔۔۔! میں نردوش (بے گناہ) ہوں۔"

"ہاں کیوں کہ تو مظلوم ہے تجھ پر ظلم ہوا ہے۔۔۔ تجھے کون الزام دے سکتا ہے۔"

سنیتا دبی آواز میں رونے لگی تھی۔ وہ اپنا منہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ غلام فرید گھبرا گیا تھا۔ رات کے سناٹے میں معمولی سی آواز بھی دور تک جا سکتی تھی اور جب سنیتا کی آواز بلند ہونے لگی اور اس نے بوکھلا کر چپ کرانے کی کوشش کی۔

"خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔۔۔ کسی نے آواز سن لی تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔" سنیتا بمشکل چپ ہوئی۔ اس کا جسم رہ رہ کر لرز رہا تھا۔

"تو پہلا شخص ہے جس نے مجھے نردوش کہا ہے ورنہ میرے ماتا پتا بھی مجھے دوشی کہتے ہیں۔"

غلام فرید اس کے گھر والوں کا المیہ سمجھ رہا تھا۔ اس کا اپنا تعلق دیہی علاقے سے تھا جہاں زور آوروں کے کمزوروں پر اس قسم کے ظلم عام تھے اور پھر نشانہ بھی وہی بنتا تھا جو ظلم کا شکار ہوتا تھا۔ ابھی تک وہ چل رہے تھے اس لیے سردی کا اتنا احساس نہیں تھا۔ لیکن جب

رکے اور خطرے کا احساس کم ہوا تو سردی مزاج پوچھنے لگی۔ غلام فرید اور سنیتا دونوں ناکافی لباس میں تھے غلام فرید نے آہستہ سے کہا۔

"چلنے کی کرو۔۔۔ ورنہ دشمن آجائیگا۔"

جب تک باغات رہے وہ درختوں کی آڑ میں چلتے رہے کیونکہ کھلے میں وہ دوسروں کی نظروں میں آسکتے تھے۔ غلام فرید کو معلوم تھا کہ عزیز چاچڑ اور اس کے ساتھی پاگل کتے کی طرح اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جب باغات کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ مجبوراً کھلے میں نکلے۔ خوش قسمتی سے شدید سردی کے موسم میں باغات میں کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ورنہ وہ مشکل میں پڑ جاتے۔ باغات کے بعد خشک کھیت تھے جن کو پانی نہیں مل رہا تھا۔ اس کے پرے ریت شروع ہو جاتی تھی جو دور ریت کے ٹیلوں سے جا کر مل جاتی تھی۔

کھیت سے گزر کر وہ ریت تک آئے۔ وہاں سے سنیتا بائیں طرف گھوم گئی۔

"اس ٹیلے کے پیچھے مندر اور ہماری بستی ہے۔"

اس نے اشارہ کیا دونوں ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ لیکن جیسے ہی وہ اوپر پہنچے تو اس نے نیچے کئی افراد کو روشنی لے کر مندر کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا غلام فرید ڈر گیا۔ اسے لگا کہ عزیز چاچڑ کے آدمی اس کی تلاش میں مندر تک آگئے تھے اس نے سنیتا کو روک لیا۔

"بیٹھ جا۔۔۔ حرکت مت کرنا۔۔۔ آواز نہ نکلے۔"

☆ ☆ ☆

رمیش کو دیکھ کو نازلی کو صحیح معنوں میں صدمہ ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنا معصوم اور شریف نظر آنے والا اتنا مکار نکلے گا۔ وہ کتنی دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی رمیش سنجیدہ تھا۔ لیکن اپنے کیے پر شرمندہ بالکل نظر نہیں آرہا تھا۔ نازلی نے بمشکل پوچھا۔

"رمیش۔۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ اس نے تلخی سے کہا۔

"سنیتا ایک بار لٹی۔۔۔ اسے پھر سے اٹھا کر لیے گئے میری بستی کی کتنی ہی لڑکیاں اپنی عزت کھو چکی ہیں۔"

"تو اس میرا کیا قصور؟"

"قصور ان کا بھی نہیں ہے وہ پھر بھی لٹ گئیں۔" رمیش نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب تیری باری ہے۔"

"یہ ظلم ہے۔"

نازلی نے کونے میں سمٹتے ہوئے بہ ظاہر بے خیالی میں لہنگا اوپر کیا۔ نیچے اس نے لیگن پہن رکھا تھا اس لیے اسے خدشہ نہیں تھا۔

"سنیتا پر میں نے تو ظلم نہیں کیا۔"

"ہاں پر ایسا کرنے والے میرے ہم قوم ہیں۔" سیاہ رو بولا۔

"اب ان کا بدلہ تجھ سے لیا جائیگا۔"

"رمیش!" نازلی روہانسی انداز میں بولی۔

"میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تم یہ صلہ دے رہے ہو۔"

"میں مجبور ہوں میں اپنی لڑکیوں کو تحفظ نہیں دے سکتا پر ان کا بدلہ تو لے سکتا ہوں۔"

"اس کا انہیں کیا فائدہ؟"

"نہ ہو۔۔۔۔۔ پر میرے دل میں تو ٹھنڈ پڑ جائے گی۔"

"تم کیا سوچتے ہو میرے ساتھ برا کر کے تم بچ جاؤ گے۔" نازلی نے اسے ڈرایا۔

"کمار تو وقت گنوا رہا ہے۔" سیاہ رو نے بے تابی سے کہا۔

"اپنا کام کر اور اسے ہمارے حوالے کر۔۔۔ کل رات تک یہ سرحد بھی پار کر جائے گی۔" نازلی چونکی۔

"تم پاکستانی نہیں ہو؟"

"ہم پاکستانی ہی ہیں۔۔۔ پر ادھر سے بھی ہمارا تعلق ہے۔" سانولا شخص بولا۔

"کمار دیکھ رہا ہے۔۔۔ کام کر اپنا۔" سیاہ رو نے رمیش کو للکارا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ اسکے چہرے پر ہچکچاہٹ عیاں تھی۔ پھر وہ رک گیا۔

''مجھ سے نہیں ہوگا۔ تم لوگ اسے لے جاؤ۔''

''مردین۔'' سانولے نے بھی اسے اکسایا۔ پھر سیاہ رو سے بولا۔

''کپڑے اتار اس کے۔۔۔۔ اپنا یار خود راضی ہو جائے گا۔''

''میرے قریب نہ آنا۔''

نازلی سیاہ رو کو اٹھتے دیکھ کر سمٹ گئی۔ مگر سیاہ رو اس پر شکرے کی طرح جھپٹا تھا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا۔ نازلی نے ہولسٹر سے پستول نکال کر اس کے سینے میں گولی اتار دی یہ کام اس نے بغیر کسی ارادے کے خود کار انداز میں کیا تھا۔ اعشاریہ 22 کا کی گولی اس وزنی شخص کو کیا روکتی مگر گولی اتفاق سے دل میں اتر گئی۔ اور وہ ٹھنڈا ہو کر نازلی پر گرا تھا۔ اس نے گھبرا کر دو فائر اور کیے اور سیاہ رو کو ایک طرف دھکیل دیا سانولا اس کی طرف جھپٹ رہا تھا نازلی نے اس کی طرف پستول کر کے ٹریگر دباتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس وقت تک دباتی رہی جب تک پستول سے خالی کلک کی آواز نہیں آئی تھی۔ سانولا شخص بھی ایک بھیانک کراہ کے ساتھ اوندھے منہ گرا تو نازلی نے آنکھیں کھولیں۔ رمیش دروازے کے پاس کھڑا تھا اور پتھر کی دیوار ایک طرف سرک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سنیتا کے ماں باپ بیٹی کے لیے تڑپ رہے تھے۔ ان کا دل اس جشن میں کہاں لگتا۔ آخر وہ چھپتے چھپاتے مندر سے نکل آئے۔ حالانکہ صبح سے پہلے مندر سے باہر آنا ان میں بدشگونی شمار ہوتا تھا۔ وہ باہر آئے اور تاریکی میں بستی کی طرف ایسے سفر کر رہے تھے جیسے دن کی روشنی میں کرتے تھے۔ وہ بستی کے قریب پہنچے تو ان کو روشنیاں نظر آئیں۔ روشنیاں نظر آنا خاص بات تھی۔ وہ غریبوں کی بستی تھی۔ ان کو تیل کا دیا بھی مشکل سے ملتا تھا اور یہ طاقتور برقی روشنی تھی۔ ان دونوں کا پہلا خیال یہی آیا کہ ان کی بستی میں ڈاکو گھس آئے تھے۔

سنیتا کا باپ بولا۔

''یہ۔۔۔۔ ڈاکو ہیں۔۔۔۔ واپس چلیں۔۔۔۔''

دیہی علاقوں اور خاص طور سے سندھ میں ڈاکو کا لفظ بہت دہشت رکھتا ہے۔ اگر کوئی عام فرد ڈاکو کو دیکھ لے تو خوف سے اس کی حالت بری ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان دو بوڑھے میاں بیوی کا تھا۔ وہ اپنی عمر سے قطع نظر اتنی تیزی سے واپس بھاگے تھے کہ جو فاصلہ آتے ہوئے دس منٹ میں طے ہوا تھا۔ وہ انہوں نے بمشکل دو منٹ میں طے کر لیا تھا اور ان کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں ہانپتے ہانپتے وہ مندر میں گھس گئے۔ دروازے پر مامور پجاری ان کو دیکھ کر چونکا۔ اس نے انہیں جاتے نہیں دیکھا تھا۔

''تم۔۔۔ کدھر سے آ رہے ہو؟''

''ڈ۔۔۔۔۔ ڈاکو۔۔۔'' سنیتا کے باپ نے بہ مشکل کہا۔ اس کی حالت خوف اور چڑھی سانسوں کی وجہ سے غیر ہو رہی تھی۔ مگر پجاری کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ وہ اندر کی طرف بھاگا۔ جبکہ سنیتا کے ماں باپ مرکزی ہال کی طرف آئے جہاں ان کی برادری ناچ گا کر جشن منا رہی تھی۔ سنیتا کے باپ نے ہال میں داخل ہوتے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ موسیقی اور آوازوں میں چیخ چیخ کر سب کو ڈاکوؤں کے بارے میں بتا رہا تھا جو ان کی بستی لوٹ رہے تھے۔

اس بستی میں سب سے غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس جو بھی تھا وہ ان کے لیے بے حد قیمتی تھا۔ ڈاکوؤں کا سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ سب کو اپنے اپنے گھروں کی پڑ گئی۔ پہلے نوجوان مشعلیں لے کر بھاگے۔ ان کے پیچھے دوسرے بھاگے بوڑھے بچے بھی جوش میں نکل گئے تھے۔ ایک منٹ کے اندر مندر کا مرکزی ہال خالی ہو گیا تھا اور وہاں سوائے سنیتا کے بوڑھے ماں باپ کے اور کوئی نہیں رہا یا درگا دیوی کی مورتیاں اور اس کے ایک روپ کی سیاہ مورتی۔ جو اسکے پیروں میں رکھی ہال میں موجود تھیں۔ دو بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ تب سنیتا کی ماں نے سسکی لی۔

''میری سنیتا۔۔۔۔ نہ جانے کہاں ہوگی۔''

''بھگوان اسے اپنے پاس بلا لے یا ہمیں اپنے پاس بلا لے۔''

سنیتا کے باپ نے بھرائی آواز میں کہا اور اس کے منہ سے نکلنے والے آخری الفاظ تھے۔

☆ ☆ ☆

عزیز چاچڑ کے آدمی اس پورے علاقے میں پھیل کر غلام فرید کو تلاش کر رہے تھے۔ان کے پاس گاڑیاں تھیں ۔عزیز نے ان کو مندر اور مندر کے پاس موجود بستی میں جانے کا حکم دیا اسے شبہ تھا کہ غلام فرید مندر یا بستی میں جا کر نہ چھپ کر گیا ہو۔تاہم اس نے اپنے ساتھیوں کو مندر سے دور رہنے کا حکم دیا تھا اس کا پہلا منصوبہ تو ناکام ہو چکا تھا۔دو بجنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔وہ دھماکے سے پہلے مندر سینہ نکلنا تو لازمی بات تھی وہ بھی مارا جاتا اور محبوب شاہ کا منصوبہ پورا ہو جاتا مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔اس نے فیصلہ کیا اگر غلام فرید اس کے ہاتھ آ گیا تو وہ اسکے جسم پر دستی بم باندھ کر اسے مندر کے بلے پر اڑا دے گا۔شاید اس طرح ان کا منصوبہ مکمل ہو جائے۔

عزیز چاچڑ خود مندر کے عقبی حصے تک آیا تھا۔اس کے ساتھی بستی کی طرف گئے تھے۔وہ ابھی مندر سے کچھ دور تھے کہ ان کو گاڑیوں کی روشنی میں مندر کے عقبی حصے میں تین چار مسلح اور باوردی افراد نظر آئے۔عزیز نے دوربین سے دیکھا۔

"رینجرز۔۔۔۔۔یہ کہاں سے آ گئے؟"

اس نے خود سے سوال کیا پھر اسے یاد آیا۔آثار قدیمہ دریافت کرنے والے ماہروں کی حفاظت کے لیے رینجرز لگی تھی۔لیکن یہ مندر کے پاس کیا کر رہے تھے۔اس نے تشویش سے سوچا پھر اس نے وائی ناکی پر محبوب شاہ سے رابطہ کیا۔

"شاہ سائیں!ادھر مندر کے پاس رینجرز والے ہیں۔"اس نے بتایا۔

"چھوکرے کو تلاش کرنا بے کار ہے۔"

"شاہ سائیں۔۔۔۔!میں بعد میں اس کے جسم سے دستی بم باندھ کر اڑا دوں گا۔"

"تجھے نہیں پتا۔۔۔۔خودکش حملہ ایسے نہیں ہوتا۔"محبوب شاہ نے بے زاری سے کہا۔

"اپنے ساتھی کو لے کر واپس چلا جا۔اب تیرا اس علاقے میں ہونا ٹھیک نہیں ہے۔وقت کم رہ گیا ہے۔اور سن ابھی بنگلے پر بھی مت جانا۔اپنے کسی ٹھکانے کی طرف نکل

جا۔"

"اچھا شاہ سائیں۔۔۔!"عزیز چاچڑ مایوسی سے بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محبوب شاہ نے اچانک اپنا ارادہ کیوں بدل دیا ہے اسے مایوسی ہوئی تھی۔اس نے سوچا تھا مندر سے اٹھائی جانے والی عورتوں اور لڑکیوں میں سے وہ اپنے ساتھیوں کے لیے چن کر نکال لے گا اور باقی محبوب شاہ کی جیل پہنچا دے گا۔مگر وہ اسے یہاں سے جانے کا حکم دے رہا تھا۔اسی لمحے اسے بستی کی طرف سے روشنیوں کے ساتھ شور کی آواز سنائی دی تھی۔اس کے ساتھ جیپیں تھیں اور وہ مندر سے کافی فاصلے پر تھا۔رینجرز کی موجودگی میں اس طرف جانے کا مطلب تھا تصادم اور وہ اس سے بچنا چاہتا تھا۔اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

"مندر سے پرے رہ کر بستی کی طرف چلو۔"

عزیز چاچڑ اور اس کے ساتھیوں کی گاڑیاں اس طرف گھوم گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

محبوب شاہ کا غصے سے برا حال تھا اور وہ گورا خان سمیت تمام متعلقہ افراد کو ناقابل بیان گالیاں دے رہا تھا۔اسے اوطاق میں آ کر پتا چلا تھا کہ گورا خان نے سنیتا نامی اس لڑکی کو پھر اغوا کرا لیا تھا جسے ایک بار محبوب شاہ کے کہنے پر اغوا کرایا تھا۔اس نے محبوب شاہ سے پوچھے بغیر یہ کام کیا تھا۔لیکن محبوب شاہ کو اصل غصہ اس پر تھا کہ سنیتا اس کی اوطاق سے کیسے بھاگ گئی۔اوطاق کے نگران نے اسے بتایا تھا کہ سنیتا کو عقبی حصے میں قید رکھا گیا تھا۔وہ روشن دان کے راستے فرار ہو گئی۔یہ سنتے ہی محبوب شاہ غضب ناک ہو گیا تھا۔اس نے اوطاق کے تمام حرام خور ملازمین کو بلا لیا تھا۔جو نگرانی کرنے کے بجائے پڑے سو رہے تھے۔دس منٹ میں محبوب شاہ نے بہ دست خود چمڑے کے ہنٹر مار کر ان کی کھال ادھیڑ دی تھی۔اور اب گورا خان کو گالیاں دے رہا تھا۔شمس خان فی الحال اس عتاب سے بچ گیا تھا کیونکہ اس نے گورا خان کو اوطاق کے گرد پہرا لگانے کا مشورہ دیا تھا۔مگر اس نے مانا نہیں تھا۔

محبوب شاہ سوچ رہا تھا کہ سنیتا کو اس لڑکے نے تو آزاد نہیں کرایا جو عزیز چاچڑ

کے پاس سے فرار ہوا تھا اور ایسا ہوا تھا تو یہ اس کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اس نے سوچا اور عین اس وقت جب کہ عزیز سے رابطہ کرنے والا تھا۔ اس کی کال آ گئی۔ محبوب شاہ نے مندر کے گرد رینجرز کی موجودگی کا سنا اور عزیز چاچڑ کو فوری فون کر کے علاقے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس نے مندر سے نکلنے والی عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کروانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اب اسے انتظار تھا کہ گورا خان کیا کر دکھاتا ہے۔ یہ تو طے تھا کہ پروفیسر کی لڑکی کے اس طرح اغوا ہونے سے محبوب شاہ کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ اب اگر وہ بازیاب ہو بھی جاتی تب بھی اس کا حصول ممکن نہیں تھا۔ پروفیسر اسے سخت حفاظت میں رکھتا یا اسے یہاں سے لے جاتا۔ وہ گورا خان کو کال کرنے جا رہا تھا کہ اسے لگا زمین ہل گئی ہو اور پھر ایک زوردار دھماکے نے اوطاق کے در و دیوار کو لرزا دیا۔

☆ ☆ ☆

پروفیسر اور دوسرے لوگ بری طرح چونکے تھے اچانک سرنگ کی ایک طرف کی دیوار میں شگاف نمودار ہوا اور اس سے رمیش یوں لڑکھڑا کر باہر آیا جیسے اسے کسی نے اندر سے دھکا دیا ہو۔ لکشمن بے تاب ہو کر اس کی طرف لپکا تھا۔

"رمیش تو ٹھیک تو ہے نا۔۔۔"

"پتا جی۔۔۔! کمار۔۔۔ موہن۔۔۔ کو اس نے مار دیا۔" رمیش چیخا۔

اسی لمحے شگاف سے نازلی باہر آئی تھی اس بار پروفیسر اس کی طرف لپکا۔

"نازلی! تم ٹھیک ہو نا میری بچی۔۔۔"

"پاپا۔۔۔!"

وہ اس سے لپٹ گئی تھی اب تک وہ حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرتی آئی تھی۔ لیکن اب اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ بری طرح رونے لگی تھی حالانکہ ابھی چند لمحے پہلے اس نے دو افراد کو گولی ماری تھی۔ پھر وہ بے ہوش ہو کر پروفیسر کے بازوؤں میں جھول گئی۔

گورا خان نے رمیش کو گردن سے پکڑا۔

"یہ کیا چکر ہے چھوکرے۔۔۔!"

"مجھے نہیں معلوم مہاراج۔۔۔!" رمیش نازلی کو بے ہوش دیکھ کر انجان بن گیا۔

"یہ ایسے نہیں بتائے گا۔" گورا خان نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"لے چلو اسے۔۔۔"

فائرنگ کے بعد ہونے والی افراتفری میں گورا خان کے ساتھیوں کی توجہ سارے سے ہٹ گئی تھی اور وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلی تھی گورا خان کے شرمندہ ساتھیوں نے جھپٹ کر رمیش کو دبوچ لیا۔ دوسری طرف پروفیسر بھی نازلی کو گود میں اٹھائے سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ اچانک اس کو خیال آیا۔ اس نے لکشمن سے کہا۔

"باہر جانے والا دروازہ کھولو۔۔۔ جلدی۔" لکشمن ہچکچایا۔ تو گورا خان نے اس کی پشت پر کلاشنکوف کی نال رکھ دی۔

"جلدی کر حرام زادے۔۔۔!"

پروفیسر نے سوچا وہ واقعی بوڑھا آدمی تھا تھک جاتا اس نے نازلی کو حماد کے حوالے کر دیا اور خود چیخ کر حوالدار خان محمد کو پکارا۔ وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔

"جی صاحب۔۔۔ حکم۔"

"سب کو بولو۔۔۔ کیمپ۔۔۔"

پروفیسر کی بات اسکے منہ میں رہ گئی دھماکے سے پہلے زمین لرزی تھی اور اس کے بعد ایسا خوفناک دھماکہ ہوا ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ سب ہی زمین پر جا گرے تھے مندر کا اوپری حصہ یوں پھٹ گیا تھا جیسے کاغذ کا بنا ہو۔ اس سے شعلے اٹھے تھے مندر کے جس خفیہ راستے سے وہ نکلے تھے اس سے بھی شعلے نکلے تھے اور اس کے بعد ان کے اردگرد ملبے کی بارش ہونے لگی تھی۔ سب سے پہلے حماد اٹھا اور نازلی کو کندھے پر ڈال کر وہاں سے بھاگا تھا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر دوسروں کو بھاگنے کو کہہ رہا تھا۔ پروفیسر بھی اس کے ساتھ بھاگا تھا۔ دھماکے کی لہر نے ان سب کے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ اس لیے وہ صرف فطری جبلت کے تحت جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ ورنہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے صرف ایک شخص کو کسی قدر ہوش تھا اور وہ لکشمن تھا کیونکہ اس کا پورا خاندان سوائے رمیش اور خود اس کے مندر کے اندر تھا۔ ان کے ساتھ بستی کے تقریباً ڈھائی سو افراد

بھی تھے لیکن لکشمن کو صرف اپنی بیوی اور بچوں کو خیال تھا۔ بے حد موٹی دیواروں کی وجہ سے مندر کا ڈھانچا تباہ ہونے سے بچ گیا تھا لیکن اسکی چھت اور اوپری منزل اڑ گئی تھی اور کسی کے بچنے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ لکشمن نے سامنے والے دروازے سے داخل ہونا چاہا لیکن سامنے ملبے کے ڈھیر اور چند مسخ شدہ لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا تھا پھر اسکی نظر بستی کے کچھ لوگوں پر پڑی جو بستی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ اس نے لپک کر ایک آدمی کو پکڑا۔

"اندر کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں۔" وہ شخص بولا۔

"بستی پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔"

"ہم نہیں مہا پجاری! تم برباد ہوئے ہو۔۔۔۔۔ میرا پریوار تو سلامت ہے۔"

اس شخص نے مسرت کے عالم میں کہا اور لکشمن سے ہاتھ چھڑا کر وہاں سے چلا گیا۔ پھر وہ چونکا اسے رمیش کا خیال آیا۔ وہ اس طرف بھاگا۔ جہاں گورا خان اور اس کے ساتھی رمیش کے ساتھ موجود تھے لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اسے سوائے زمین پر اوندھے منہ پڑی ایک لاش کے سوا کوئی نہیں ملا۔ مندر کے ملبے کی کسی بھاری اینٹ نے اس کا سر عقب سے پاش پاش کر دیا تھا۔ لکشمن نے اسے لباس سے پہچانا وہ رمیش تھا۔ لکشمن دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

☆ ☆ ☆

محبوب شاہ منتظر تھا کہ گورا خان کب آتا ہے وہ دھماکے کے پندرہ منٹ بعد آیا تھا اس کی اور اسکے چار ساتھیوں کی حالت بری تھی۔ گورا خان کا ایک بازو کوئی چیز لگنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی بری طرح سے زخمی تھے۔ محبوب شاہ کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً ان کو طلب کر لیا تھا۔ گورا خان اپنا بازو پکڑے کراہتا ہوا اندر آیا۔ محبوب شاہ نے اس کے زخمی ہونے کی پرواہ کیے بغیر اس سے پوچھا۔

"گورا خان۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ مندر تباہ ہو گیا۔"

"پتا نہیں سائیں۔۔۔! دھماکہ ایسا تھا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔۔۔ میں مندر

سے پچاس فٹ کے فاصلے پر تھا میرا یہ حال ہوا جو اندر ہوں گے۔ ان کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔ شاید ہی کوئی بچا ہو۔"

محبوب شاہ کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا۔ اس نے بلند آواز سے قہقہہ لگایا۔

"یعنی میرا کوئی دشمن زندہ نہیں بچا۔۔۔ ان کا یہی حشر ہونا چاہیے تھا۔"

"شاہ سائیں۔۔۔! میں مر رہا ہوں۔۔۔ خدا کے لیے مجھے اسپتال بھجوائیں۔"

محبوب شاہ نے بدمزگی سے اسے دیکھا اور شمس خان کو آواز دی۔

"ارے بابا۔۔۔! اس کو زچہ بچہ خانے بھجواؤ یہ بچہ جننے والی عورت سے زیادہ شور کر رہا ہے۔"

محبوب شاہ اوطاق میں اپنے خاص کمرے میں آیا اگرچہ اس کا منصوبہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا تھا مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے بیرون ملک آقاؤں کو لاشیں درکار تھیں۔ اور وہ ان کو مل گئیں تھیں۔ اب الزام جس کے سر بھی جائے اسکی بلا سے اس پر کوئی شک کرتا بھی تو اس کا کیا کچھ بگاڑ سکتا تھا۔ محبوب شاہ نے خادم کو آواز دی ایک لڑکا اندر آیا۔

"بابا۔۔۔ جا کر کوئی وہسکی مسکی لاؤ ہمارے لیے۔"

محبوب شاہ کو نازلی کے ہاتھ سے نکل جانے افسوس تھا کسی نے اس پر پہلے ہی ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اسے گورا خان سے پوچھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ مگر اب اسے پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ اس جنگل کا سب سے بڑا درندہ تھا اور اسے شکار کی کیا کمی تھی نازلی نہ سہی کوئی اور سہی۔ اس نے خود سے کہا۔

"بابا شیر ابھی زندہ ہے۔ اسے کیا پرواہ۔ ایک ہرنی ہاتھ سے نکل جائے ہرنیوں کی کمی نہیں۔" خادم لڑکے نے وہسکی کی بوتل اور گلاس لا کر اس کے سامنے رکھا۔

"اب تو جا بابا۔۔۔! ضرورت پڑی تو بلوا لوں گا۔"

محبوب شاہ نے اسے حکم دیا۔ لڑکا خاموشی سے چلا گیا۔ محبوب شاہ نے وہسکی کی بوتل کھولی اور ایک پیگ بنایا۔

"جنگل کے شیر کے نام۔۔۔"

اس نے گلاس بلند کی اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ وہ دوسری بار گلاس میں شراب الٹ رہا تھا کہ یک لخت اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے اور نظر دھندلانے لگی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو منہ کے بل گر پڑا۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جنگل کا شیر مر چکا تھا۔ سنیاسی کا زہر بے حد سریع الاثر تھا۔ اس نے کام کر دکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ان بوتلوں میں زہر کیوں ملایا تھا۔"

"میں وہاں اسی لیے تو گئی تھی۔" سنیتا نے جواب دیا۔

"ورنہ ان درندوں کے پاس کیوں جاتی۔"

"تمہیں یقین ہے ان میں سے کوئی شراب پی لے گا۔" ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور پیئے گا۔" سنیتا بولی۔

وہ ٹیلے کے اوپری حصے پر بیٹھے تھے غیر ارادی طور پر اس نے اپنے بارے میں بتایا اور سنیتا اسے اپنی داستان غم سنا رہی تھی۔ اس نے جب رمیش سے سنا کہ محبوب شاہ کے کتے اسے پھر سے اٹھانے کے لیے آ رہے ہیں تو اس نے گھر جا کر وہ زہر اپنی چنری میں باندھ لیا جو چند دن پہلے اس نے ایک سنیاسی سے لیا تھا۔ اسے اپنی زندگی بوجھ لگنے لگی تھی وہ سوچتی تھی کہ اس طرح جینے کا فائدہ۔ یہی سوچ کر اس نے سنیاسی سے سریع الاثر زہر لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ لیکن جب اسے موقع ملا تو اسے سمجھ میں آیا کہ یہ زہر اصل میں اس کا نہیں بلکہ ظالموں کا مقدر تھا۔

"کاش میں نے اس میں کچھ بچا لیا ہوتا۔" سنیتا نے سرد آہ بھری۔

"کیوں۔۔۔؟" غلام فرید چونکا۔

"تاکہ جب کبھی جیون پھر بوجھ لگنے لگے تو۔۔۔"

"یہ غلط ہے۔ خودکشی حرام ہے۔"

"تیرے دھرم میں ہوگی۔"

"بات دھرم کی نہیں ہے۔ انسان کو کسی بھی حال میں ہار نہیں ماننی چاہیے ورنہ خودکشی تو مسلمان بھی کر لیتے ہیں۔"

"پر اب میرا کون ہے ماتا پتا ہیں جب وہ۔۔۔"

سنیتا کی بات زوردار دھماکے نے کاٹ دی۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ مندر سے کئی سو گز کے فاصلے پر ہونے کے باوجود وہ لرز گئے تھے۔ سنیتا بے ساختہ غلام فرید سے چمٹ گئی۔ وہ بھی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ مندر کا اوپری حصہ پھٹا تھا اور اس سے یوں شعلے نکلے تھے کہ جیسے گیس برنر سے نکلتے ہیں۔ ملبہ ہوا میں بلند ہوا تھا اور دور دور تک بکھر گیا تھا۔ تمام روشنیاں بجھ گئی تھیں اور اب ماحول صرف مندر سے اٹھنے والی آگ سے روشن تھا۔ مندر میں بم پھٹا تھا خاصی دیر بعد سنیتا نے سر اٹھایا تھا اور مندر کی طرف دیکھ کر چیخی۔

ماتا جی۔۔۔ پتا جی۔۔۔" اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن غلام فرید نے اسے پکڑا۔

"جانے دو مجھے۔۔۔" وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

"سنیتا! ہوش میں آؤ۔ وہاں جاؤ گی وہ لوگ پھر تمہیں پکڑ لیں گے۔"

"ماتا۔۔۔ پتا۔۔۔" وہ سسک رہی تھی۔

"وہ مر جائیں گے۔"

سنیتا نے مزاحمت ترک کر دی تھی لیکن مستقل رو رہی تھی۔ غلام فرید کو اگرچہ بم سے ہونے والی تباہی کا اندازہ نہیں تھا لیکن اس کے سامنے جس طرح مندر کا اوپری حصہ پھٹا تھا اور اس سے شعلے نکلے تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اندر موجود شاید ہی کوئی شخص زندہ بچا ہو۔

"ہاں۔"

سنیتا نے اسے روتے روتے تہوار کے بارے میں بتایا جس میں ساری بستی شریک ہوتی تھی۔ یہ سوچ کر غلام فرید کو بھی بے حد افسوس ہونے لگا تھا کہ مندر کے اندر ڈھائی پونے تین سو افراد تھے اور ظاہر ہے وہ مارے جا چکے تھے۔ روشنیاں اور دور صحرا میں جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گویا عزیز چاچڑ اور اسکے ساتھی اسکی طرف سے مایوس ہو کر جا رہے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ اتنے بڑے دھماکے کے بعد پولیس کی آمد لازمی تھی۔ پولیس کا خیال آتے ہی غلام فرید کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا پولیس جائے واردات کے آس پاس پائے جانے والے ہر شخص کو کس طرح پکڑ

لیتی ہے اور وہ شخص اس کی طرح کا کوئی غریب آدمی ہو تو اس کا کیا حشر کرتی ہے۔

''سنیتا! ہمیں یہاں سے چلنا ہوگا۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔

''کہاں۔۔۔ کیوں۔۔۔؟'' سنیتا چونکی۔

''پولیس آنے والی ہوگی اس سے بچنے کے لیے ورنہ وہ ہمیں ہی پکڑ لے گی۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ یہ میری بستی ہے۔''

''بستی ماں باپ سے ہوتی ہے اور اب وہ کہاں ہیں۔۔۔ کیا تیرا کوئی رشتے دار ہے۔''

''کئی ہیں۔۔۔ پوری برادری ہے۔۔۔ پر مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا۔''

''اس پر بھی تو یہاں رہنا چاہتی ہے۔۔۔ میرے ساتھ چل۔۔۔ میں کراچی جا رہا تھا۔''

''تیرے ساتھ کس ناتے۔''

''سنیتا! تو اتنی دیر سے میرے ساتھ ہے کیا میں نے تجھے ایک بار بھی غلط نظر سے دیکھا ہے۔''

''میں تجھے انسان سمجھتا ہوں۔ اسی ناتے تجھے بچانا اور ساتھ لے جانا چاہتا ہوں بول چلے گی۔ یقین رکھ تو اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔''

سنیتا سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے پیدا ہونے سے لے کر اب تک سترہ سال اسی زمین پر اور اسی بستی میں بتائے تھے وہ کبھی اس علاقے سے باہر نہیں گئی تھی اور نہ ہی کبھی سوچا تھا۔ اس کی بہنیں رخصت ہو کر دور ایک گاؤں میں چلی گئی تھیں۔ ماں باپ ان کی نظروں کے سامنے مر چکے تھے۔ صرف زمین ان کی رہ گئی تھی۔ پر شاید اس زمین پر موجود اس کا کچا جھونپڑا بھی اب اس کا نہیں تھا ماں باپ کے ساتھ رشتے دار مارے جا چکے تھے وہ کس کے آسرے پر رہتی۔ وہ غلام فرید کے ساتھ صرف چند گھنٹے سے تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے برسوں سے جانتی ہے وہ اس وقت دنیا میں کسی شخص پر اعتماد کر سکتی تھی تو وہ غلام فرید تھا۔

''میں چلوں گی تیرے ساتھ۔'' اس نے اپنا ہاتھ غلام فرید کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''پر یاد رکھنا۔ اب میری رکشا تیرا کام ہے۔''

''تو دیکھنا۔۔۔ تجھ پر کوئی آنچ آنے سے پہلے مجھ پر آئے گی۔'' غلام فرید نے جوش سے کہا۔

یہ بتا سڑک کس طرف ہے؟''

''اس طرف۔'' سنیتا نے ہاتھ سے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔

خوش قسمتی سے ڈاکوؤں نے غلام فرید سے پیسے اور گھڑی نہیں لی تھی۔ شاید اس لیے وہ اسے لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ قربانی کا بکرا بنا کر لائے تھے۔ غلام فرید کراچی تک ٹکٹ حاصل کر سکتا تھا اس نے کھڑے ہو کر سنیتا کو بھی سہارا دے کر اٹھایا۔

''اب چل ہمیں فوراً نکلنا ہوگا۔ پولیس یا محبوب شاہ کے آدمی آ گئے تو ہم پھنس جائیں گے۔''

وہ دونوں تیز قدموں سے جنوب کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ تقدیر نے انہیں آپس میں باندھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پروفیسر نے اطمینان کا سانس لیا۔ نازلی کیمپ میں آنے کے چند منٹ بعد ہی ہوش میں آ گئی تھی۔ مندر میں دھماکے کے بعد ہونے والی ملبے کی بارش نے ان کو بھی زخمی کیا تھا۔ مگر وہ کسی سنگین چوٹ سے محفوظ رہے تھے۔ رینجرز اہلکاروں نے بتایا کہ مندر کی بستی والی سمت ان کو گاڑیوں میں مسلح افراد کی پراسرار نقل و حرکت دکھائی دی تھی۔ لیکن انہوں نے مندر کی طرف آنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے انہوں نے بھی ان سے بھڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پروفیسر نے حوالدار خان محمد سے کہا۔

''آج رات پوری طرح ہوشیار رہنا۔ نہ جانے یہاں کیا ہو رہا ہے۔۔۔ مندر میں کتنے لوگ مرے ہوں گے۔''

''زیادہ نہیں جناب۔۔۔! میں سامنے کی طرف تھا۔ اچانک مندر سے کوئی دو ڈھائی سو افراد نکل کر بستی کی طرف بھاگے تھے۔ وہ ڈاکو ڈاکو چلا رہے تھے اور ان کے نکلنے کے چند منٹ بعد دھماکہ ہو گیا تھا۔''

''یعنی بیشتر لوگ بچ گئے۔'' پروفیسر نے اطمینان کا سانس لیا۔

''خان محمد۔۔۔۔تمہیں ان چیزوں کا تجربہ ہے۔میرا مطلب دھماکہ خیز اشیاء کے بارے میں۔تمہارے خیال میں مندر میں کیا ہوا ہے؟''

خان محمد نے کہا''جناب! یہ کوئی بہت ہی طاقتور دھماکہ خیز مواد تھا جو ایک ہی جگہ تھا تبھی اسکی طاقت نے مندر کی چھت اڑا دی۔مجھے یقین ہے مندر کی حد میں موجود کوئی فرد نہیں بچا ہوگا۔ان کو ان کی شاک ویوز نے ہلاک کر دیا ہوگا۔میں مندر سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس دھماکے کی لہر نے اچھال کر پیچھے پھینک دیا تھا۔اس کے بعد میں اٹھ کر نہ بھاگتا تو ملبے کی بارش مجھے ہلاک کر دیتی۔''

پروفیسر کانپ رہا تھا۔

''بہت خوفناک منظر تھا۔نہ جانے کتنے لوگ مرے ہوں گے۔''

''میں نے کہا نا۔۔۔۔مندر کے اندر کوئی نہیں تھا۔''خان محمد نے کہا۔

''میں نے مقامی پلاٹون کو اطلاع کر دی ہے۔کچھ دیر میں پولیس کے ساتھ رینجرز کے مزید جوان آجائیں گے تب تک ہم پوری طرح چوکس ہیں۔''

حماد کے ماتھے پر کوئی چیز لگنے سے زخم آیا تھا۔وہ اس کی پٹی کر کے آیا تھا۔

''مس صاحبہ کیسی ہیں؟''

''بہتر ہیں ہوش آگئی ہے۔لیکن ابھی میں نے اس سے کچھ دریافت نہیں کیا۔''

''پروفیسر میرا ایک مشورہ ہے مس صاحبہ والے معاملے کو دبا دیا جائے اور پولیس میں اس کی رپورٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔میرا خیال ہے ذمے دار سارے مر چکے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔''

''مس صاحبہ کو فوری طور سے یہاں سے ہٹا دیں۔''

مگر پروفیسر سوچ رہا تھا کہ اسے واپس ہانگ کانگ بھیج دیں کیونکہ اس نے واضح طور پر رمیش کو کہتے سنا تھا کہ نازلی نے اس کے ساتھیوں کو مار دیا تھا۔بے شک اپنے دفاع میں مارا تھا لیکن اسکے ہاتھوں دو افراد کا قتل ہوا تھا۔خود پروفیسر بھی جاننے کے لیے بے چین تھا کہ نازلی کے ساتھ کیا ہوا۔مقامی عورتوں جیسا لباس ظاہر کر رہا تھا کہ وہ خود گئی تھی پروفیسر نے نازلی کے لیے چائے بنائی اس کے خیمے میں گیا تو وہ کپڑے بدل چکی تھی اور کسی قدر

سکون سے لگ رہی تھی۔پروفیسر نے اسے کافی کا مگ دیا۔

''سوری پاپا۔۔۔!''

''نا۔۔۔پہلے پیو پھر مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور نہی ہی شرمندہ ہونا۔غلطی انسان سے ہو جاتی ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔''

نازلی نے کافی ختم کی۔شاید وہ خود بھی سب کچھ بتانے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بے تاب تھی۔اس نے شروع سے آخر تک ایک ایک بات پروفیسر کو بتا دی۔اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔پروفیسر کا منہ کھلا رہ گیا۔

''خدا کا احسان ہے جو اس نے تمہیں بچا لیا۔''نازلی باپ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

''پاپا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔''

''معافی کس بات کی میری بچی میں نے کہا نا غلطی انسان سے ہو جاتی ہے اور ویسے بھی مندر کی تباہی کے بعد وہاں سب ختم ہو گیا۔تمہارے خلاف نہ کوئی وہاں گواہ ہے اور نہ ثبوت۔''

''لیکن پاپا! میں نے دو آدمیوں کو مارا۔''

''نازلی! اسے بھول جاؤ۔''پروفیسر نے اس کا دماغ پکڑ کا زور دے کر کہا۔

''تم نے دو حیوانوں کو مارا ہے وہ انسان نہیں تھے تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔نہ معاشرتی لحاظ سے نہ اخلاقی لحاظ سے نہ قانونی لحاظ سے۔ہر ملک کا قانون ایک عورت کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے اور اس عورت کو قابل احترام قرار دیا جاتا ہے۔''

''جی پاپا۔۔۔!''

نازلی نے سر ہلایا۔لیکن پروفیسر کی ذہنی حالت بہتر نہیں لگ رہی تھیں شاید وہ احساس جرم کے بوجھ تلے دبی تھی۔پروفیسر نے اسے اعصاب کو پرسکون کرنے والی ایک گولی دی اور اس وقت تک اس کے پاس بیٹھا رہا تھا جب تک وہ سو نہیں گئی تھی۔پھر پروفیسر نے اس کا ماتھا چوما اور اٹھ رہا تھا کہ اسے باہر سے خان محمد کی آواز۔

''پروفیسر صاحب!''

پروفیسر باہر آیا۔ خان محمد نے اسے پولیس کی آمد کا بتایا۔ صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور اس دھماکے کو ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ آنے والا مقامی ڈی ایس پی تھا وہ غالباً پروفیسر کی اہمیت سے بے خبر تھا۔ اس لیے پروفیسر سے احترام سے پیش آیا اس سے ابتدائی بیان لیا۔ پروفیسر نے اسے بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی جشن دیکھنے کے لیے مندر جا رہے تھے کہ دھماکہ ہوا اور اس کے کئی ساتھی بھی زخمی ہوئے دھماکے سے اندر موجود لوگوں پر کیا گزری وہ نہیں جانتا۔

پولیس نے حسب روایت اپنی تفتیش کا آغاز مندر کے آس پاس پائے جانے والے افراد کی پکڑ دھکڑ سے کیا۔ ان میں سے بیشتر بستی کے لوگ تھے۔ جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے بچ گئے مندر کا اندر کا حصہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا اور یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اندر کتنے افراد مارے گئے لکشمن کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی بیان دے سکتا۔ کبھی روتا اور کبھی بلند آواز سے قہقہے لگاتا تھا۔ ڈی ایس پی بجا طور پر اندازہ لگایا کہ اس کیس کی تفتیش پولیس کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے ایس پی کو مشورہ دیا۔

"بہتر ہے اسے دفاعی ایجنسیوں کے سپرد کر دیا جائے۔"

مندر میں بم دھماکا ایسی بات نہیں تھی۔ جسے وفاقی حکومت نظر انداز کرتی۔ صبح ہونے سے پہلے کئی ٹیمیں تفتیش کے لیے آ چکی تھی۔ پروفیسر کے کیمپ کی حفاظت کے لیے نصف درجن محافظ اور آ گئے تھے۔ مگر پروفیسر نے صبح کے وقت اس کے بیان کے لئے آنے والے ایک خفیہ ادارے کے افسر سے کہہ دیا تھا۔

"میں اور میری بچی خود کو یہاں محفوظ نہیں سمجھتے۔ اس لیے ہم ابھی کراچی جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ بیان دے دیں۔ دوبارہ ضرورت پڑی تو ہم کراچی میں رابطہ کر لیں گے۔"

پروفیسر نے صبح ہوتے ہی ٹیم کو روانہ ہونے کے لئے تیاری کا حکم دے دیا۔ مندر سے ملبہ اٹھایا جا رہا تھا اور بین الاقوامی میڈیا کی ٹیمیں رپورٹنگ کے لیے پہنچنا شروع ہو گئی تھیں کیمپ کا بھاری سامان رینجرز کی حفاظت میں چھوڑ کر پروفیسر اور اس

کی ساتھی ضروری سامان لے کر چار گاڑیوں کے قافلے میں کراچی کی طرف روانہ ہوئے پروفیسر اور نازلی ایک وین میں تھے اس میں سوائے ڈرائیور کے کوئی چوتھا آدمی نہیں تھا۔ نازلی اب پرسکون تھی۔ پروفیسر نے اسے کسی اور کے سامنے مندر والے واقعات کے بارے میں بات کرنے سے منع کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ رات کے واقعات کا پولیس یا کسی اور سے ذکر نہ کریں۔ ورنہ وہ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے نازلی اور پروفیسر عام سی باتیں کر رہے تھے۔

روانگی سے پہلے پروفیسر کو اطلاع ملی تھی کہ اس سے کیمپ میں ملنے کے لیے آنے والا وڈیرہ محبوب شاہ اپنی اوطاق میں مردہ پایا گیا تھا۔ نازلی نے سن کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"پاپا! یہ بہت ظالم ہے اس نے مقامی لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے ہیں خاص طور پر بستی کے لوگ اس کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔"

نازلی کو باپ کو بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی کہ محبوب شاہ اور اس کے ساتھ سب سے زیادہ ان غریبوں کی عزتوں کو پامال کرتے تھے پروفیسر خود بھی سمجھتا تھا۔ اس نے صرف آہ بھری۔

"خدا ان کو اس دنیا میں دکھاتا ہے لیکن سمجھتا کوئی نہیں۔"

اچانک گاڑیاں رک گئیں۔ سامنے پولیس چوکی بنی تھی جو گاڑیوں کو روک کر واپس کر رہے تھے۔ پروفیسر کا ڈرائیور اترا کر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا اس نے پروفیسر کو اطلاع دی۔

"سائیں! ادھر سڑک پر آگے پولیس نے ڈاکوؤں کو گھیر رکھا ہے۔ کوئی عزیز چاچڑ ہے۔۔۔ زوروں کی فائرنگ ہو رہی ہے۔" پروفیسر پریشان ہو گیا تھا۔

"تب ہم کیا کریں۔ واپس جانا ہوگا۔"

"نہیں سائیں ۔۔۔! ادھر پیچھے سے ایک سڑک ہے ادھر سے جائیں گے۔" ڈرائیور نے اسے تسلی دی۔

انہوں نے گاڑیاں واپس کیں اور دوسری سڑک پر آ گئے یہ راستہ خراب تھا اور بہت جھٹکے لگ رہے تھے انہیں ایک جگہ بس کھڑی ملی وہ خراب ہو گئی تھی اور اس کے مسافر

پریشان کھڑے تھے۔نازلی باہر دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی وہ مندر والے لمحات کبھی فراموش نہیں کرسکتی تھی۔انسان اس طرح دھوکا دیتا ہے اس نے سوچا نہیں تھا وہ دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔کہ اس کی عزت بچ گئی۔پھر اسے سنیتا کا خیال آیا وہ کہاں ہوگی۔اسے امید تھی دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی بچ گئی ہوگی۔اس کی نظر سوچتے ہوئے باہر گئی اور اس نے بے ساختہ چلا کر کہا۔

''رکو۔۔۔گاڑی روکو۔''

ڈرائیور نے وین روک دی۔نازلی گاڑی سے اتر کر بھاگی اور ذرا پیچھے اس نے سنیتا کو بازو سے پکڑ لیا۔

''تم سنیتا ہو؟''

''ہاں بی بی! تم۔۔۔''سنیتا نے اسے غور سے دیکھا۔

''ہم کراچی جارہے ہیں۔پر ہم۔۔۔''نازلی نے اس کے ساتھ غلام فرید کو غور سے دیکھا۔

''یہ کون ہے؟''

''غلام فرید۔۔۔بی بی۔۔۔!اس نے محبوب شاہ کے کتوں سے بچایا تھا۔''

''تم دونوں کہاں جارہے ہو۔''

''بی بی اب میرا بستی میں رہا ہی کون ہے۔''سنیتا افسردہ ہوگئی تھی۔

''تمہارے ماں باپ۔''

''وہ بھی مارے گئے۔''

اس سے پہلے کہ نازلی اسے بتاتی کہ بستی کے لوگ مندر کے دھماکے میں بچ گئے تھے فضا فائرنگ سے گونجنے لگی۔پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان مقابلہ اس سڑک کے پاس آگیا تھا۔لوگ جانے کے لیے بھاگ تھے پروفیسر بھی تیزی سے وین سے اتر کر آیا اور نازلی کو بازو سے گھسیٹ کر وین تک لے گیا تھا گاڑیوں والے راستے پر بھاگے تھے جبکہ پیدل افراد پناہ کے لیے بس کی طرف دوڑے تھے۔ان میں سنیتا اور غلام فرید بھی تھے۔

☆ ☆ ☆

غلام فرید نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔بس میں وقت گزاری کے لیے اس نے پاس پڑا اخبار اٹھالیا تھا پھر اسے مندر میں ہونے والے دھماکے کے بارے میں رپورٹ نظر آئی پندرہ افراد مارے گئے تھے۔اسکی بازگشت ابھی تک میڈیا پر سنائی دے رہی تھی۔رپورٹر نے اپنے مضمون میں واقعے کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اسے سرحد پار کی کاروائی قرار دیا تھا۔رپورٹ میں خاص طور سے ایسے دھماکا خیز مادے کا ذکر تھا جو اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا تھا اس دھماکے کا مقصد ملک کو عالمی سطح پر بدنام کرنا تھا تاکہ عالمی طاقتیں ملک پر دباؤ بڑھا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرسکیں۔وڈیرہ اور سیاست دان محبوب شاہ کی موت کو بھی اس دھماکے سے منسلک کیا گیا تھا۔اس پر الزام لگتے رہے تھے کہ اس کے روابط سرحد پار تھے اور ممکن ہے اس دھماکے میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔رپورٹ میں اس کی بھی نشاندہی تھی کہ بھارتی اور مغربی میڈیا اس الزام کو انتہا پسندوں کے سر ڈال رہا تھا۔

غلام فرید نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔رپورٹ کی بیشتر باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں تھیں۔وہ اس ملک کا ایک عام سا شہری تھا جو محنت سے کماتا اور اپنا گھر چلانا جانتا تھا۔انتہا پسندی اور روشن خیالی کی اصلاحات اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔اس کی خواہش تھی کہ ملک میں امن ہو اور سب خوش رہیں۔بس اسٹاپ پر اتر کر اس نے دیہاڑی کی ملنے والی رقم سے کھانے پینے کا سامان خریدا۔سنیتا اس کی منتظر تھی جیسے ہی اس نے دروازے پر دستک دی اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔

وہ دو دن کے بعد کراچی پہنچے تھے۔غلام فرید نے اپنے دوست کو صرف اتنا بتایا تھا کہ سنیتا (نام اس کا ماروی بتایا تھا) ایک لاوارث لڑکی ہے دوست سے مشورے کے بعد سنیتا کو مقامی مسجد کے امام کے اہل خانہ کے پاس رکھوایا تھا اور تیسرے دن اس نے اسلام قبول کرلیا اسی رات اس کا نکاح غلام فرید سے پڑھا دیا گیا۔قبول اسلام والی بات صرف امام مسجد کے علم میں رہی تھی باقی لوگوں کو یہی علم تھا کہ ماروی بے سہارا تھی اور غلام فرید اس سے شادی کررہا تھا ایک مہینے بعد غلام فرید نے اسی علاقے میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا ضروریات کی چیزیں دوستوں اور جاننے والوں نے تحفے میں دی تھیں۔کام کی کمی نہیں تھی۔کراچی آنے کے دوسرے دن اسے کام مل گیا تھا۔